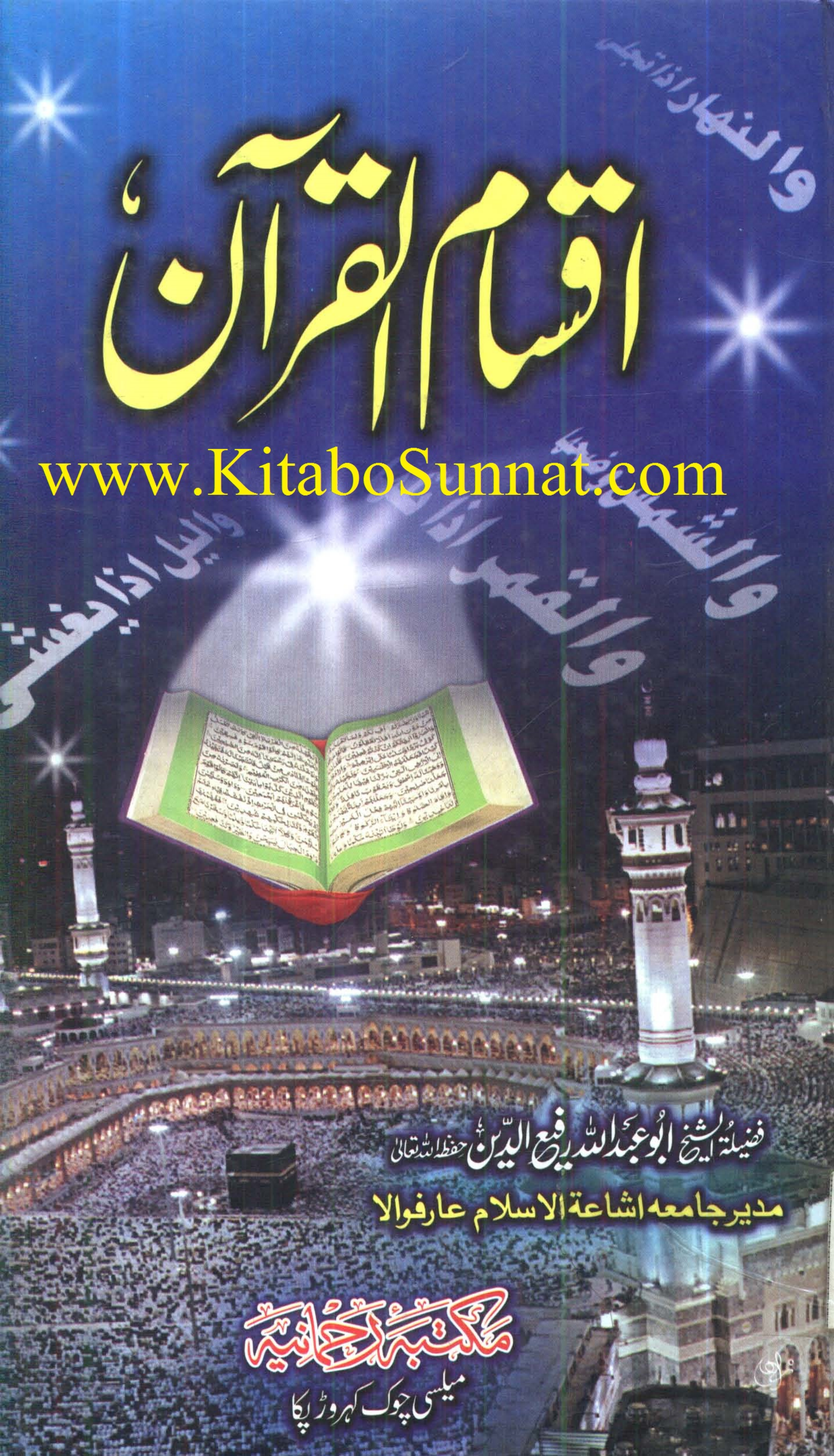


اقسام القرآن

فضیلۃ الشیخ ابو عبداللہ رفیع الدین حفظہ اللہ تعالیٰ
مدیر جامعہ اشاعۃ الاسلام عارفوالا

مکتبہ رحمانیہ
میلسی چوک کہروڑ پکا

قرآن مجید میں آنے والی ظاہر اقسام باری تعالیٰ
کی تشریح و توضیح

اقسام القرآن

مؤلف

فضیلۃ الشیخ ابوعبداللہ رفیع الدین حفظہ اللہ
مدیر جامعہ اشاعت الاسلام عارف والا

مکتبہ رحمانیہ، کہروڑپکا۔ فون: 5-33104-06514

نام کتاب------------ اقسام القرآن
مؤلف------------ ابوعبداللہ رفیع الدین
ناشر------------ مکتبہ رحمانیہ کہروڑ پکا
تعداد------------ ۱۱۰۰
تاریخ اشاعت اول ---- ۲۰۰۳ء جون
قیمت: ------------ -/150 روپے

ملنے کا پتہ

❶ مکتبہ رحمانیہ میلسی چوک کہروڑ پکا 33105-06514 (۲) جامعہ اشاعت الاسلام چک 149/E.B-30345-0446 (۳) الاصلاح اسلامک سنٹر عارف والا
❷ لاہور ایجنسی: دارالاقصیٰ اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ 0333-4345230
❸ نور اسلام اکیڈمی۔ غزنی سٹریٹ رحمان مارکیٹ اردو بازار لاہور۔
❹ مکتبہ سلفیہ۔ شیش محل روڈ۔ لاہور۔ 7237814
❺ فاران اکیڈمی قذافی سٹریٹ ۱۷۔ اردو بازار لاہور۔ 7227905
❻ نعمانی کتب خانہ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور۔
❼ مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ رحمان مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 7351124
❽ اسلامی اکادمی الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور۔ 7357587
❾ مکتبہ اصحاب الحدیث حسن مارکیٹ مچھلی منڈی، اردو بازار لاہور۔ 7321823

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کی رشد وہدایت کے لیے نہایت بابرکت عظیم الشان کتاب قرآن مجید کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر اس وقت نازل فرمایا جب کائنات جہالت وتاریکی اور گمراہی میں بھٹک رہی تھی۔ جس کے ذریعہ سے اللہ عزوجل نے بہت سے انسانوں کو ہدایت عطا فرمائی۔ یہ کتاب اپنے اندر علوم ومعارف کا بہت بڑا خزانہ رکھتی ہے۔ اہل اسلام نے اس کتاب کی ہر پہلو سے خدمت کی لازوال داستانوں کو رقم کیا ہے۔ نزول قرآن حکیم سے دور حاضر تک مسلمان مشاہیر نے اس کی خدمت کرنے کو سعادت جانا۔ اس کے مقابلے میں ادیانِ باطلہ اپنی آسمانی کتابوں کی خدمت کا عشرعشیر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ باطل مذاہب کا دامن ایسی خدمات سے خالی ہے یہ اعزاز صرف کتاب اللہ کو ہی حاصل ہے۔ اہل علم نے حلال وحرام، ناسخ ومنسوخ، قصص، واقعات ’وعدووعید‘ اور اقسام وامثال ودیگر بہت سے پہلوؤں سے کتاب اللہ کی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی اقسام القرآن کے نام سے راقم الحروف کو مسلمانوں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ جو ایک مبسوط مقدمہ اور اکتالیس ظاہر اقسام باری تعالیٰ کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بے پناہ شکر ہے۔ جس کی توفیق اور فضل وکرم سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ رہا ہے عربی زبان میں اقسام قرآن پر اہل

علم نے بہت سی کتب رقم فرمائی ہیں لیکن اردوزبان میں تفصیلاً اقسام قرآن پہ بہت کم کتب میسر ہیں۔طلبہ اور رفقاء کے اصرار نے اس خدمت پر کمربستہ ہونے کی ہمت عطا فرمائی کہ اس کی اشاعت سے سرخرو ہو رہا ہوں۔اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں جن رفقاؤ احباب کا مجھے تعاون حاصل رہا میں ان سب کا بالخصوص جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن اور جامعہ اشاعۃ الاسلام عارف والا کے اساتذہ اور طلبہ کے پرخلوص تعاون پر دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔اور ناسپاسی ہوگی کہ میں برادرِ اکبر حاجی غلام محمد وبھٹی برادرز کہروڑ پکا کا شکریہ نہ ادا کروں جن کے بے پناہ حسنِ سلوک نے مجھے دین حنیف کی خدمت کے لیے یکسوئی عطا فرمائی۔

جزاھم اللہ خیرا

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو میرے لئے اور جملہ معاونین کے لیے توشہ آخرت بنائے اور اس کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور ہمیں اسلام کی مزید خدمت کی ہمت اور توفیق نصیب فرمائے آمین یارب العالمین۔

ابوعبداللہ رفیع الدین

مدیر جامعہ اشاعۃ الاسلام عارف والا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ☆ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ☆ ❶ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا☆ ❷ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا☆ يُّصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا☆ ❸

ابن قیم رحمہ اللہ نے قرآنی قسموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام التبیان فی اقسام القرآن اور عبدالحمید الفراہی نے إمعان فی اقسام القرآن اور احمد کمال المہدی نے آیات القسم من القرآن الکریم لکھی ہیں۔ اس موضوع پر بہت سے علمائے لغت اور مفسرین اور علوم قرآن میں تخصص کرنے والوں نے لکھا ہے۔

❶ آل عمران: ۱۰۲ ❷ النساء: ۱ ❸ الاحزاب: ۷۰-۷۱

ضرورتِ قسم

حق کے قبول کرنے اور نورِ حق کے تابع ہونے کے لحاظ سے افرادِ انسانی کی استعداد مختلف ہوتی ہے جو نفس صاف ستھرا ہوتا ہے اور اس کی فطرت پلیدگی سے میلی نہیں ہوئی وہ ہدایت کو قبول کر لیتا ہے اور اس کا دل نورِ ہدایت کی شعاعوں سے منور ہو جاتا ہے اس کو ہدایت کی طرف مائل کرنے کے لیے صرف اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور جس نفس پر جہالت مسلط ہو اور باطل کی تاریکی نے اسے ڈھانپ لیا ہو اس کو زجر و توبیخ کے ہتھوڑے اور تاکیدی الفاظ ہی حرکت میں لا سکتے ہیں تا کہ اس کا انکار ختم ہو۔

گفتگو میں قسم کا انداز تاکید کے ان اسلوبوں میں سے ایک ہے جن کے اندر بہت بڑی دلیل ہوتی ہے اور مدِ مقابل' حریف و مخالف کو تدریجاً ان باتوں کے اعتراف کرنے کی طرف لانا ہوتا ہے جن کا وہ انکار کر رہا ہوتا ہے۔

عربی زبان میں قسم کا استعمال بہت عام ہے اس کا مقصد اپنی بات کو مؤکد کرنا اور اس میں جاذبیت کشش' دل نشینی اور زور و اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ قسم کا استعمال اپنی بات کو پختہ کرنے اور مخاطب کو یقین دلانے کے لیے زمانہ قدیم سے ہوتا آ رہا ہے۔ حضرت آدم و حواء علیہما السلام کو شیطان نے قسم سے یقین دلایا تھا:

﴿وَقَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾

حضرت صالح علیہ السلام کی قومِ ثمود نے ان کو اور ان کے اہل کو رات کو قتل کرنے کے منصوبہ کو قسمیں اٹھا کر پختہ کیا تھا۔

﴿قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ

اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾

عرب میں قدیم زمانہ سے قسم کا اسلوب پایا جاتا ہے یہ اسلوب جس طرح عربیتِ اسلامیہ میں ملتا ہے ویسا ہی عربیتِ جاہلیت میں بھی پایا جاتا ہے۔

جاہلیت میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھانا معروف تھا ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں اور انصاب وغیرہ کی قسم اٹھانا بھی معروف تھا۔ لغتِ عرب اور اس کا ادب باقی لغات اور ان کے آداب سے جن وجوہ کی بنا پر ممتاز ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ لغتِ عرب میں قسم کا بہت زیادہ استعمال ہے دیگر لغاتِ عالم میں اور ان کے آداب میں قسم کا استعمال بہت کم ہے۔

قرآن مجید اور قسم

قران مجید میں قسم کا استعمال بہت ہوا ہے۔ لیکن تمام مقامات میں بنیادی چیز کے طور پر استعمال ہوئی ہے لفظی ملمع سازی نہیں ہے قران مجید میں دوسو (۲۰۰) سے زائد قسمیں ہیں۔ صریح قسمیں ایک سو (۱۰۰) کے قریب ہیں۔ [1] جن میں اللہ تعالیٰ اور انبیاء وغیرہم کی قسمیں داخل ہیں۔

لغتِ عرب تعبیر کی باریکی کے ساتھ ممتاز ہے نیز اس میں اغراض ومقاصد کے تنوع سے اسلوب مختلف ہوتے ہیں اور مخاطب کے حالات مختلف ہوتے ہیں جن کو علم معانی میں خبر کی تین ضربیں الابتدائی' الطلبی اور الانکاری کہتے ہیں۔

کبھی تو مخاطب حکم سے خالی الذہن ہوتا ہے تو اس کے سامنے کلام بغیر تاکید کے لائی جاتی ہے اور اس ضرب کا نام ابتدائی ہے اور کبھی مخاطب منکر للحکم ہوتا ہے تو اس کے انکار کی

[1] لغة القرآن الكريم الدكتور عبد الجليل ۔ ص ٢٦٥

قوت وضعف کے بقدر کلام میں تاکید لانا ضروری ہوتا ہے اس ضرب کا نام انکاری رکھتے ہیں کلام میں تاکید لانے کے مشہور طریقے جن سے کوئی چیز نفس میں تمکن اور مضبوطی پاتی ہے ان میں ایک طریقہ قسم بھی ہے۔

قرآن مجید سب لوگوں کے لیے نازل ہوا ہے اور اس کے سامنے لوگوں نے مختلف موقف اختیار کیے بعض شک میں مبتلا ہو گئے اور بعض انکاری ہوئے اور بعض سخت قسم کے جھگڑالو تو کلام اللہ میں قسمیں شکوک کو زائل کرنے اور شبہات کو دور کرنے اور حجت و دلیل کو قائم کرنے اور اخبار کو مؤکد کرنے اور حکم کو کامل ترین صورت میں ثابت کرنے کے لیے استعمال کی گئیں۔

اقوام عالم کے ہاں قسم اصل میں تاکید کے اسلوبوں میں سے ایک اسلوب ہے کبھی وہ تاکید کو دایاں ہاتھ پکڑ کر بیان کرتے ہیں جیسے عربوں رومیوں اور عبرانیوں کے ہاں رواج تھا۔ اسلام سے قبل عربوں کے معاشرے میں قسم کو بہت اہمیت حاصل تھی عہدِ اسلامی میں بعض نامناسب یعنی شرکیہ قسمیں ممنوع ہو گئیں البتہ بعض جو شرک اور دوسرے شوائب سے پاک تھیں جاری رہیں اور شرع میں قابلِ لحاظ ہوئیں قسم ایسا اسلوب ہے کہ قسم اٹھانے والا جس میں اپنی پوری قوت ڈال دیتا ہے۔ قران مجید محاورۂ انسانی (محاورۂ عرب) کے مطابق ہے اس لیے بیان کے پیرائے عاداتِ انسانی (عرب) کے مطابق اختیار کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دلیل و حجت کے کمال اور اس کی پختگی کے لیے قسم کا ذکر فرمایا ہے۔ کسی مسئلے میں مخاطب کے اطمینان کے دو طریقے ہیں ایک تو شہادت دوسرا قسم۔ قرآن مجید میں یہ دونوں طریقے استعمال ہوئے ہیں۔ ❶

قرآن مجید اغراضِ قسم اور مقسم بہ اور مقسم علیہ کی انواع کی کثرت کے ساتھ ادبِ عربی سے ممتاز ہے کیونکہ لغتِ عرب اور ادبِ عربی میں اغراضِ قسم اور مقسم بہ اور مقسم علیہ کی انواع کا وہ تعدد نہیں ہم پاتے جو کہ قرآن مجید میں موجود ہے نیز مقسم بہ کی بنسبت

❶ لغت القرآن الكريم الدكتور عبد الجليل

قرآن مجید میں قسم کی نئی اقسام آئی ہیں جن میں اکثر کا تعلق غیبی امور سے ہے جیسے بڑے بڑے فرشتوں اور ہر اس چیز کی قسم اٹھانا جس کا تعلق وحی اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہے۔ ❶

اقسام القرآن اور بلاغت

قرآنی قسموں میں بلاغت کے کئی انداز ہیں۔(۱) قول میں سنجیدگی اور تاکید کے اظہار پر قسم کا اسلوب دلالت کرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ الطارق میں فرمایا ہے:

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ٥ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ٥ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ٥ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾

”بارش والے آسمان کی قسم اور پھٹنے والی زمین کی بے شک یہ (قرآن) البتہ دو ٹوک فیصلہ کرنے والا کلام ہے یہ ہنسی کی بات نہیں ہے۔“

شریف آدمی جب کسی چیز پر قسم اٹھاتا ہے تو اس میں سنجیدگی کے اظہار میں بہت مبالغہ کرتا ہے اور سستی کاہلی کی اپنی ذات سے نفی کرتا ہے اسی لئے اوائلِ نبوت میں قسموں کا استعمال زیادہ ہوا ہے تاکہ انہیں علم ہو کہ داعی نبی ﷺ جس چیز کی طرف دعوت دے رہا ہے اس میں انتہائی سنجیدہ ہے۔

(۲) اسلوبِ قسم مخالف کے انکار کی راہ بند کر دیتا ہے کیونکہ قسم جملہ انشائیہ ہے خبریہ نہیں قسم اگر جملہ خبریہ ہوتی تو ممکن تھا کہ مدِ مقابل مخالف انکار کر دے لیکن جملہ انشائیہ قسمیہ تو اسے انکار کا موقعہ ہی نہیں دیتا جس طرح وہ صفت کا انکار نہیں کر سکتا حالانکہ قسم اور صفت دونوں

❶ الاتقان فی علوم القرآن السیوطی الجزء الثانی ص ۳۷۰

کے اسلوب حقیقت میں خبر ہیں بعض قرآنی قسموں میں اس قِسم (یعنی خبر بصورت قسم و صفت) کی دونوں خبریں جمع ہوجاتی ہیں جس طرح ﴿والقرآن المجید﴾ اور ﴿والیوم الموعود﴾اور ﴿والصافات صفا﴾ ہے۔

آپ اگر ان قسموں کی تحلیل کریں تو دو جملے نظر آئیں گے مثلاً والصافات صفا یہ ان الملائکۃ صافون کالعبید کے معنی میں جملہ خبریہ ہے اور دوسرا جملہ خبریہ ان الھکم لواحد اس کا جواب قسم ہے ایسے ہی والقرآن المجید ان ھذا القرآن مجید کے معنی میں اور والیوم الموعود ان لھم یوما موعودا کے معنی میں ہے۔

اگر جوابِ قسم ایسا ہو کہ مخالف اس کا انکار کرسکتا ہے تو کبھی خطاب نبی ﷺ کو کردیا جاتا ہے جیسے فرمایا﴿ یٰسٓo وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِo اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَo﴾ اور کبھی جوابِ قسم حذف کردیا جاتا ہے جب وہ جملہ خبریہ ہو اور مقسم بہ کے ساتھ اکتفا کرلیتے ہیں تا کہ جلدی سے ایک دوسرا کلام لائیں جو محذوف جوابِ قسم کی تائید کرنے والا ہو تا کہ مخالف کو اتنا موقعہ ہی نہ مل سکے کہ وہ انشاء کو خبر کی طرف پھیر کر جھگڑا کرنے لگے گویا قسم کا یہ اسلوب مخالف کو بات سننے کی فرصت مہیا کرتا ہے اور اسے جوابِ قسم کے انتظار میں رکھتا ہے پھر موقعہ مل جاتا ہے کہ سابقہ کلام (جو بصورت قسم لائے) سے جو استدلال مقصود ہوتا ہے اس کا مؤید لے آئیں جیسے ارشاد فرمایا:

﴿صٓ وَالْقُرْآنِ ذِی الذِّكْرِoبَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾

قرآن کی ذی الذکر صفت لاکر جملہ خبریہ سے استغنا کرلیا گویا یوں فرمایا: ’’قد شھد القرآن انہ لذکر لھم و نصح‘‘ یعنی قران شھادت دیتا ہے کہ وہ بلاشبہ ان کے لیے نصیحت اور خیر خواہی ہے مخاطب کافروں کی ان خصلتوں کا ذکر ’’بلی الذین کفرو فی عزۃ و شقاق ‘‘ سے شروع کردیا جن کا وہ انکار نہیں کرتے بلکہ ان صفات پر فخر کرتے تھے اور ساتھ اشارہ کیا کہ وہ قرآن کا انکار صرف حمیتِ جاہلیہ کی بنا پر کرتے ہیں اور حق سے جھگڑ رہے ہیں۔

اگر قسم ایسی ہو کہ مخالف اس کا انکار نہیں کرتا تو پھر جوابِ قسم کو حذف نہیں کیا جاتا جیسے فرمایا:

﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

(الزخرف ۱'۲'۳)

''اس واضح کتاب کی قسم کہ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تا کہ تم سمجھ لو۔''

قسم میں قرآن کے کتابِ مبین ہونے اور جوابِ قسم میں قرآن کے عربی ہونے کا ذکر کیا۔ مشرکین ان دونوں میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کرتے تھے۔

(۳) استدلال کے لیے قسم کا اسلوب اختصار اور ایجاز والا ہے ایجاز (جو کہ بلاغتِ کلام کی اہم قسم ہے) آپ کو موقعہ مہیا کرتا ہے کہ آپ متعدد دلائل ایک دوسرے کے پہلو میں جمع کر دیں اور ایک ہی موقعہ پر بہت سے دلائل ذکر کر دیں۔ جب قرآن مجید میں ایک چیز کے متعدد دلائل ذکر کیے جائیں گے تو انکی تاثیر بہت زیادہ ہوگی اور وہ چیز نہایت محکم ہو جائے گی جس طرح الطّور اور البلد اور التین سورتوں میں ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَالطُّوْرِ ۝ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝﴾

''قسم ہے طور کی اور جھلی کے کھلے ہوئے ورق میں لکھی ہوئی کتاب کی اور آباد گھر کی اور اونچی چھت کی اور بھڑکائے ہوئے سمندر کی بے شک آپ کے رب کا عذاب ہو کر رہنے والا ہے اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝﴾

''میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اس حال میں کہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں اور انسانی

باپ اور اولاد کی (قسم ہے) یقیناً ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے (یعنی انسان کی زندگی محنت ومشقت اور شدائد سے پُر ہے)

اور فرمایا:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ٥ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ٥ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ٥ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ٥﴾

''انجیر اور زیتون کی قسم اور طورِ سینین کی اور اس امن والے شہر کی یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔''

(۴) قسم والا اسلوب سورتوں کے شروع میں تر وتازگی اور رونق اور خوبصورتی کا کام دیتا ہے۔ قسمیں چمکتی ہوئی پیشانی کی طرح نظر آتی ہیں یعنی قسمیں سورتوں کے شروع میں تزیین و آرائش کا فائدہ دیتی ہیں اسی بنا پر سورتوں کے درمیان میں قسمیں بہت کم آئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قسمیں سورتوں کے شروع کو مختلف رنگوں سے آراستہ کرتی ہیں اور عمدہ انداز میں تصویر گری کرتی ہیں شاید قسم تصویر گری کا بہترین اسلوب ہو۔

آپ جس چیز کی قسم کھا رہے ہیں گویا اس کو بطورِ گواہ مخاطب کے سامنے کھڑا کر رہے ہیں اور وہ شہادت پیش کر رہا ہے جب اللہ تعالیٰ نے سورتوں کے شروع کو مختلف تصویری رنگوں سے آراستہ فرمانے کا ارادہ کیا تو سورتوں کی ابتدا خاص قسموں کے ساتھ کی ہے۔ کبھی آپ دیکھیں گے کہ قسم کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے جیسے

﴿وَالْقَلَمِ٥ وَمَا يَسْطُرُوْنَ٥ اور اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ اور وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحاً اور وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْواً﴾

اور کبھی قسم کی متعدد صورتیں نظر آتی ہیں جن کو علتِ مشترکہ جمع کر رہی ہوتی ہے جیسے التین اور البلد اور الطور اور الشمس اور اللیل سورتوں میں ہے۔ اور تصویر گری کے ذریعہ فکر کو پیش کرنا اور اس کو نمایاں کرنا اور مخاطب کو اس کے سمجھنے پر اس کے سب پہلوؤں کا احاطہ کرنے پر اور ان کے ساتھ متاثر ہونے پر آمادہ کرنا اس کی اہمیت معلوم ہے اس پر دلیل

پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ❶

جب کوئی خبر دی جائے تو سننے والا کبھی اس کے سچے ہونے میں شک کرتا ہے اور کبھی خبر کا انکار کر دیتا ہے تو پھر ان وسائل کو اختیار کیا جاتا ہے جن کی طرف لغت عرب رہنمائی کرتی ہے جن سے جملہ کا معنی مضبوط اور مضمون کی تاکید ہوتی ہے اور جملہ سے شک یا انکار کو زائل کیا جاتا ہے ان وسائل میں ایک تو جملہ کا تکرار ہے لیکن کبھی تکرارِ جملہ سے نفس نفرت کرتا ہے تو پھر دوسرے وسائل اختیار کرتے ہیں مثلاً قسم یا اِنَّ حرف تاکید یا لام ابتداء اور یہ لام اکثر مبتدا پر داخل ہوتی ہے اسی لیے اسکو لامِ ابتداء کہتے ہیں۔

---

❶ علوم القرآن مدخل الی تفسیر القرآن

حروفِ قسم

حروفِ قسم مشہور چار ہیں۔ باء ' تاء ' واو اور لام اور بعض عرب من (میم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ) کو بھی قسم کے لیے استعمال کرتے ہیں مثلاً "من الله لانصرن النزيه" من قسم کے لیے صرف لفظ اللہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض قدماء (ہا) کو بھی قسم کے لیے استعمال کرتے ہیں اس سے پہلے 'ای' حرف ایجاب بمعنیٰ نعم لاتے ہیں جیسے ای ہا اللہ اور کبھی اس کے بغیر بھی استعمال کرتے ہیں اور کبھی کبھی جیر اور لا جرم کو بھی قسم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حروفِ قسم اور اس کا مجرور فعل قسم احلف یا اقسم وغیرہ کے متعلق ہوتا ہے۔ فعل قسم اور اس کے فاعل اور جار مجرور سے جملہ قسمیہ بنتا ہے۔

اقسامِ قسم بلحاظ جواب قسم

جملہ قسم کے بعد دوسرا جملہ جوابِ قسم ہوتا ہے جوابِ قسم کے لیے شرط ہے کہ وہ جملہ خبریہ ہو تعجبیہ نہ ہو مثلاً ''اقسم بالله لا انقاد لرای يجافی العدالة'' دوسرا جملہ لا انقاد جوابِ قسم ہے اور اس قسم کا نام قسمِ خبری یا قسمِ غیر استعطافی رکھتے ہیں اور اکثر اس کے لیے محلِ اعراب نہیں ہوتا ہے۔

اگر جملہ قسم کے بعد جوابِ قسم جملہ انشائیہ لا کر نفس کو تحریک دینا اور شعور کو بیدار کرنا مقصد ہو تو اس قسم کو قسمِ استعطافی کا نام دیتے ہیں۔ اس صورت میں جوابِ قسم لازمی طور پر جملہ انشائیہ ہوگا مثلاً ''بربك هل رحمت الشكلي'' اور جوابِ قسم کے لئے محلِ اعراب نہیں ہے۔

قسمِ استعطافی میں جوابِ قسم پر کسی اور اضافہ کی ضرورت نہیں ہے لیکن قسمِ خبری میں جوابِ قسم بعض اضافوں کا مطالبہ کرتا ہے مثلاً جوابِ قسم میں لام اور قد یا لام یا حرف نفی یا لام اور نون تاکید یا اِنَّ اور لام تاکید وغیرہ لانا ضروری ہے۔ ❶

قسم کو مقسم علیہ کی تاکید کے لیے لاتے ہیں۔ کبھی تاکید میں مبالغہ کرنے کے لیے قسم میں اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً حرفِ ایجاب ای بمعنی نعم جیسے فرمایا: "قل ای وربی" اور کبھی اختصار کی خاطر اور محذوف کا علم ہونے کی بنا پر فعل قسم اور حرفِ جر کو حذف کر دیتے ہیں اور جوابِ قسم ذکر کرتے ہیں مثلاً: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ یہ اصل میں "وَاللّٰهِ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" تھا۔ واللہ اعلم

اور کبھی جواب کو حذف کر دیتے ہیں کیونکہ وہ معلوم ہوتا ہے اور قسم کو باقی رکھتے ہیں جیسے ایک قول کے مطابق ص۔ والقرآن ذی الذکر کہ یہاں کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے جواب حذف کر دیا جواب مقدر "لا عذبنهم علی کفرهم" ہے۔

اور کبھی جوابِ قسم مکمل محذوف نہیں ہوتا بلکہ لام اور قد کو حذف کر دیتے ہیں جیسے "والسمآء ذات البروج" کا جواب قتل اصحاب الاخدود ہے اور اس کے شروع سے لام اور قد کو حذف کر دیا ہے۔ ❷

قسم کے لیے باء اصل ہے واوٗ اور تاء بھی قسم کے لیے آتی ہیں لیکن باء کی بنسبت واوٗ کا قسم کے لیے استعمال بہت ہوتا ہے۔

واوٗ ضمیر پر داخل نہیں ہوتی ہے اور سوا لیہ قسم کے لیے بھی نہیں آتی۔ قران مجید میں تقریباً بیس (۲۰) جگہ واوٗ قسم کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ باء حروفِ قسم میں اصل ہے اسی لیے باء کے ساتھ چند چیزیں خاص ہیں۔

(ا) باء کے ساتھ فعل کا ذکر کرنا جائز ہے مثلاً ﴿ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ

---

❶ النحو الوافی عباس حسن الجزء الثانی صفحه ٦٠ ؛

❷ البرهان فی علوم القرآن للزرکشی

اَرَدْنَا اِلَّا اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا﴾.

(۲) ضمیر پر باء کا داخل ہونا جائز ہے مثلاً" بك لا فعلن "

(۳) قسمِ استعطافی میں صرف باء کا استعمال ہوتا ہے جیسے "باللّٰه هل قام زيد"

تاء قسمیہ صرف لفظ اللہ اور رب پر داخل ہوتی ہے۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: کہ تاء واوَ سے بدلی ہوئی ہے جیسے تراث اور توراۃ میں ہے اور اسماء الحسنٰی سے صرف لفظ اللہ پر داخل ہوتی ہے تالرحمٰن اور تالرحیم کہنا درست نہیں۔ لیکن سہیلی کہتے ہیں کہ تاء اصل میں واوَ سے بدلی ہوئی نہیں ہے اور بعض عرب لفظ رب اور الرحمٰن اور حیاتک پر تاء قسمیہ کو داخل کر لیتے ہیں۔ ❶

امام زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تاء اور باء قسمیہ میں فرق یہ ہے کہ باء اصل ہے اور تاء باء سے بدلی ہوئی ہے اور تا میں قسم سے زائد معنی بھی پایا جاتا ہے اور وہ تعجب والا معنی ہے۔

باء کو قسم کے لیے اصل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ تمام حروفِ قسم سے یہ وسیع حرف ہے کیونکہ یہ اسم ظاہر اور اسمِ ضمیر دونوں پر داخل ہوتا ہے اور فعل قسم اس کے ساتھ صراحتاً آتا بھی ہے اور حذف بھی ہو جاتا ہے۔ اکثر نحوی یہ کہتے ہیں کہ تاء واوَ سے بدلی ہوئی ہے لیکن اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ سہیلی نے اس قول کی تردید کی ہے اور غور وفکر بھی اس کا متقاضی ہے کہ حروفِ قسمیہ میں کوئی دوسرے کے لیے اصل نہیں ہے۔

نحوی اس بات کی بھی صراحت کرتے ہیں کہ تاء قسمیہ میں تعجب کا معنی پایا جاتا ہے اور کبھی نہیں پایا جاتا لام قسمیہ میں تعجب کا معنی لازمی طور پر پایا جاتا ہے۔ ❷

قسم کے لیے اصلی صیغہ اقسم یا احلف کا ہے جس کو مقسم بہ کی طرف باء کے ساتھ

---

❶ دراسات لاسلوب القرآن الكريم القسم الاول الحروف والادوات الجزء الثانی محمد عبد الخالق عضيمه۔

❷ ایضاً

متعدی کر کے لایا جائے پھر مقسم علیہ لاتے ہیں۔ جسے جواب القسم کہتے ہیں۔
جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ﴾

(النحل :۳۸)

قسم کے تین اجزاء ہوتے ہیں فعل جو باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور مقسم بہ اور مقسم علیہ کلامِ عرب میں قسم کے کثرتِ استعمال کی بنا پر اختصار کر لیتے ہیں قسم کا فعل حذف کر کے باء کے ساتھ اکتفاء کر لیتے ہیں پھر اسماءِ ظاہرہ میں باء کے عوض واؤ لاتے ہیں جیسے فرمایا:"والنجم اذا ھوی"

اقسامِ قسم

قسم کی دو قسمیں ہیں (۱) قسمِ ظاہر (۲) قسمِ مضمر

قسمِ ظاہر: وہ ہے کہ جس میں فعل قسم اور مقسم بہ کی صراحت کی جائے اور بعض دفعہ فعلِ قسم کو حذف کر دیتے ہیں اور حرف جر باء یا واؤ یا تاء کو لے آتے ہیں۔

قسمِ مضمر: جس میں فعل قسم اور مقسم بہ کی صراحت نہ ہو صرف جوابِ قسم پر آنے والی لام مؤکدہ اس پر دلالت کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِىْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾ (آل عمران:۱۸۶)

یہاں قسم واللہ مقدر اور پوشیدہ ہے۔[1] واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] مباحث فی علوم القرآن ۔ مناع القطان

قسم اور شرط

قسم اور شرط دونوں جمع ہوجاتے ہیں جو پہلے آئے گا جواب اس کا ہوگا لیکن دوسرے کا جواب نہیں آئے گا کیونکہ پہلے کا جواب اس سے مستغنی کر دیتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ﴾(مریم:۴۶)اور اس میں قسم پہلے آئی ہے جو مقدر ہے۔ تقدیرِ عبارت اس طرح ہے"والله ان لم تنته لار جمنك"شرط بعد میں آئی ہے لہٰذا" لار جمنك "جوابِ قسم ہے جزاء نہیں ہے۔

حرفِ شرط پر آنے والی لام جوابِ قسم والی لام نہیں ہے بلکہ وہ حرفِ شرط پر اس لیے آتی ہے تاکہ معلوم کروائے کہ بعد میں آنے والا جواب وہ جوابِ قسم ہے جزاء نہیں ہے اور اس لام کا نام اللام المؤذنۃ اور اللام الموطئہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ جواب کو قسم کے لیے ہموار کرتی ہے۔ لام موطئہ اکثر اِنْ شرطیہ پر داخل ہوتی ہے اور کبھی کبھی اِنْ کے غیر پر بھی داخل ہوجاتی ہے۔ حرفِ شرط پر لام موطئہ کا داخل ہونا ضروری نہیں ہے اور کبھی قسم مقدر ہونے کے باوجود لام موطئہ کو حذف کر دیتے ہیں جیسے اللہ عزوجل کا فرمان ہے۔

﴿وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾(المائدہ:۷۳)

تقدیرِ عبارت اس طرح ہے" وَاللّٰهِ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ "[1]

قرآن مجید میں اکثر لام موطئہ للقسم اِنْ شرطیہ پر داخل ہوتی ہے اور کبھی کبھی ما اور

---

[1] مباحث في علوم القرآن ص۲۹٦

من شرطیہ پر بھی داخل ہوتی ہے۔[1] اور لام موطئہ کا نام بعض نحوی لام الشرط رکھتے ہیں کیونکہ وہ حرف شرط پر داخل ہوتی ہے۔

مقدر قسم

قرآن مجید کی بعض آیات میں نحوی اور مفسر قسم کو مقدر مان لیتے ہیں جب کہ آیت میں قسم کے لوازم میں سے کوئی پایا جائے (۱) مثلاً لئن میں لام جسے لام موطئہ للقسم کہتے ہیں۔(۲) فعل کے اندر لام تاکید کا پایا جانا (۳) لام قسم کا پایا جانا۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں لئن آئے وہاں قسم مقدر مانیں بلکہ کئی آیات میں لئن آیا ہے لیکن وہاں تاکید بغیر قسم کے بھی مراد لی گئی ہے۔ تاکید خود ایک اسلوبِ بیان ہے کبھی اس کے لوازم میں سے قسم کو لے آتے ہیں اور کبھی تاکید بغیر قسم کے بھی آتی ہے۔[2]

---

❶ دراسات لاسلوب القرآن الکریم الجز الثالث ص ۶۰-۲۵۹

❷ حوالہ مذکور۔

قسم کے قائم مقام آنے والے الفاظ

قرآن مجید میں کچھ الفاظ قسم کے قائمقام آئے ہیں اوران کا جواب بھی جوابِ قسم کی طرح ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں (۱) تاذن مثلا ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ﴾ (الاعراف:۱۶۷) تفسیر کشاف میں ہے کہ تأذن فعل قسم کے قائمقام ہے اس لیے اس کا جواب لیبعثن جوابِ قسم کی طرح آیا ہے۔

(۲) عاھد جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا﴾ (الاحزاب:۱۱۵) تفسیر البیان ج ۲ ص ۲۶۵ میں ہے کہ" عاھدواللہ بمنزلہ "قسم کے ہے اور "لا یولون الادبار" جواب ہے۔

(۳) تمت جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ (هود:۱۱۹)

تفسیر البحر المحیط میں ہے کہ تمت والا جملہ معنیٰ قسم کو متضمن ہے۔

(۴) قضینا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَائِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ﴾ (اسراء:۴)

تفسیر کشاف میں ہے کہ جائز ہے کہ قضینا قسم کے قائمقام مانیں اور لتفسدن اس کا جواب گویا یوں فرمایا" واقسمنا لتفسدن"

(۵) وعد: جیسے ارشاد فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾(النور:۵۵)

تفسیر کشاف میں ہے کہ یہاں قسم مقدر مان سکتے ہیں اور وعداللہ کو قسم کے مقام میں بھی ٹھہرا سکتے ہیں اور اس کا جواب لیستخلفنهم ہے گویا یوں فرمایا: ''اقسم بالله لیستخلفنهم''

(۶) کتب: جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾

(المجادله: ۲۱)

(۷) یعلم جیسے رب العزت نے فرمایا:

﴿قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ﴾(یس: ۱۶)

تفسیر کشاف میں ہے کہ ربنا یعلم تاکید میں قسم کے قائمقام ہے۔

(۸) یشہد جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا:

﴿قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُهُ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ﴾(المنافقون)

تفسیر کشاف میں ہے کہ اس آیت کریمہ میں نشہد اور یشہد قسم کے قائم مقام ہے کیونکہ جہاں قسم سے تاکید کرنی ہوتی ہے اس جگہ شہادت قسم کا کام دیتی ہے۔

(۹) اخذ المیثاق جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِذْاَخَذَاللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّا سِ﴾

(آل عمران ۱۸۱)

(۱۰) ام لکم ایمان جیسے ارشاد فرمایا:

﴿اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ﴾

تفسیر البحر المحیط میں ہے ام لکم ایمان کا معنی ام أقسمنا ہے۔ ❶

عربوں کی قسمیں

عربوں کی قسمیں کئی انواع کی ہیں فعل کا لفظ جیسے ألیت، حلفت، اقسمت، لعمری، یمین الله کا استعمال کرنا۔ انسانی زندگی بتوں زمانہ وغیرہ کی قسم کھانا۔

عربوں کی صریح قسم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہوتی تھی مثلاً باللہ اور واللہ اور تاللہ اور یمین اللہ کہنا نیز کعبہ مکرمہ اور انصاب کی قسم اٹھاتے تھے۔ قرآن مجید میں چار بنیادی کلمے قسم میں استعمال ہوئے ہیں جنہیں عرب استعمال کرتے تھے۔

(۱) یمین جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا﴾(النحل ۹۱)

(۲) ألیة جیسے فرمایا:

﴿وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْا اُولِي الْقُرْبٰى﴾(النور: ۲۲)

(۳) قسم جیسے فرمایا:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾(الانعام: ۱۰۹)

(۴) الحلف جیسے فرمایا:

﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا﴾(التوبة: ۷۴)

ویسے قرآن مجید میں لعمرک اور تاللہ بھی قسم کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

قسم کے لیے استعمال ہونے والی تمام تراکیب پر قرآن کریم مشتمل ہے لیکن جن

---

❶ دراسات لاسلوب القرآن الکریم القسم الثالث الجزء الثالث ص ۳۰

تراکیب میں شرک باللہ پایا جاتا ہے یا اس میں شرک کی بو محسوس ہو ایسی تراکیب استعمال نہیں کی گئیں۔ ❶

کتاب اللہ میں قسم کا ایک ایسا نمونہ آیا ہے جو صرف قرآن مجید میں پایا جاتا ہے یہ نمونہ کوئی اجنبی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنی ان نشانیوں کی قسم کھاتے ہیں جن کو اس نے اس وسیع وعریض کائنات میں پیدا فرمایا ہے جیسے آسمان' ستارے' رات' فجر' عصر اور اس طرح کی دیگر نشانیاں اور مظاہرِ کائنات جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مظاہرِ کائنات، مشاہداتِ عالم، یوم القیامت، شفق اور رات وغیرہ کا نام لے کر قسم کھائی ہے قرآن مجید میں بالخصوص ان سورتوں میں جو اوائل نبوت میں نازل ہوئیں ان میں مظاہر قدرت کی قسمیں آتی ہیں جیسے سورت الواقعہ' التکویر' الطارق' الفجر' البلد وغیرھا۔ ❷

اقسام القرآن میں کن کن امور پر غور ضروری ہے

قرآنی قسموں میں مقسم بہ اور مقسم علیہ اور اغراضِ قسم اور مخاطبِ قسم میں سے ہر ایک پر غور وفکر ضروری ہے نیز مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت کی تلاش بھی ضروری ہے۔

مقسم بہ: جس چیز کی قسم اٹھائی جائے۔

مقسم علیہ: جس چیز پر قسم اٹھائی جائے اور غرض قسم' قسم کھانے کا مقصد اور قسم اٹھانے میں مخاطب کون لوگ ہیں؟۔

---

❶ لغت القرآن الکریم ص ٦٨٢ الدکتور عبد الجلیل

❷ من اسالیب القران الدکتور ابراھیم السامرائی ص ٥٧

قرآن مجید میں مقسم بہ متعدد ہیں

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آٹھ (۸) مقامات میں اپنی ربوبیت کی اور سترہ (۱۷) مقامات میں اپنے ذاتی علم مبارک کی اور ایک مقام میں اپنی عزت کی اور چھ (۶) مقامات میں قرآن کریم کی تین (۳) جگہ لفظ قرآن سے اور تین (۳) جگہ لفظ الکتاب کے ساتھ قسم کھائی ہے۔

اللہ عزوجل نے رسول اللہ ﷺ کی دو جگہ اور اور قلم کی ایک جگہ اور فرشتوں کی دو جگہ اور مظاہرِ کائنات کی تیرہ (۱۳) سورتوں میں قسم کھائی ہے۔ اور قیامت کے دن کی کئی مقامات میں قسم کھائی ہے یعنی روز قیامت کو مقسم بہ بنایا ہے حالانکہ قیامت کا دن مخفی اور غائب امور سے ہے اسے تو مقسم علیہ ہونا چاہیے تھا بعض لوگ اس کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ جب روزِ قیامت کے ثبوت اور اس کے لازمی وقوع پر بہت سے دلائل قائم ہو گئے تو قیامت اس طرح واضح ہو گئی کہ کسی کے لیے لائق نہیں کہ اس میں شک کرے تو روزِ قیامت کا مظاہرِ کائنات سورج چاند وغیرہ کی طرح مقسم بہ بننا صحیح ہوا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورت الحاقہ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَاتُبْصِرُوْنَ o وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ oاِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍo الخ﴾ میں بہت بڑی قسم اٹھائی ہے جس کو قرآنی قسموں میں سب سے وسیع اور عمومی قسم مانا جاتا ہے اس میں شہادت وغیب کو جمع کر دیا ہے قرآن کریم میں آنی والی قسموں میں سب سے یہ جامع قسم ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں آٹھ (۸) مقامات پر اپنی ذات گرامی کی قسم اٹھائی ہے۔ باقی تمام قسمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی کھائی ہیں اللہ تعالیٰ جس چیز کی چاہیں قسم کھائیں انسان اگر اللہ تعالیٰ کے غیر کی قسم کھائیں تو یہ شرک میں داخل ہے حضرت

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی تو اس نے کفر کیا یا شرک کیا (رواہ الترمذی وحسنہ وصححہ الحاکم)

وہ مقامات جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ مقدس کی قسم کھائی ہے ان سب میں لفظ رب استعمال کیا گیا ہے ان میں سے تین مقامات میں پر اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اس کے ساتھ قسم اٹھانے کا حکم دیا ہے وہ مقامات جہاں رب العزت نے اپنی ذات کی قسم اٹھائی ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) پہلا مقام: سورت السبا:

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَاتَاْتِیْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّکُمْ عٰلِمِ الْغَیْبِ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْبَرُ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ "آیت ۳.

"کافر کہتے ہیں: کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب ! کی قسم جو عالم الغیب ہے کہ وہ یقیناً تم پر آئے گی اللہ تعالیٰ سے ایک ذرہ کے برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین میں بلکہ اس سے بھی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب میں موجود ہے۔"

(۲) دوسرا مقام: سورت التغابن:

﴿زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ﴾ " آیت ۷.

کافروں کا خیال ہے کہ وہ دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے آپ کہہ دیجئے کہ کیوں نہیں میرے رب کی قسم تم ضرور دوبارہ اٹھائے جاؤ گے پھر جو تم نے عمل کیے اس کی خبر دیے جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ پر یہ بالکل ہی آسان ہے۔"

(۳) تیسرا مقام: سورت یونس:

﴿وَیَسْتَنْبِئُوْنَکَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْ اِنَّهُ لَحَقٌّ وَمَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ﴾ " آیت ۵۳.

اور وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ (عذاب) واقعی سچ ہے؟ آپ فرمادیجئے کہ ہاں میرے رب کی قسم وہ واقعی سچ ہے اور تم کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کرسکتے۔"

ان مقامات میں قسم تاکید اور تعظیم کے لیے آئی ہے کیونکہ نبی ﷺ کی زبانی اٹھائی جارہی ہے اور اس میں استدلالی انداز بھی ہے اگرچہ مقسم بہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات مقدس ہے۔

(۴) چوتھا مقام: سورت الذاریات:

﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ﴾

آیت ۲۳

"آسمان اور زمین کے رب کی قسم کہ یہ (وہ جو پہلی آیات میں ذکر ہوئے) بالکل برحق ہے ایسا ہی جیسے کہ تم باتیں کرتے ہو۔"

(۵) پانچواں مقام: سورت المعارج:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ٥ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ﴾ (آیت ۴۰، ۴۱)

"مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم ہم یقیناً قادر ہیں اس پر کہ ان کے بدلے ان سے اچھے لوگ لے آئیں اور ہم عاجز نہیں ہیں۔"

(۶) چھٹا مقام: سورت مریم:

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا﴾ آیت ۶۸۔

" تیرے رب کی قسم ہم انہیں اور شیطانوں کو جمع کر کے ضرور ضرور جہنم کے اردگرد گھٹنوں کے بل گرے ہوئے حاضر کریں گے۔"

(۷) ساتواں مقام: سورت الحجر:

﴿فَوَرَبِّکَ لَنَسْئَلَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَo عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَo﴾
(آیت ۹۲۔۹۳)

"تیرے رب کی قسم ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے ہر اس چیز کی جو وہ کرتے تھے۔"

(۸) آٹھواں مقام: سورت النسآء:

﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لاَیَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاo﴾
(آیت ۶۵)

"پس نہیں، تیرے رب کی قسم یہ مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ تمام آپس کے اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں پھر جو فیصلے آپ ان میں کردیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کرلیں۔"

یہ وہ آٹھ مقامات ہیں جہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات گرامی کی قسم اٹھائی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مظاہرِ کائنات' مشاہداتِ عالم' روزِ قیامت' شفق' رات اور دن وغیرہ کا نام لے کر قسمیں کھائی ہیں بالخصوص ان سورتوں میں جو ابتدائی دورِ نبوت میں نازل ہوئیں۔ان میں سے اکثر مظاہر قدرت کی قسمیں آئی ہیں مثلاً سورت الواقعہ' التکویر' الطارق' الفجر' البلد وغیرہ۔

امام زرکشی البرہان فی علوم القران ج ۱ ص ۱۷۹ میں ذکر کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی پندرہ (۱۵) سورتوں کے شروع میں قسمیں آئی ہیں۔

(۱) الصافات (۲) الذاریات (۳) الطور (٤) النجم (٥) المرسلات (٦)النازعات (۷) البروج (۸) الطارق (۹) الفجر(۱۰) الشمس (۱۱)اللیل (۱۲) الضحیٰ (۱۳) التین (۱٤) العادیات (۱٥) العصر ان سب سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات مقدس کی قسم نہیں اٹھائی بلکہ

اپنی مخلوقات کی قسمیں اٹھائی ہیں۔

مخلوقات کی قسمیں کیوں؟

اس مقام پر بعض متکلمین کی کتابوں میں یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی عظمت وجلالتِ شان کے باوجود قسم کھانے کی ضرورت کیوں محسوس فرمائی؟ اور پھر اپنی ذات گرامی کے علاوہ مظاہرِ کائنات کی کیوں قسمیں کھائیں؟ جب کہ غیر اللہ کی قسم کھانا منع ہے۔ ان سوالات کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) ایک جواب یہ ہے کہ جہاں مخلوقات کی قسم کھائی ہے وہاں مضاف محذوف ہے جیسے التین والزیتون اصل میں ورب التین والزیتون ہے اور والشمس وضحھا ورب الشمس وضحھا ہے۔ ابن ابی حاتم حسن بصری سے روایت لائے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے جس کی چاہیں قسمیں اٹھائیں کسی اور کو جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم اٹھائے علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فرمان لعمرک میں نبی ﷺ کی قسم اٹھائی ہے تاکہ لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں جو آپ ﷺ کی عظمت ہے وہ معلوم ہو ابن مردویہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے مکرم معظم کوئی چیز پیدا نہیں کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سوا اپنی مخلوقات میں سے کسی کی زندگی کی قسم نہیں اٹھائی ہے۔ ❶

(۲) چونکہ قرآن مجید محاورہ عرب کے مطابق ہے اس لیے بیان کے پیرائے عادات عرب کے مطابق اختیار کیے گئے ہیں۔ ابو القاسم القشیری نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قسم کو دلیل و حجت کے کمال اور تاکید کے لیے ذکر فرمایا ہے کسی مسئلے میں مخاطب کے اطمینان کے دو طریقے ہیں ایک تو شہادت کا اور دوسرا قسم کا قرآن مجید میں

❶ معترك الاقران فى اعجاز القرآن السيوطى ص ٣٤٢

یہ دونوں طریقے استعمال ہوئے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے علاوہ جن چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں اس سے ان چیزوں کی فضیلت یا ان کی منفعت اور افادیت کو بتلانا مقصود ہے یعنی مقسم بہ کا بڑی چیز ہونا یا صفاتِ جلیلہ والا ہونا یا بڑی شان والا ہونا معلوم کروانا ہوتا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے مظاہر و نشانات کی قسم اس لیے کھاتے ہیں کہ وہ چیزیں (یعنی مقسم بہ) اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس اور صفات کو مستلزم ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ان کی قسم اٹھانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیاں ہیں۔

(۴) چوتھا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں مخلوقات کو مقسم بہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مقسم علیہ کے دلائل ہیں جو بصورتِ قسم لائے گئے ہیں۔ ان میں استدلال کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ جن چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں کبھی تو وہ ایک چیز ہوتی ہے جیسے والقلم وما یسطرون اور النجم الثاقب اور والعادیات ضبحا اور والذاریات ذروا اور کبھی متعدد چیزیں ہوتی ہیں جن کو علتِ مشترکہ جمع کر رہی ہوتی ہے جیسے سورت التین اور البلد اور الطور اور الشمس اور اللیل میں ہے۔[1]

[1] الاتقان ج۲ ص ۱۳۱

مخلوقات کی قسمیں دلائل وشواہد ہیں

دکتور عدنان محمد زرزور علوم القرآن ص ۳۴۷ میں فرماتے ہیں کہ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآنی قسموں کی تفسیر میں دو اصولوں پر اعتماد کیا ہے۔

(۱) پہلا اصول: اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اور مخلوقات کی قسم اٹھائی ہے اور مخلوقات کی قسم اٹھانا بھی اپنی ذات کی قسم اٹھانے کے باب سے ہے کیونکہ مقسم بہ مخلوقات اسکی نشانیاں ہیں۔ اس اصل کے ذریعہ سے ابن قیم رحمہ اللہ نے اس شبہ کے ازالہ کی کوشش کی ہے کہ مخلوقات کی قسم اٹھانے سے ان کے مرتبہ و مقام سے انہیں بڑھانا ہے ابن قیم رحمہ اللہ نے اس بات کی بنیاد اس قول پر رکھی ہے کہ قسم مقسم بہ کی تعظیم کو متضمن ہے۔ ابن ابی الاصبع نے کہا ہے کہ مصنوعات کی قسم صانع کی قسم کو مستلزم ہے اس لیے کہ مفعول کا ذکر فاعل کے ذکر کو مستلزم ہے کیونکہ فاعل کے بغیر مفعول کا وجود محال ہے۔

(۲) دوسرا اصول: تمام قسمیں مقسم علیہ کے علم کی دلالتیں ہیں یعنی مقسم بہ مقسم علیہ کی دلیلیں ہیں اسی لیے قرآن مجید میں منکرین کے لئے تاکید پیدا کرنے کے لیے توحید، رسالت، آخرت پر قسمیں کھائی گئی ہیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ نے قسم والی اکثر آیات کی تفسیر اس طریق سے کی ہے جس کے ذریعہ سے مقسم بہ کی مقسم علیہ پر دلالت واضح اور ظاہر ہو جب مقسم بہ اور مقسم علیہ کا ربط ابن قیم رحمہ اللہ پر مشکل ہوتا ہے تو وہ مقسم علیہ کو محذوف اور قسم کو صفاتِ باری تعالیٰ پر دلالت کرنے والا ٹھہرا لیتے ہیں اور کبھی یہ وضاحت کرتے ہیں کہ قسم سے مقصد مقسم بہ کی تعظیم مراد ہے۔ دکتور عدنان محمد زرزور [1] فرماتے ہیں: کہ ابن قیم رحمہ اللہ کا یہ جواب

[1] علوم القرآن مدخل الی تفسیر القرآن وبیان اعجازہ

کمزور ہے اس لیے کہ جب مقسم بہ مخلوق ہے تو اس کی تعظیم والا شبہ تو اس تاویل سے دور نہیں ہوتا کیونکہ قسم کا مخلوقات کے ساتھ تعلق واضح ہے اور مخلوقات کا اللہ عزوجل کی نشانیاں اور اسکی صفات کے دلائل ہونا ان کو مقسم بہ ہونے سے نکالتا نہیں ہے یہ چیز تقاضا کرتی ہے کہ ہم لغت عرب میں قسم سے جو مراد لیا جاتا ہے اس کو معلوم کریں تاکہ ہمیں قرآن مجید میں مقسم بہ کے تنوع کا حقیقی سبب معلوم ہو سکے۔ اقوامِ عالم کے ہاں قسم اصل میں تاکید کے اسلوبوں میں سے ایک اسلوب ہے کبھی وہ تاکید و پختگی کو دایاں ہاتھ پکڑ کر بیان کرتے ہیں جیسے عربوں رومیوں اور عبرانیوں کا حال تھا۔ کسی معاہدہ یا بڑے معاملہ کے وقت ان کا بعض دوسرے کے دائیں ہاتھ کو پکڑ کر پختگی اور تاکید پیدا کرتے اسی بنا پر وہ قسم کا نام یمین رکھتے اس وجہ سے قسم کفالت: ضمانت کے معنی کو متضمن ہوئی یا تاکید مطلق کے معنی کو متضمن ہوئی جس (یعنی تاکید مطلق) کے ہوتے ہوئے مقسم بہ کے وجود یا ہر جگہ اس کو مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

جب ہم ان تمام کلمات پر غور کرتے ہیں جو قسم کے لیے اکثر استعمال ہوتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ قسم کے لیے مقسم بہ لازم نہیں ہے چہ جائے کہ مقسم بہ کی تعظیم لازم آئے جس طرح ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

جب قسم مقسم بہ کو متضمن ہو تو ایسا مقسم بہ اصل میں اس لیے آتا ہے کہ اس کو بطور شہادت پیش کیا جائے مقسم بہ کی تعظیم کا عارضہ اس وقت لاحق ہوتا ہے جب قسم اللہ عزوجل اور اس کے شعائر کی کھائی جائے۔ مخلوقات کی قسم استشہاد ہونے پر دلالت کرتی ہے اکثر اوقات وہ مقسم بہ کو بطور استدلال ہی لاتے ہیں کلامِ عرب میں یہ انداز (یعنی مخلوقات کی قسم بطور دلیل و شہادت) بہت زیادہ ہے عرب جن چیزوں کی عبادت اور تعظیم نہیں کرتے تھے وہ ان کو بھی مقسم بہ بنا کر اپنے اقوال پر بطورِ شاہد لاتے ہیں۔

جب ہمارے لیے یہ واضح ہو گیا کہ قسم اصل میں استشہاد ہے اور قسم سے مقسم بہ کی تعظیم اس وقت لازم آتی ہے جب اللہ تعالیٰ اور اس کے شعائر کی قسم کھائی جائے اکثر اوقات قسم صرف استدلال کے لیے آتی ہے اسی لیے ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ جب اللہ

تعالیٰ اپنے ماسوا کی قسم اٹھائے تو اس کی تفسیر اس انداز میں کریں کہ مقسم بہ کی تعظیم ثابت کریں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو پھنکارے مارتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں اور تیز آندھی کی قسم اٹھائی اس سے مراد ان کی تعظیم ہو جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مقسم بہ بننے والی مخلوقات میں سے آسمان وزمین سورج چاند ستارے اور بادل وغیرہ کے متعلق وضاحت فرمائی کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے مسخر اور اطاعت کرنے والے ہیں تو پھر ان کی تعظیم تو مراد نہیں ہوگی بلکہ ان کی قسم کھانے سے مراد صرف ان چیزوں کو بطورِ شاہد اور دلیل کے لانا ہے۔

مزید یہ کہ ہم ایسے مواقع (جب مقسم بہ مخلوقات ہو) پر دیکھتے ہیں کہ مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت واضح ہے کیونکہ قرآن مجید میں ان قسموں میں اکثر کو اس طرح رکھا ہے کہ غور وفکر کرنے والے پر ان کی مقسم علیہ پر دلالت کرنا مخفی نہیں رہتا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ جن کا ابن قیم رحمہ اللہ کی طرح خیال ہے کہ مخلوقات کی قسم کھانے میں ان کی تعظیم مراد ہوتی ہے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جو زیتون اور انجیر کی قسم اٹھائی ہے وہاں وہ تکلف کر کے ان کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ لیکن عمومی پہلو سے ان پر یہ بات مخفی نہیں رہی ہے کہ سورتوں کے شروع میں مخلوقات کی آنے والی قسمیں مقسم علیہ پر دلالت کرتی ہیں (یعنی مقسم بہ مقسم علیہ کے یے دلائل وشواہد ہیں جو بصورتِ قسم پیش کیے گئے ہیں) مثلاً سورت الذاریات کی امام رازی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں انها كلها دلائل اخرجها فى صورة الايمان کہ سورت الذاریات میں مقسم بہ مخلوقات مقسم علیہ کے دلائل ہیں لیکن انہیں بصورت قسم لائے ہیں۔ اگر امام رازی رحمہ اللہ ان تمام قسموں پر غور فرماتے جو قرآن مجید میں استدلال کے انداز میں آئی ہیں تو شاید وہ باقی تمام سورتوں میں بھی یہی تفسیر اختیار کرتے۔ جو انہوں نے سورت الذاریات میں اختیار فرمائی ہے۔

اس بات کو کہ قرآن مجید میں مخلوقات کی قسمیں مقسم علیہ پر دلائل ہیں۔ یہ چیز مزید

واضح کرتی ہے کہ بعض قسموں کے بعد یہ تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ یہ قسمیں دلائل اور بصیرتیں ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے سورت الواقعہ میں ارشاد فرمایا: ﴿فَلَآ أُقۡسِمُ بِمَوَٰقِعِ ٱلنُّجُومِ وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُونَ عَظِيمٌ﴾ ''میں ستاروں کے واقع اور غروب ہونے کی جگہوں کی قسم کھاتا ہوں اور بلاشبہ یہ بڑی قسم ہے اگر تمہیں معلوم ہو۔'' اس قسم میں اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ مواقع النجوم میں بہت بڑی دلالت اور بڑی شہادت ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے قسم کے بڑے ہونے کی صراحت فرمائی ہے مقسم بہ مواقع النجوم کے بڑے ہونے کا ذکر نہیں فرمایا ہے اور اسی کے قریب یہ وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مقسم بہ کی خاص وصف ذکر فرماتے ہیں جو اس کے استدلال کے پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے مثلاً والنجم اذا ھویٰ اور فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس اور والصافات صفا فالزاجرات زجرا فالتالیات ذکرا اور والذاریات ذروا فالحاملات وقرا فالجاریات یسرا فالمقسمات امرا اور ولا اقسم بالنفس اللوامۃ اور دیگر آیات کریمہ۔ ستاروں کا چھپنا اور غروب ہونا، فرشتوں کا صفیں بنانا، ہواؤں کا اڑانا اور چیزوں کو تقسیم کرنا اور نفس کا ملامت کرنا ان چیزوں کا مقسم علیہ کی دلیل بننا ان کی تعظیم سے زیادہ قریب ہے جس طرح یہ واضح ہے۔

قران مجید میں مخلوقات کے مقسم بہ بہت زیادہ بننے کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں استدلال کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس طرح مخلوقات کی زیادہ قسمیں کھائی ہیں اسی طرح مخلوقات کو بہت کثرت سے اپنے وجود اور ذاتِ گرامی قدر اور قدرت کاملہ وغیرہا کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان اور زمین سورج اور چاند' رات اور دن' فجر اور چاشت' ہوا اور بادل' پہاڑوں اور سمندر' امن والے شہر اور انسان کے والد اور اولاد کی' مذکر اور مؤنث کی قسمیں کھائی ہیں بالکل اسی طرح ان مظاہرِ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے بطورِ دلائل بھی ذکر فرمایا ہے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ (البقرہ: ۱۶۴)

”بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات اور دن کے ہیر پھیر، کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا، آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کرنا، اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا ، ہواؤں کے رخ بدلنا اور بادل جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں ان میں عقل مندوں کے لیے قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں۔“

قران مجید میں اس طرح کی آیات بہت ہیں مظاہرِ کائنات کو بصورتِ مقسم بہ دلائل ہونے کے دیگر شواہد بھی ہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی جو بہت قسمیں کھائی ہیں ان میں سے سورت الشّمس میں آنے والی قسم کے جمال وحسن کا کیا کہنا اور اس میں استدلالی پہلو نمایاں ہے ارشاد فرمایا:

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ٥ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ٥ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ٥ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ٥ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ٥ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ٥ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا ٥ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰاهَا ٥ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ٥﴾

”قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی اور چاند کی جب اس کے پیچھے آئے اور دن کی جب سورج کو نمایاں کرے اور رات کی جب اسے ڈھانپ لے اور آسمان کی اور اس کے بنانے کی اور زمین کی اور اسے ہموار کرنے اور نفس کی اور اسے درست بنانے کی پھر اس کو برائی اور پرہیز گاری کی سمجھ دی تحقیق کامیاب

ہوا جسے اس نے پاک کیا اور نا کام ہوا جسے اس نے خاک میں ملا دیا۔

اولاً: آپ دیکھیں گے کہ یہ قسم انسان کے اندر اس کائنات کے مدبر اور دقیق ونہایت محکم انداز میں اس کائنات کے معاملات وشؤون کی انتظام کرنے والی ہستی کے ساتھ فریفتگی کے قوی ترین احساسات کو اجاگر کرتی ہے۔ کیا یہ سورج جو صبح کے وقت اپنے حسن وجمال کے انتہاؤں کو پہنچا ہوا ہوتا ہے اور سورج غروب ہونے کے بعد نکلنے والا چاند جو کہ کائنات کی خوبصورتی میں سورج کا نائب بنتا ہے اور دن جو چمکتے سورج کو ظاہر کرتا ہے اور پھر رات آ کر اس کی روشنی اور چمک کو مٹا دیتی ہے اور یہ آسمان جسے اللہ تعالیٰ نے نہایت محکم ومضبوط بنایا اور یہ زمین جو نہایت کشادہ بنائی اور عجیب الخلقت نفس انسانی جس کی طرف وہ نہایت باریکی اور پوشیدگی میں ہدایت وضلالت کو سرایت کرتا ہے۔ کیا یہ سب چیزیں انسان کو گہری سوچ اور ان کے ساتھ ان کے خالق سبحانہ وتعالیٰ پر استدلال کرنے پر آمادہ نہیں کرتیں؟

سورت الواقعہ میں آنے والی قسم کا کمال وجلال بھی نمایاں ہے ارشاد فرمایا:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝﴾

”میں ستاروں کے گرنے کی قسم کھاتا ہوں اور اگر تمہیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے بلاشبہ قرآن بڑی عزت والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے۔

ایسے ہی سورت النجم میں آنے والی قسم ہے ارشاد فرمایا:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾

”ستارے کی قسم جب وہ گرے کہ تمہارے ساتھی نے راہ گم کی ہے نہ وہ ٹیڑھی راہ پر ہے اور نہ ہی وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتا ہے وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے ان قسموں میں نگاہِ انسانی کو ستاروں کی طرف متوجہ فرمایا بے پناہ قدرت والی ذات گرامی نے ان کو کیسا خوبصورت ومضبوط ومحکم بنایا اور مختلف اوقات میں ان کا گرنا جس سے نفس انسانی میں خوف ودہشت پیدا ہوتی ہے۔ یہ چیزیں خالق کائنات پر دلالت کرتی ہیں اور اس کی صفتِ خلق پر فریفتگی اور اس کے ساتھ ایمان لانے پر ابھارتی اور آمادہ کرتی ہے۔

عبدالرحمٰن حسن قوائد التدبر الامثل۔ ص ۴۷۳۔ میں فرماتے ہیں قرآن مجید میں مظاہرِ کائنات کو مقسم بہ بنانے سے غرض ان دلائل اور واضح نشانیوں پر تنبیہ کرنا ہے جو ان میں پائی جاتی ہیں۔ جو شخص ان دلائل وآیات میں غور وفکر کرے گا اور بحث اور علمی استنباط کا اہل ہوگا تھوڑے عرصہ ہی کے بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کو معلوم کرلے گا اور وہ دلائل وآیات لوازم عقلیہ کے طریق سے مقسم علیہ کے تسلیم کرلینے کے کی طرف اس کی رہنمائی کریں گے کیونکہ ان کی قسم کھانے والی عظیم ہستی ہے اور دلائل وآیات اس کی قدرت کے کمال اور احاطہ علمی اور عظیم حکمت کے آثار ہیں۔ رب العزت عظیم ہستی کا ان دلائل وآیات کے ساتھ قسم اٹھا کر غیبی امور وقضایا کے متعلق خبر دینا لازمی طور پر حق اور سچ ہوگا جبکہ وہ خود ان کا موجد اور مقدر کرنے والا ہے۔

مظاہرِ کائنات کو مقسم بہ بنانے سے غرض اولاً مخاطبوں کی نظروں کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت وحدانیت اور اس کی الوہیت کی طرف متوجہ کرنا جس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ ثانیاً رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے اور حساب وجزا کے برحق ہونے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

عبدالرحمٰن حسن قوائد التدبر الامثل ص ۴۷۶۔ میں مزید فرماتے ہیں کہ جب مقسم بہ مظاہرِ کائنات ہوں تو قسم کے مخاطبِ اول اس وقت غیر مسلم ہوتے ہیں کیونکہ انہیں ہی اس کی ضرورت ہے کہ ان کی فکر کو خدائی آثار کی طرف متوجہ کیا جائے۔ مقسم بہ ان کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت الوہیت اور اس کے لوازم کے ساتھ ایمان لانے پر آمادہ کرے۔ ان

لوازم سے ایک یہ کہ اس کی غیبی خبروں کی تصدیق کرنا مثلاً روز آخرت اور اس کی تفصیلات۔ دوسرا لازم اس کی کتاب اور رسول کی تصدیق کرنا اور رسول انہیں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بتاتا ہے ان کی تصدیق کرنا جن صفات باری تعالیٰ پر مظاہرِ کائنات انسان کی راہنمائی نہیں کرتے۔

مقسم بہ کی بابت دکتور عبدالفتاح التاویل النحوی فی القرآن الکریم الجزالاول میں ذکر کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں کبھی قسم اور کبھی جواب قسم کا حذف کرنا دونوں طرح آیا ہے لیکن قسم کا حذف کرنا زیادہ ہے اور جملہ قسم کو اس وقت حذف کرتے ہیں جب جوابِ قسم جملہ قسم سے مستغنی کر دے جملہ قسم کو مندرجہ ذیل صورتوں میں حذف کر دیتے ہیں۔

(۱) جب جواب قسم لقد کے ساتھ شروع ہو
(۲) فعل مضارع کے شروع میں لام مفتوحہ اور آخر میں نون تاکید آئے
(۳) فعل ماضی جامد کے شروع میں لام مفتوحہ آئے
(۴) جواب قسم میں لائے نافیہ آئے
(۵) جواب قسم کے شروع میں اِنَّ آئے
(۶) فعل ماضی مثبت لام کے ساتھ آئے
(۷) جواب میں لام کے آئے
(۸) جواب قسم فعل مضارع کے شروع میں لائے نفی اور آخر میں نون تاکید آئے
(۹) جوابِ قسم جملہ اسمیہ لامِ کے ساتھ آئے
(۱۰) جواب کے شروع میں أن مخففہ آئے۔
(۱۱) جواب کے شروع میں لام اور سوف آئے
(۱۲) لام موطئہ للقسم آئے
(۱۳) جواب قسم کے شروع میں اِنْ نافیہ آئے اس کی مثال سورت مریم: آیت ۷۱

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾

ابن عطیہ اور ابوعبید اور السبکی کہتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں واوٗ حرف قسم ہے اور اِنْ نافیہ جواب قسم کے شروع میں آیا ہے اس کی تائید آپ ﷺ کا فرمان لایموت لمؤمن ثلاثة اولاد فتمسه النار الا تحلة القسم بھی کرتا ہے۔ ابوحیان وغیرہ کہتے ہیں اس آیت کریمہ میں قسم نہیں ہے۔

جوابِ قسم عبدالفتاح کے نزدیک مندرجہ ذیل صورتوں میں محذوف ہوتا ہے۔

۱۔ جہاں بظاہر یہ محسوس ہوا کہ جوابِ قسم کے شروع میں لام کی ہے۔

۲۔ جہاں بظاہر یہ محسوس ہو کہ جوابِ قسم کے شروع میں حرف نفی لن آیا ہے۔

۳۔ جہاں بظاہر یہ محسوس ہو کہ جوابِ قسم کے شروع میں فا آئی ہے۔

۴۔ جہاں یہ محسوس ہو کہ جوابِ قسم کے شروع میں ھل آیا ہے۔

۵۔ جہاں بظاہر یہ محسوس ہو کہ جواب قسم ہے لیکن اس میں لام حذف ہو۔

قرآن مجید میں مقسم علیہ یعنی جن چیزوں پر قسمیں کھائی گئی ہیں وہ بھی متعدد ہیں

قرآن مجید میں مقسم علیہ متعدد اشیاء ہیں۔ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ التبیان فی اقسام القرآن میں فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایمان کے ان اصول پر قسمیں کھاتے ہیں جن کی معرفت مخلوق پر واجب ہے

(۱) کبھی توحید پر جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا٥ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا٥ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا٥ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ﴾

”قسم ہے صف باندھنے والے (فرشتوں) کی پھر پوری طرح ڈانٹنے والوں کی پھر ذکر کی تلاوت کرنے والوں کی یقیناً تم سب کا معبود ایک ہی ہے۔“

(۲) کبھی رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی حقانیت پر جیسے فرمایا:

﴿يٰسٓ٥ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ٥ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

''یٰسین'' قرآن حکیم کی قسم کہ بلاشبہ آپ رسولوں میں سے ہیں سیدھے راستے پر ہیں۔''

(۳) کبھی قرآن مجید کے حق اور منزل من اللہ ہونے پر جیسے فرمایا:

﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ o وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ o اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ o فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ o لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ o تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ o﴾

''میں ستاروں کے گرنے کی جگہوں کی قسم کھاتا ہوں اور اگر تمہیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے بے شک یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں یہ رب العالمین کی طرف سے اترا ہوا ہے۔''

(۴) کبھی جزا و سزا کے برحق ہونے پر جیسے ارشاد فرمایا:

﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا o فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا o فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا o فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا o اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ o وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ﴾

''قسم ہے اڑا کر بکھیرنے والی ہواؤں کی پھر بوجھ کو اٹھانے والیوں کی پھر نرمی سے چلنے والیوں کی پھر کام کو تقسیم کرنے والیوں کی یقین مانو کہ تم سے جو وعدے کیے جاتے ہیں (سب) سچے ہیں اور بیشک انصاف ہونے والا ہے۔''

(۵) کبھی انسانی حالت پر قسم اٹھائی جاتی ہے جیسے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى o وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى o وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى o اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى o﴾

''قسم ہے رات کی جب چھا جائے اور دن کی جب روشن ہو اور اس ذاتِ گرامی کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا یقیناً تمہاری کوشش مختلف قسم کی ہے۔''

نیز ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قسم سے مقسم علیہ کی تاکید اور تحقیق مراد ہوتی ہے لہذا ضروری ہے کہ مقسم علیہ ایسی چیز ہو جس پر قسم کھانا اچھا اور مستحسن ہو مثلاً غیبی اور

مخفی چیزیں جب ان کے ثبوت پر قسم اٹھائی جائے۔مشہور اور ظاہری اشیاء مثلاً سورج چاند' رات' دن' آسمان' زمین ان کو مقسم بہ بنایا جاتا ہے مقسم علیہ نہیں بناتے جوابِ قسم اکثر ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی حذف ہو جاتا ہے۔

دکتور عبدالجلیل عبدالرحیم لغۃ القرآن الحکیم میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ثبوت کے لیے ایک مقام پر قسم کھائی گئی ہے۔قرآن مجید کے حق ہونے پر پانچ مقام میں۔رسول اللہ ﷺ کے سچے اور برحق ہونے کی بھی پانچ مقامات پر قسم کھائی گئی ہے۔قیامت کے برحق ہونے پر بارہ (۱۲) مقامات پر۔انسانی احوال اور صفات پر پانچ مقامات پر۔ان تمام میں مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان تعلق کبھی واضح اور نمایاں ہوتا ہے اور کبھی نہایت مخفی اور دقیق ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ربوبیت 'رسالت' قرآن مجید' انسانی ابتداء اور انتہاء پر جس طرح صریح قسمیں کھائی گئی ہیں اسی طرح غیر صریح قسمیں بھی کھائی گئی ہیں۔لیکن روزِ قیامت اور اس کے مشاہد پر صرف صریح قسمیں استعمال کی گئی ہیں۔کیونکہ مشرکین اس کے بہت منکر تھے اور اہل کتاب کی بعض صفات اور دعوتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے بارے ان کے موقف پر غیر صریح قسموں کا استعمال ہوا ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم اپنے سے پہلے ادبِ عربی سے جن چیزوں میں ممتاز ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں مقسم علیہ کی انواع بہت ہیں جو لغتِ عرب اور ادبِ عربی میں دیکھنے میں نہیں آئی ہیں۔

مقسم علیہ کے محذوف ہونے کے بارے اختلاف

قرآن کریم میں مقسم علیہ کے محذوف ہونے کے بارے علماء کا اختلاف ہے بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن کریم میں مقسم علیہ سات (۷) جگہ محذوف وارد ہوا ہے۔اور بعض کا نظریہ ہے کہ ان سات مقامات پر بھی مقسم علیہ محذوف نہیں ہے۔لیکن جوابِ قسم معلوم

کرنے لیے سوچ و بچار اور محنت کی ضرورت ہے۔ جوابِ قسم محذوف ماننے سے یہ زیادہ آسان اور برحق ہے پہلے حضرات ان کے نظریہ کا جواب یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر محذوفات آئے ہیں لہذا مقسم علیہ بھی محذوف ہوسکتا ہے۔ بعض علماء کا نظریہ ہے کہ ان سات مقامات پر مقسم علیہ یعنی جوابِ قسم کی ضرورت نہیں کیونکہ ان مقامات پر صرف مقسم بہ کی ذات کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کرنے والی عظیم نشانی ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مقسم علیہ یعنی جوابِ قسم اکثر اس وقت حذف ہوتا ہے جب خود مقسم بہ مقسم علیہ پر دلالت کرے کیونکہ مقسم بہ کے ذکر کر دینے سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور جوابِ قسم کے حذف کرنے میں بلاغت زیادہ ہوگی اور اختصار و ایجاز بھی زیادہ ہوگا جیسے ارشاد فرمایا ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِo﴾ اس قسم میں مقسم بہ مقسم علیہ پر دلالت کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے کسی انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے۔ اسی لئے اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ جوابِ قسم ان القرآن لحق پوشیدہ ہے۔

دکتور عدنان محمد زرزور فرماتے ہیں: اگر جوابِ قسم یعنی مقسم علیہ ایسا ہو کہ مخالف اس کا انکار کرسکتا ہو تو کبھی جوابِ قسم کو حذف کر دیا جاتا ہے جب وہ جملہ خبریہ ہو اور مقسم بہ کے ساتھ اکتفا کر لیتے ہیں تاکہ جلدی سے ایک دوسری کلام لائی جائے جو محذوف جوابِ قسم کی تائید کرنے والی ہوتا کہ مخالف کو اتنا موقعہ ہی نہ مل سکے کہ وہ انشاء کو خبر کی طرف پھیر کر جھگڑا کرنے لگے گویا قسم کا یہ اسلوب (یعنی مقسم علیہ کو حذف کر دینا) مخالف کو بات سننے کی فرصت مہیا کرتا ہے اور اسے جوابِ قسم کے انتظار پر لگا دیتا ہے پھر موقعہ مل جاتا ہے کہ سابقہ کلام (جو بصورت قسم لائے تھے) سے جو استدلال مقصود ہوتا ہے اس کا مؤید لے آئیں جیسے ارشاد فرمایا:

﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِo بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍo﴾

جوابِ قسم محذوف ہے اور مقسم بہ قرآن کی ذی الذکر صفت ہے جوابِ قسم سے استغناء کرلیا ہے گویا یوں فرمایا ''قد شهد القرآن انه لذكر لهم و نصح ''یعنی قرآن شہادت ہے (یعنی دلیل ہے) کہ بلاشبہ وہ ان کے لیے نصیحت اور خیر خواہی ہے پھر ''بل الذين كفروا فی عزة و شقاق '' سے مخاطبوں کی ان خصلتوں کا ذکر شروع کردیا جن کا وہ انکار نہیں کرتے تھے بلکہ ان صفات پر فخر کرتے تھے اور ساتھ اشارہ کیا کہ وہ قرآن کا انکار صرف حمیتِ جاہلیہ کی بنا پر کرتے ہیں اور حق سے یوں ہی جھگڑا کرتے ہیں۔

اگر جوابِ قسم ایسا ہو کہ مخالف اس کا انکار نہیں کرتا تو اس کو حذف نہیں کرتے جیسے ارشاد فرمایا:۔

﴿حٰمٓ ٥ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ٥ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥﴾

قسم میں قرآن کے کتابِ مبین ہونے اور جوابِ قسم میں قرآن عربی ہونے کا ذکر کیا کیونکہ مشرکین ان دونوں میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کرتے تھے۔

دکتور عبدالفتاح احمد الحموز التاویل النحوی فی القرآن الکریم الجزء الاول میں ذکر کرتے ہیں کہ نحوی کہتے ہیں مقسم علیہ یعنی جوابِ قسم پر اگر کوئی دلیل دلالت کرے تو اس کو حذف کردیتے ہیں اور اپنی کتب میں نحویوں نے قرآن مجید اور کلامِ عرب سے بعض شواہد کا ذکر کیا ہے لیکن میں اس بحث میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مقسم علیہ کو یعنی جوابِ قسم کو حذف کرنا بنسبت مقسم بہ یعنی جملہ قسم سے بہت کم ہے اہم مقامات جہاں جوابِ قسم کو حذف کیا جاتا ہے مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) جہاں بظاہر یہ نظر آئے کہ جوابِ قسم لام کے ساتھ شروع ہورہا ہے فرمایا:۔

﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ﴾ تقدیر عبارت یوں ہے'' يحلفون بالله لكم ليكونن كذاوكذا لتعرضوعنهم''

(۲) جہاں بظاہر یوں معلوم ہو کہ جوابِ قسم لن حرفِ نفی کے ساتھ شروع ہورہا ہے جیسے ارشاد فرمایا:

﴿قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَ نَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیَاةَ الدُّنْیَا﴾

بعض نحویوں نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ والذی فطرنا قسم ہے اور اس کا جواب محذوف ہے جس پر لن نؤثرك دلالت کر رہا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے والذی فطرنا لانؤثرك

(۳) جہاں بظاہر اس طرح معلوم ہو کہ جواب قسم فاء کے ساتھ شروع ہو رہا ہے مثلاً:

﴿وَنَجْعَلُ لَکُمَا سُلْطَانًا فَلاَ یَصِلُوْنَ اِلَیْکُمَا بِاٰیٰتِنَا اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَکُمَا الْغٰلِبُوْنَ﴾

بعض نحوی ایک احتمال اس آیت کریمہ میں یہ ذکر کرتے ہیں کہ بآیاتنا میں باء قسمیہ اور اس کا جوابِ قسم محذوف ہے جس پر فلا یصلون دلالت کرتا ہے تقدیر عبارت یوں ہے "بآیتنا لا یصلون الیکما"

(۴) جہاں یوں ظاہر ہو کہ جوابِ قسم ھل کے ساتھ شروع ہو رہا ہے مثلاً

﴿وَالْفَجْرِo وَلَیَالٍ عَشْرٍo وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِo وَاللَّیْلِ اِذَا یَسْرِo هَلْ فِیْ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍo﴾

زمخشری رحمہ اللہ کے نزدیک یہاں جوابِ قسم لتعذبن مقدر و محذوف ہے۔

(۵) جہاں یوں ظاہر ہو کہ جواب قسم کے شروع سے لام حذف ہے باقی جوابِ قسم مذکور ہے حالانکہ جوابِ قسم مکمل محذوف ہو مثلاً

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِo وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِo وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍo قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ﴾

اس مقام میں جوابِ قسم لتبعثن محذوف ہے لیکن یوں ظاہر ہوتا ہے کہ قتل اصحاب الاخدود جواب قسم ہے جس کے شروع سے لام حذف ہو گیا حالانکہ یہ جوابِ قسم نہیں ہے۔

(٦) مقسم علیہ یعنی جوابِ قسم عموماً ذکر کیا جاتا ہے لیکن کبھی حذف ہوتا ہے جیسے

﴿ وَالْفَجْرِo وَلَيَالٍ عَشْرٍo وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِo وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِo هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ﴾

ایک قول ہے کہ یہاں جوابِ قسم لتعذبن یا کفار مکة محذوف ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جوابِ قسم اکثر وہاں حذف کرتے ہیں جہاں مقسم بہ اس پر دلالت کرے تو وہاں مقسم بہ کے ذکر کرنے سے مقصود حاصل ہوجاتا ہے تو جوابِ قسم کا حذف کرنا زیادہ بلیغ اور زیادہ اختصار ہوگا۔

اغراضِ قسم

قرآن مجید میں اغراضِ قسم متعدد ہیں دکتور عبدالجلیل لغت القرآن الکریم میں ذکر کرتے ہیں کہ لغتِ عرب میں قسم کے اغراض ومقاصد یہ ہوتے تھے:

(۱) اکثر حالات میں قسم سے کسی معین واقعہ کی خبر کی صرف تاکید مقصود ہوتی ہے۔ (۲) عزت ومجد کی تاکید (۳) قسم اٹھانے والے یا ممدوح کی آراستگی کے لئے (۴) معذرت کے لئے عرب اکثر قسم کھاتے (۵) شک کی نفی کے لیے (٦) مقسم بہ کی تکریم (۷) مقسم علیہ کی صحت ودرستگی پر استدلال کے لئے قسم کھائی جاتی تھی۔

قرآنِ کریم میں قسموں کی اغراض بہت ہیں اہم اغراض قسم یہ ہیں:۔

(۱) کائنات اور کائنات جن حقائقِ غریبہ اور اسرارِ عجیبہ پر مشتمل ہے اور جو اس میں عالیشان محکم نظام ہے ان کی طرف نگاہوں کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا اثبات یہ اس طرح کہ عربوں کا عقیدہ تھا کہ جھوٹی قسموں سے گھر برباد ہوجاتے ہیں اور جھوٹی قسم کھانے والے کو نقصان پہنچتا ہے رسول

اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اکثر قسمیں کھائی ہیں اس کے باوجود آپ ﷺ کو کسی نقصان سے واسطہ نہیں پڑا بلکہ آپ ﷺ کی شان بلند ہوئی اور عالیشان شہرتِ دوام ملی یہ چیز آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل بنی۔

(۳) امورِ غائبہ معنویہ کو امورِ مشہودہ محسوسہ کے ساتھ مثال دینا تاکہ امورِ غائبہ معنویہ نفس میں نہایت مضبوطی سے جگہ پکڑ لیں اور یہ غرض زیادہ ہوتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے صبح' دن' چاشت اور سورج 'رات کی قسمیں اٹھائیں تاکہ اللہ تعالی کے رعب کی تاثیر کے ساتھ نفوسِ انسانیہ میں امورِ معنویہ ہدایت وایمان کے معانی کو جلا ملے۔

(۴) عقائدِ باطلہ کی تصحیح کرنا ستاروں کے غروب ہونے کی اور اس کی مثل اور چیزوں کی قسم کھانے میں ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو ستاروں کی الوہیت اور اس دنیا میں ان کے تصرف کا عقیدہ رکھتے تھے حدیثِ نبوی میں یہی مقصد قسم کے بغیر آیا ہے۔

صحیح بخاری جلد اول ص ۱۴۲ میں حدیث شریف ہے:۔

((کسفت الشمس علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم مات ابراھیم فقال الناس کسفت الشمس لموت ابراھیم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الشمس والقمر لا ینکسفان لموت احد ولا لحیاتہ فاذا رأیتم فصلوا وادعوا اللہ))

"ابراہیم علیہ السلام آپ کے بیٹے جس دن فوت ہوئے سورج بے نور ہو گیا لوگوں نے کہا ابراہیم کی موت کی وجہ سے بے نور ہوا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلا شبہ سورج چاند کسی شخص کی پیدائش اور وفات پر بے نور نہیں ہوتے۔ جب ایسا دیکھو تو نماز پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ سورج چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں۔

(۵) مقسم علیہ کی تحقیق وتاکید خاص کر جب مقسم علیہ مخفی امورِ غائبہ سے ہو تو اللہ تعالیٰ ان

کے اثبات کے لیے قسم کھاتے ہیں جیسے: بعث' حشر' حساب۔

(٦) نمایاں واقعات کی طرف نگاہوں کو متوجہ کرنا جیسے اللہ عزوجل نے طور اور بلدِ امین کی قسمیں کھائی ہیں۔ طور پہاڑ کی قسم سے معجزاتِ موسیٰ علیہ السلام کی یاددہانی اور بلدِ امین کی قسم سے غلبہ اسلام اور بیت اللہ کے ساتھ مکہ المکرّمہ کے تعلق اور اس کی طویل تاریخ کی طرف متوجہ کیا ہے۔

عبد الرحمٰن حسن حنبکہ المید انی قوائد التد بر الامثل میں مندرجہ ذیل اغراض ذکر کرتے ہیں:۔

(۱) قسم سے پہلی غرض جو کہ بنیادی غرض ہے اور ہمیشہ ملحوظ ہوتی ہے اور کبھی دیگر اغراضِ قسم میں سے کوئی دوسری بھی اس کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مقسم علیہ جس قضیہ یا قضایا پر مشتمل ہے اس خبر کی تاکید کرنا اس اعتبار سے کہ قسم ایک ایسا اسلوبِ بیانی ہے کہ صاحبِ بیان جو خبر دے رہا ہے اس سے اسکی تاکید لائی جاتی ہے اور تاکید کے صیغوں میں سے کوئی صیغہ لا کر مخاطب کے لیے اس خبر کی تاکید کا ارادہ ہوتا ہے قسم کی یہ غرض علماءِ بلاغت و علماءِ لغت عرب کے ہاں معروف ہے جب مقسم بہ مذکور نہ ہو تو یہ غرض اکیلی ملحوظ ہوتی ہے جیسے اللہ عزوجل کا سورت التکاثر میں فرمان ہے:۔

﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ۝ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ۝﴾

(۲) دوسری غرض مقسم بہ کا بڑی چیز ہونا یا صفاتِ جلیلہ والا ہونا یا اہم ذمہ داریوں والا اور بڑی شان والا ہونا معلوم کروانا۔

لیکن یہ غرض معنیٰ قسم کو لازم آنے والے راستہ اور طریق سے ہے کیونکہ کسی بھی چیز کی قسم کھانا لزومی طور پر معلوم کرواتا ہے کہ وہ چیز قسم اٹھانے والے کے نزدیک عظمت یا بڑی صفتوں یا عظیم الشان فرائض و واجبات والی ہے اکثر حالات میں قسم کی یہ دوسری غرض پہلی غرض کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ سورت النازعات کے شروع میں نرمی یا

سختی سے انسانی روحوں کو قبض کرنے والے اور تنگ یا کشادہ جگہ لے جانے والے فرشتوں کی جو قسم کھائی ہے اس میں دوسری غرض ملحوظ ہے۔اس قسم سے غرض بعث بعد الموت خبر کی تاکید کرنا نہیں ہے کیونکہ فرشتے امورِ غائبہ سے ہیں ان کے ساتھ مکذبین کے سامنے بعث بعد الموت کی خبر کی تاکید نہیں لائی جاسکتی جو کہ خود امرِ غیبی ہے بلکہ امرِ غیبی کی کسی امرِ مشہود کے ساتھ تاکید کی جاتی ہے اس قسم سے غرض یہ خبر دینا ہے کہ فرشتوں کی یہ جماعت ایک بڑی صنف ہے اوران کی بڑی اہم ذمہ داریاں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قَسم کے بلاواسطہ مخاطب مومن ہیں اور دوسرے لوگ تعریضاً مخاطب ہیں اسی لیے اس کے بعد یقولون ائنا لمردون فی الحافرہ آیا ہے۔

(۳) قسم سے تیسری غرض ان دلائل اور واضح نشانیوں پر تنبیہ کرنا ہوتا ہے جو مقسم بہ میں پائی جاتی ہیں جو شخص ان دلائل و آیات پر غور وفکر کرے گا بحث اور علمی استنباط کا اہل ہوگا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُن کو معلوم کرلے گا اور وہ دلائل و آیات لوازمِ عقلیہ کے طریق سے مقسم علیہ کو تسلیم کر لینے کی طرف اس کی رہنمائی کریں گے کیونکہ ان کے طریق سے مقسم علیہ کو تسلیم کر لینے کی طرف اس کی رہنمائی کریں گے اس لئے کہ ان کی قسم کھانے والی عظیم ہستی ہے اور وہ دلائل و آیات اس کی قدرت کے کمال اور اس کے احاطہ علمی اور اس کی عظیم حکمت کے آثار ہیں عظیم ہستی کا ان دلائل و آیات کی قسم کھا کر غیبی امور وقضایا کے متعلق خبر دینا لازمی طور پر حق اور سچ ہوگا جب کہ وہ خود ان کا موجد اور مقدر کرنے والا ہے ایسی قسموں میں مقسم علیہ کی تاکید اسی لحاظ سے حاصل ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں اکثر مظاہر کائنات کی قسمیں کھانے میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے غرض اولاً: مخاطبوں کی نظروں کو کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت اور اس کی الوہیت کی طرف متوجہ کرنا ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

ثانیاً: رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی طرف متوجہ کرنا ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے بہت بڑے معجزے یعنی قرآنِ مجید کے ساتھ تائید فرمائی اور اس کے منزل من اللہ ہونے اور دارِ

آخرت اور مرنے کے بعد حساب وجزا کے لیے اٹھنے کے حق اور سچ ہونے کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ان مظاہرِ کائنات کے خالق و مالک رب کے ساتھ ایمان لانے والا قیامت کے دن جزا وسزا پر شک نہیں کرسکتا اور نہ ہی اسے اس میں شک ہوسکتا ہے کہ قرآنِ کریم رب العالمین کا کلام ہے جسے صادق امین رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے پہنچایا ہے۔

قسم کی تیسری غرض کی مثالوں میں سے ایک مثال سورت الشّمس ہے ارشاد فرمایا:۔

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ٥ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ٥ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ٥ وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا٥ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا٥ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا٥ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا٥ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا٥ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا٥﴾

ان آیات میں مقسم علیہ جزا کے دن فیصلے اور حساب کا نتیجہ ہے اور یہ نتیجہ اور فیصلہ حیاتِ اخروی کے لیے دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد ہی ہوگا۔اور مقسم بہ مظاہرِ کائنات ہیں جو علیم وحکیم قدرت رکھنے والی ذات کی صفتِ خلق کے آثار ہیں جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے جو شخص انصاف اور گہرائی سے ان مظاہر پر غور وفکر کرے گا اور فکری لوازم کے سلسلہ کے ساتھ منتقل ہوگا یہ مظاہر اس کی خالقِ کائنات اور اسکی صفاتِ جلیلہ کی طرف رہنمائی کریں گے۔ان صفاتِ جلیلہ میں ایک صفت حکمت ہے جس علیم وحکیم ذات نے انسانوں کو ارادہ کی آزادی عطا فرما کر پیدا فرمایا جس میں وہ خیر وشر، نیکی، احسان اور ظلم وزیادتی کی قدرت رکھتے ہیں عقلاً یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو عبث پیدا فرمایا ہو کہ اس آزادی کا ان سے امتحان نہ لیا جائے۔اور نہ یہ ممکن ہے کہ حساب اور جزاء کے لیے مقررہ دن میں ان کا حساب نہ لے اور انسان ویسے ہی بے کار چھوڑ دیے جائیں۔

(۴) قرآنی قسموں میں چوتھی غرض قسم اٹھانے والے کے نزدیک مقسم بہ کے مرتبہ کی بلندی کا بیان اور اظہار کرنا ہوتا ہے نیز یہ معلوم کروایا جاتا ہے کہ مقسم بہ بڑا پیارا اور

محبوب ہے اور اللہ تعالیٰ کے خواص اور مقربین میں سے عالیشان مرتبے والا ہے۔ اور مقسم بہ کی تعریف کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا سورت الحجر میں اپنے رسول ﷺ کو مخاطب ہوکر ﴿لَعَمْرُکَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ فرمانا

''تیری زندگی کی قسم بلاشبہ وہ اپنے نشہ میں حیران پھرتے ہیں۔''

(۵) قرانی قسموں میں پانچویں غرض رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا اور آپ ﷺ کے محبوب ہونے کو بیان کرنا ہوتا ہے اور دشمنانِ اسلام آپ ﷺ کے متعلق جو افواہیں پھیلاتے ہیں ان کی تردید کرنا مقصود ہوتا ہے سورت الضحیٰ میں آنے والی قسم میں یہ غرض نمایاں ہے۔ دو تین راتیں آپ ﷺ بیمار ہوگئے وحی کی آمد میں تاخیر ہوئی تو دشمنوں نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد کے رب نے اس کو چھوڑ دیا ہے، اس سے ناراض ہوگیا ہے تو اللہ عزوجل نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالضُّحٰیo وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰیo مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰیo وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی o وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰیo﴾

مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مابین مناسبت

قسموں میں مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت معلوم کرنی ضروری ہے خصوصاً جب اللہ تعالیٰ اپنے مظاہرِ کائنات کی قسمیں اٹھائیں تو ضروری ہے کہ مناسبت معلوم کی جائے تاکہ قسم کھانے سے جو مقصود ہے اس کا اثبات ہو سکے غور و فکر کر کے دونوں کے درمیان جو نہایت عمدہ ربط و ضبط ہے اس کو معلوم کیا جائے کہ وہ کسی حکیمانہ مناسبت پر قائم ہے۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت معلوم ہونے پر اقسام قرآنی اپنے پورے جلال و عظمت کے ساتھ ذہن انسانی پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ دونوں کے درمیان مناسبت

کبھی تو نمایاں ہوتی اور کبھی مخفی جسے معلوم کرنے کے لیے ذہن رسا کی ضرورت ہوتی ہے۔

مناسبت کی بعض امثلہ

(۱) ترتیب نزول کے لحاظ سے سب سے پہلی قسم قرآن مجید میں سورت القلم میں آئی ہے ارشاد فرمایا:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝﴾

مقسم به والقلم وما يسطرون ہے اور مقسم علیه ما انت بنعمة ربك بمجنون ہے ان کے مابین مناسبت کی وضاحت عبدالرحمٰن حسن قوائد التدبر الامثل میں یوں بیان کرتے ہیں:

قران مجید لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور انسانی صحیفوں میں اس کا لکھا جانا مطلوب ہے تا کہ یہ تحریف وتغیر سے محفوظ ہو جائے اور انسان اس کو پڑھیں جو انسانوں کے لیے ہدایت اور نور ہے حق و باطل میں تفریق کرتا ہے اور ان کو رب العزت کے سیدھے راستہ کی راہنمائی کرتا ہے۔

قلم اور اس کے ساتھ انسان جو لکھتے ہیں ان کی قسم اٹھانا دلالتِ لزومیہ پر مشتمل ہے فکرِ انسانی لزومِ ذہنی کے راستہ سے منتقل ہوتی ہے اور یہ دلالتِ لزومیہ قرآن کے جھٹلانے والوں کو کہتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے قرآن مجید اور انسانی تحریروں کا موازنہ کر کے دیکھو تو تمہیں ثابت ہو جائے گا کہ انسانی کلام ایک سورت کا بھی مقابلہ نہیں کر پاتا تو لازم آیا کہ قران حکیم انسانی کلام نہیں ہے اور نہ ہی یہ رسول ﷺ کا بنایا ہوا کلام ہے بلکہ وہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اس کو یہ لازم آیا کہ محمد ﷺ مجنون نہیں ہیں اور نہ دیوانے ہیں آپ ﷺ قرآن کریم جیسی نعمت عظمیٰ لے کر آئے جسے اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل فرمایا اور لوگوں تک پہنچانے کے لیے آپ ﷺ کا انتخاب

فرمایا۔خود فتنے میں پڑے ہوئے لوگ آپ ﷺ کو کس طرح مجنوں کہہ رہے ہیں؟ آپ ﷺ تو اپنے رب تعالیٰ کا کلام ان تک پہنچا رہے ہیں اے جھٹلانے والو! تمہارے لیے کسی طرح بھی درست نہیں کہ تم اپنے رسول پر جنون کی تہمت رکھو۔ وہ تو یہ عظیم المرتبت کتاب رب العالمین کی طرف سے پہنچانے والے ہیں۔غور وفکر ان لوازم مذکورہ کا تقاضا کرتا ہے جن کے ذریعہ مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مکمل مناسبت ظاہر ہوتی ہے اور ایسی دلیل سامنے آتی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ قرآن مجید رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرنے والے بالکل جھوٹے اور مفتری ہیں اور پاگلوں اور بے وقوفوں کی طرح بک بک کرتے ہیں جو خود ان کے مجنون اور پاگل ہونے کی علامت ہے۔

(۲) قران کریم میں ترتیب نزول کے لحاظ سے پانچویں قسم سورت الفجر میں ہے ارشاد فرمایا:

﴿وَالْفَجْرِo وَلَيَالٍ عَشْرٍo وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِo وَاللَّيْلِ اِذَا يَسْرِo هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍo اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍo اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِo الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِo وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِo وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ oالَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِo فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَo فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍo اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِo﴾

’’قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب وہ چلنے لگے کیا ان میں عقلمندوں کے واسطے قسم ہے؟ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے عادیوں کے ساتھ کیا کیا؟ ستونوں والے ارم کے ساتھ جس کی مانند (کوئی قوم) ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی اور ثمودیوں کے ساتھ جنہوں نے وادی میں بڑے بڑے پتھر تراشے تھے۔اور فرعون کے ساتھ جو میخوں والا تھا ان سب

نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا اور بہت فساد مچایا تھا آخر تیرے رب نے ان سب پر عتاب کا کوڑا برسایا یقیناً تیرا رب گھات میں ہے۔''

عبدالرحمٰن حسن اس قسم میں مناسبت یوں واضح کرتے ہیں کہ:۔

﴿وَالْفَجْرِ ٥ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ٥ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ٥ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ٥﴾

مقسم بہ ہے اسکے بعد اللہ عزوجل نے عادیوں، ثمودیوں اور فرعون اور اس کے لشکروں کے تباہ و برباد کرنے کی طرف توجہ دلائی کیونکہ وہ بہت سرکش ہو گئے تھے اور شہروں میں بہت فساد مچا رکھا تھا۔ اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مقسم علیہ ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ کا ذکر فرمایا کہ جس طرح ان مذکورہ اقوام کو ہلاک کیا گیا رب العزت آج بھی ان جیسوں کی ہلاکت کی گھات میں ہے یہ اس کی سنت اور طریقہ ہے اس سورت میں جن ہلاک ہونے والی قوموں کا ذکر ہوا ہے ان کی ہلاکت کے اوقات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوقات وہی تھے جن کی اللہ عزوجل نے اس سورت میں قسمیں کھائی ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمودیوں کو فجر کے وقت سخت چیخ کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ سورۃ الحجر آیت ۸۳۔۸۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو محرم الحرام کی ابتدائی دس راتوں میں لے کر صحرائے سینا کی طرف نکلے اور فرعون اپنے لشکروں سمیت غرق ہو گیا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دی جو اس کے دوست اور ولی تھے وہ دسویں محرم تھی۔ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عادیوں کو تباہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فجر کے وقت بہت تیز ٹھنڈی ہوا چلائی جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلی جس سے وہ تباہ و برباد ہوئے آٹھ دن جفت اور سات راتیں تاک چلی آٹھویں دن شام کے وقت ہوا رکی تھی۔

سورت الفجر میں ان اوقات کی قسم اصل میں ان وقتوں میں پیش آنے والے واقعات کی قسم ہے جن میں سابقہ اقوام تباہ ہوئیں تو مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت واضح ہو جاتی ہے۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان نہایت عمدہ مناسبت کی ایک مثال سورت العصر میں ہے ارشاد فرمایا:۔

﴿وَالْعَصْرِ ٥ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ٥ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ٥﴾

''قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور آپس میں حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔''

عبدالرحمٰن حسن یوں مناسبت نمایاں کرتے ہیں: کہ جب ہم مقسم بہ اور مقسم علیہ پر غور کرتے ہیں تو مناسبت بالکل ظاہر نظر آتی ہے کیونکہ دنیا کی زندگی میں انسان کا اصل مال دو چیزیں ہیں ایک عمر اور دوسرا اس کا استعمال۔ انسانی عمر ہر لحظہ کم ہوتی جا رہی ہے زندگی کو جو انسان اپنی آخرت بنانے میں صرف کرے گا خسارے سے بچ جائے گا ورنہ زمانہ شاہد ہے ۔وہ سب انسان خسارہ ہی اٹھاتے ہیں جو اس کو صحیح استعمال نہیں کرتے۔ ❶

قسموں کے مخاطب اور ان کے احوال

قرآنی قسموں میں غور وفکر اس پہلو سے بھی ضروری ہے کہ قسم کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ جب مقسم بہ مظاہرِ کائنات جو اللہ تعالیٰ کی صفت خلق کے آثار ہیں اور اس کی کامل قدرت اور عظیم حکمت اور وسیع وعریض محیط علم کے مظاہر ہیں تو خطاب کے مقصودِ اول غیر مسلم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہی کو اس کی ضرورت ہے کہ انکی فکر کو خدائی آثار کی طرف متوجہ کیا جائے تا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، الوہیت اور اس کے لوازم کے ساتھ ایمان لانے پر آمادہ کیا جائے اور جس وقت مقسم بہ فلا وربک یا فوربک یا لعمرک کی مثل ہو تو خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہوتا ہے تبعاً مومنوں اور کبھی کبھی تعریضاً کفار کو خطاب ہوتا

❶ قواعد التدبر ۱۹/۱

ہے۔جب مقسم بہ ورب السماء والارض یا رب المشآرق والمغارب کی مثل ہوتو اولاً مومن مخاطب ہوتے ہیں تبعاً دوسرے لوگ بھی مخاطب ہوتے ہیں۔❶

نیز قرآنی قسموں کے مخاطبوں کے مختلف احوال پر غور وفکر ضروری ہے۔کبھی مخاطب کی حالت قسم کھانے کا تقاضا کرتی ہے اور کبھی قسم کی ضرورت نہیں ہوتی کبھی حالِ مخاطب ایک ہی وقت میں ایک پہلو سے قسم کھانے کا متقاضی ہوتا ہے اور دوسرے پہلو سے قسم کا تقاضہ نہیں کرتا۔قرآن مجید میں ان دونوں متعارض تقاضوں کا اکھٹا لحاظ کر کے عجیب حل پیش کیا گیا ہے وہ یوں کہ قسم لائی گئی اور اس کے شروع میں حرفِ نفی لا کو لے آئے یہ قرآن مجید کا بالکل نیا اسلوب ہے۔

قرآن مجید کی سات سورتوں میں آٹھ مرتبہ لا اقسم کے صیغہ کے ساتھ قسم اٹھائی گئی ہے کبھی لا سے پہلے حرف عطف لائے اور کبھی نہیں لائے (۱)سورت التکویر فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس (۲)سورت القیامہ لا اقسم بیوم القیامۃ ولا اقسم بالنفس اللوامۃ (۳)سورت البلد لا اقسم بھذا البلد(۴) سورت الواقعہ فلا اقسم بمواقع النجوم(۵)سورت الحاقہ فلا اقسم بماتبصرون وما لا تبصرون(۶) سورت المعارج فلا اقسم برب المشارق والمغارب انا لقادرون (۷) سورت الانشقاق فلا اقسم بالشفق والیل وما وسق۔

قسم سے پہلے آنے والے حرفِ نفی کے بارے مفسرین کے مختلف اقوال ہیں (۱)لا زائدہ ہے(۲)لا کلام مقدر کی نفی کرنے کے لیے ہے حرف نفی قسم پر مسلط نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی قسموں کی تعداد اور چند نمونے

اللہ عزوجل نے جس طرح قرآن مجید میں بکثرت قسمیں کھائی ہیں اسی طرح

❶ قواعد التدبر

رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے ارشادات عالیہ میں قسموں کا بکثرت استعمال فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کے فرمودات عالیہ میں قسم کے ذریعہ بہت تاکیداور جاذبیت، کشش، دل نشینی اورزوروا ثر پیدا کیا گیا ہے۔ اس اسلوب کی وجہ سے آپ کے حکموں کی عظمت' بلندی' قوتِ اثر' دل نشینی' شیرینی اور دل کشی اضعافاً مضاعفہ ہوگئی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ امام ابن قیم رحمہ اللہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں وقد حفظ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحلف فی اکثر من ثمانین موضعا ❶

تقریباً اسی (۸۰) مقامات میں آپ ﷺ نے اپنی دی ہوئی خبروں کی حقانیت پر قسمیں کھائی ہیں جو صحیح اور مسند حدیثوں میں موجود ہیں۔ صحیح بخاری شریف سے رسول اللہ ﷺ کی قسموں کے استعمال کی بعض مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ قسم کے اسلوب نے کلام نبوی کو کس قدر جاندار' بلیغ اور مہتم بالشان بنادیا ہے۔

(۱) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے چوری کی حد کی بابت سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((والذی نفس بیدہ لو فاطمة فعلت ذلك لقطعت یدھا))

(صحیح بخاری کتاب الحدود جلد ۲ صفحہ ۱۰۰۳)

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بھی اس حرکت کی مرتکب ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔ قسم کی تعبیر اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ذکر نے کلام میں بلاغت کی روح پھونک دی اور وہ بہت مؤثر' زوردار اور دل کو چھونے والی ہوگئی ہے۔

(۲) آپ ﷺ نے جماعت کی اہمیت بڑے بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان فرمائی جس کی لطافت' اثر انگیزی اور دل نشینی کو قسم کے اسلوب نے بہت بڑھادیا ہے۔

((والذی نفسی بیدہ لقد هممت ان آمر بحطب لیحطب ثم آمر بالصلوۃ فیؤذن لها ثم آمر رجلا فیؤم الناس ثم اخالف الی رجال

---

❶ فتح الباری جلد ۵ ص ۴۲۱

فاحرق علیھم بیوتھم والذی نفسی بیدہ لو یعلم احدھم انه یجد عرقا سمینا او مرماتین حسنتین لشھد العشآء))

(صحیح بخاری کتاب الصلوۃ جلداول صفحہ۸۹)

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مجھے خیال ہوتا ہے کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں پھر نماز کے لیے اذان کا حکم دوں اور کسی شخص کو لوگوں کو نماز پڑھانے کا حکم دوں اور خود ان لوگوں کے پاس جاؤں جو جماعت میں نہیں آتے تو ان کے گھروں میں آگ لگادوں اللہ تعالیٰ کی قسم اگر ان میں سے کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی فربہ ہڈی یا دو عمدہ گوشت والی ہڈیاں پائے گا تو وہ عشاء کی نماز میں ضرور آئے گا۔

اس میں جماعت کا اہتمام نہ کرنے پر کتنی سخت وعید کی گئی ہے۔ یہ پورا کلام بلاغت' زور بیان اور حسن تعبیر کا دلکش نمونہ ہے اور قسم کے اسلوب نے اس میں جو جان اور روح پیدا کی گئی ہے وہ حدِ بیان سے باہر ہے۔

(۳) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:۔

((والذی نفسی بیدہ لان یأخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظھرہ خیر له من یاتی رجلافیساله اعطاہ او منعه))

(صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلداول صفحہ۱۹۹)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم سے کوئی شخص رسی لے کر اپنی پیٹھ پر لکڑی لائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرے اور وہ اس کو دے یا نہ دے۔''

گداگری کی مذمت جس بلیغ و مؤثر پیرائے میں کی گئی ہے وہ خود بڑا خوبصورت انداز بیان تھا لیکن قسم کے استعمال نے اس میں جادو جیسا اثر پیدا کر دیا ہے۔

(۴) روزے دار کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((والذی نفس محمد بیده لخلوف فم الصائم اطیب عند الله من ریح المسك))

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی خوشبو سے زیادہ بہتر ہے۔

کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ نے قسم کے اسلوب میں مزید زور اور تاکید پیدا کرنے کے لیے اس کو مکرر بھی استعمال فرمایا ہے:۔

((مثلا والله لا یومن والله لا یؤمن والله لا یئومن قیل ومن یا رسول الله قال الذی لا یامن جاره بوائقه))

(کتاب الادب صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۸۸۹)

اللہ تعالیٰ کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا اللہ تعالیٰ کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا اللہ تعالیٰ کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول کون؟ فرمایا جس کا پڑوسی اس کی اذیتوں سے مامون نہ ہو۔“

ابن قیم رحمہ اللہ اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں:۔

صحابہ رضوان علیہم اجمعین بھی اپنے فتووں اور روایتوں پر قسمیں کھایا کرتے تھے امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے بعض جوابوں میں قسم کھائی ہے امام احمد نے بہت سارے فتوے قسمیہ دیے ہیں یہ صرف ان کی تحقیق اور تاکید اور اپنے خیال کی پختگی کے بیان کے لیے ہوتی تھیں نہ یہ کہ مدارِ ثبوت ان قسموں پر ہوتا۔ مفتی اور مناظر کو اپنی تحقیق پر قسم کھانی بھی جائز ہے گو اس کی قسم سائل اور مناظر کے نزدیک موجب ثبوت نہ بھی ہو یہ صرف اس لیے ہے کہ مقابل کو معلوم ہو جائے کہ یہ پختگی کے ساتھ ثبوت پر ہے خود اسے اس کی حقانیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

جن سورتوں میں اللہ تعالیٰ کی ظاہر قسمیں آئی ہیں

قرآن مجید میں آنے والی اللہ تعالیٰ کی ظاہر قسمیں ہی اقسام القرآن میں زیر بحث لائی جائیں گی ان شاء اللہ العزیز۔ جنہیں ترتیب تلاوت کے لحاظ سے سورتوں کے تحت درج کیا جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں میں سے صرف چھتیس (۳۶) سورتوں میں اکتالیس (۴۱) ظاہر قسمیں آئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے اور اسی ترتیب سے تفصیل بیان ہوگی۔

(۱) النسآء (۲) یونس (۳) الحجر (۴) النحل (۵) مریم (۶) سبا (۷) یس (۸) الصافات (۹) صٓ (۱۰) الزخرف (۱۱) الدخان (۱۲) ق (۱۳) الذاریات (۱۴) الطور (۱۵) النجم (۱۶) الواقعہ (۱۷) التغابن (۱۸) القلم (۱۹) الحاقہ (۲۰) المعارج (۲۱) المدثر (۲۲) القیامۃ (۲۳) المرسلات (۲۴) النازعات (۲۵) التکویر (۲۶) الانشقاق (۲۷) البروج (۲۸) الطارق (۲۹) الفجر (۳۰) البلد (۳۱) الشمس (۳۲) اللیل (۳۳) الضحی (۳۴) التین (۳۵) العادیات (۳۶) العصر

سورت الذاریات میں تین اور الحجر اور النحل اور الطارق میں دو دو اور باقی بتیس (۳۲) سورتوں میں صرف ایک ایک قسم آئی ہے اور اٹھتر (۷۸) سورتوں میں اللہ تعالیٰ کی کوئی ظاہر قسم نہیں آئی ہے۔

زیادہ قسمیں مکی سورتوں میں آئی ہیں جن کی تعداد چونتیس (۳۴) ہے مدنی صرف دو سورتوں النساء اور التغابن میں قسمیں آئی ہیں۔ ان سورتوں میں سے جو ابتدائی زمانہ رسالت میں نازل ہوئیں ان کے شروع میں مظاہرِ کائنات کی قسمیں زیادہ آئی ہیں۔ سورتوں کے درمیان میں قسموں کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔

قسمِ مضمر

قسمِ مضمر جس میں فعل قسم اور مقسم بہ کی صراحت نہ ہو صرف جواب قسم پر آنے والی لام مؤکدہ اس پر دلالت کرے قرآن مجید کی بہت سی آیات میں نحوی اور مفسر حضرات قسم کو مضمر اور مقدر مان لیتے ہیں۔ جب کہ آیتِ کریمہ میں قسم کے لوازم میں سے کوئی پایا جائے۔ دکتور ابرہیم السامرائی فرماتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ جہاں آیت میں لوازمِ قسم میں سے کوئی لازم آئے تو ضرور قسم کو مضمر مان لیں کئی آیات ہیں جن میں لوازمِ قسم میں سے کوئی آیا ہے لیکن وہاں قسم مقدر کئے بغیر بھی تاکید مراد لی گئی ہے۔ تاکید خود ایک اسلوبِ بیان ہے کبھی تاکید قسم کے بغیر بھی آتی ہے۔ ❶

دکتور عبد الفتاح احمد الحموز نے التاویل النحوی فی القرآن الکریم الجزء الاول میں قسم مضمر یعنی جملہ قسم کو حذف کرنے کی بحث میں ذکر کیا ہے کہ قرآن مجید میں جملہ قسم کو اکثر حذف کر دیا جاتا ہے جب جواب قسم میں لقد آئے تو بہت سے نحوی اور مفسر قسم کو مقدر اور مضمر مان لیتے ہیں مثلاً سورت المائدہ آیت ۱۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَائِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا﴾

قرآن مجید میں وہ مقامات جہاں لقد کے آنے پر قسمیں مقدر مانی جاتی ہیں بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً البقرۃ ۶۵، ۹۲، ۹۹، ۱۰۲ آل عمران ۱۳، ۱۶۷، ۱۸۱ المائدہ ۱۲، ۱۷، ۳۲، ۷۰۔

فعل مضارع پر لام تاکید اور نون ثقیلہ یا خفیفہ آئے تو بھی قسم مقدر مان لیتے ہیں مثلاً البقرۃ ۹۶، ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾

لام موطہ للقسم جب آئے تو قران مجید میں قسم کا حذف کرنا عام ہے مثلاً البقرۃ

❶ اسالیب القرآن الدکتور ابراھیم السامرائی

۱۴۵"ولئن اتيت الذين اوتوا لكتاب بكل آيات ما تبعوا قبلتك ....اصل میں
و الله لئن .... ہے۔"

دیگر آیات میں بھی قسم کو مقدر کر لیتے ہیں جب لوازم قسم میں سے کوئی پایا جائے۔

عربی تفاسیر میں عموماً مقدر قسموں کو ظاہر کیا جاتا ہے۔اور اردو ترجمہ میں بعض حضرات اس کو ظاہر کر دیتے ہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی قسموں کے علاوہ انبیاء علیہم السلام' شیطان' منافقین وغیرہم کی قسمیں بھی آئی ہیں۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ کے بارے جب متعدد اقوال ہوں گے تو احقر کے نزدیک جو قول عام فہم اور قرینِ صواب ہو گا صرف وہی ذکر کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کتاب کی تالیف سے بنیادی مقصد عقائد کو ذہن نشین کرانا ہے۔ یعنی توحید، رسالت، آخرت اور قرآن مجید کی حقانیت اور انسانی احوال کے بارے آنے والی اقسام کو عام فہم انداز میں عوام الناس کے سامنے پیش کرنا ہے۔ کبھی کبھار دیگر اقوال کا بھی ذکر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

(۱) سورت النسآء

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

(آیت: ٦٥)

"پس نہیں تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں اور سر بسر تسلیم کرلیں۔"

اس آیت کریمہ میں وربک قسم ہے اور باقی ساری آیت جوابِ قسم ہے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری لازم اور ضروری ہے خود اللہ عز وجل نے اسی سورت النساء کی آیت ۸۰ میں ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾

"جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا تو ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔"

سورت النور میں فرمایا:

﴿وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَا أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ٥ وَإِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مُعْرِضُونَ ٥ وَإِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوٓا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ٥ أَفِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوٓا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَّحِيفَ

اللّٰہُ عَلَیۡهِمۡ وَرَسُوۡلُهٗ بَلۡ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝ اِنَّمَا كَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَخۡشَ اللّٰهَ وَيَتَّقۡهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ۝﴾

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے ایسے لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہیں۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ کی طرف تاکہ رسول اللہ ﷺ ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسول ﷺ کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا؟ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔ ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول اللہ ﷺ ان کے مقدمے کا فیصلہ کریں تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کریں۔ اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔''

ان آیات کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اور آپ ﷺ کا حکم اللہ عزوجل کا حکم ہے۔ رسول کی طرف بلایا جانا صرف رسول ہی کی طرف بلایا جانا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ دونوں ہی کی طرف بلایا جانا ہے۔ واضح رہے کہ یہ معاملہ صرف نبی ﷺ کی زندگی ہی کے لیے نہ تھا بلکہ آپ کے بعد جو بھی حکومت اسلامی کے منصبِ قضا پر ہو اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے مطابق فیصلے کرے

اس کی عدالت کا سمن دراصل اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی عدالت کا سمن ہے اور اس سے منہ موڑنے والا درحقیقت اس سے نہیں بلکہ اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ سے منہ موڑنے والا ہے۔ یہ آیات اس حقیقت کو صاف صاف کھول کر بیان کر رہی ہیں کہ شریعت الٰہی کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرنا اور کرانا عین لازمہ ایمان ہے جو شخص شریعت کی مفید مطلب باتوں کو خوشی سے لپک کر لے لے مگر جو کچھ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں اس کی اغراض و خواہشات کے خلاف ہو اسے رد کر دے اور اس کے مقابلے میں دنیا کے دوسرے قوانین کو ترجیح دے وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔ اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے کیونکہ وہ ایمان اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ پر نہیں اپنی اغراض اور خواہشات پر رکھتا ہے اس رویے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے کسی جزء کو اگر وہ مان بھی رہا ہے تو رب العزت کی نگاہ میں اس طرح کے ماننے کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ❶

سورت النور آیت۔ ٦٣ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

"رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔"

حدیث شریف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری فرمانبرداری کی اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ ❷

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری فرض کی ہے۔ اللہ عزوجل کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اسکی رسالت پر ایمان لے آئیں اور پھر

---

❶ تفہیم القرآن جلد سوم

❶ صحیح بخاری جلد٢ صفحہ١٠٥٧

اطاعت جس کی چاہیں کرتے رہیں۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے تمام قوانین چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے صرف انہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہ نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ یہ حکم رسول اللہ ﷺ کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ لائے ہیں اور جس طریقہ پر اللہ عزوجل کی ہدایت و رہنمائی کے تحت آپ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے لیے فیصلہ کن سند ہے اور اس کو سند ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔ کہ یہ حکم ہر فرد کو ہر حکم کے بارے میں ہے جس کی تائید اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ کرتا ہے۔ یہ حکم صرف ان لوگوں کے ساتھ خاص نہیں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ﴾ سے مراد ہیں۔ یعنی یہ حکم سببِ نزول کے ساتھ خاص نہیں۔ آپ کی زندگی میں تو یہ حکم تھا اور آپ کی موت کے بعد کتاب وسنت کو حاکم ٹھہرانا مراد ہے۔ نیز آئمہ اور قاضیوں میں سے جو کتاب وسنت کے مطابق حکم کرے اسے حاکم بنانا مراد ہے جب وہ آدمی کتاب وسنت میں یا کسی ایک میں دلیل کے پائے جانے کے ساتھ صرف رائے سے حکم نہ کرتا ہو اور کتاب وسنت کے دلائل سے جو اس کے خلاف ہوں وہ سمجھتا ہو۔ اس طرح کہ وہ عربی زبان اور اس کے متعلقات نحو، علم صرف، علم بیان، علم اصول کا جاننے والا ہو سنتِ مطہرہ کی اسے بصیرت ہو۔ صحیح اور ضعیف حدیثوں میں تمیز کرنے والا ہو کسی مذہب اور نظریے کے لیے متعصب نہ ہو۔ منصف، پرہیز گار ہو۔ اپنے حکم میں ظلم نہ کرے اور حق سے منحرف نہ ہو جس انسان کے اندر یہ مذکورہ چیزیں ہوں گی وہ نبوت کا ترجمان ہے احکامِ نبوت کا حاکم ہے اپنے فیصلے اس کی طرف لانے ضرور ہیں۔ [1]

[1] فتح القدیر

اس آیت کریمہ کے سببِ نزول کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت اس منافق اور یہودی کے بارے میں اتری ہے جن دونوں کے بارے میں ﴿اَلَم تَرَاِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ﴾ نازل ہوئی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ ایک منافق اور ایک یہودی کا جھگڑا ہوا منافق نے کہا آؤ کعب بن اشرف یہودی کی طرف چلیں اور یہودی نے کہا ہم نبی ﷺ کی طرف چلیں تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ فلا وربك لا يؤمنون آیت حضرت زبیر بن العوام اور ان کے مخالف انصاری کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جس کی تفصیل صحیح بخاری کتاب التفسیر میں اس طرح ہے کہ حضرت زبیر اور ایک انصاری میں حرہ کی ایک نالی پر جھگڑا ہوا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ زبیر رضی اللہ عنہ اپنے باغ کو پانی پلا لے پھر اپنے ہمسایہ کے باغ میں پانی دیدے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ آپ نے زبیر کے حق میں فیصلہ اس لیے دیا ہے کہ وہ آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے تو آپ ﷺ نے حکم دیا زبیر ایسا کر کہ اپنے باغ کو پانی پلا اور پانی کو روک رکھ جب تک مینڈوں تک نہ بھر جائے پھر پانی اپنے ہمسایہ کی طرف چھوڑ دے۔ آپ ﷺ کو انصاری نے غصہ دلایا تو آپ نے زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کا پورا حق دلایا۔ پہلے جو حکم آپ نے دیا تھا اس میں دونوں کی رعایت تھی۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیتیں فلا وربك لا يؤمنون اخیر تک اسی مقدمہ میں اتری ہیں۔

ابن جریر طبری پہلے قول کو درست ٹھہراتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان:۔

﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ﴾

انہی انسانوں کے بارے میں ہے جن کے بارے میں آیت الم ترالی الذین یزعمون انھم امنوا بما انزل الیك نازل ہوئی ہے یہ آیت بھی ان انسانوں کے قصے کے بیان میں آئی ہے اور ایسی کوئی دلیل نہیں جو ان کے قصے کے منقطع ہونے پر دلالت

کرے تو بعض آیات کو بعض کے ساتھ ملانا زیادہ بہتر ہے جب تک ایسی کوئی دلیل نہ آئے جو پہلی آیات سے تعلق کے انقطاع پر دلالت کرے۔ ❶

امام زمخشری کا خیال ہے کہ فلا وربک کا معنی فوربک ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان فوربك لنسئلنهم ہے اور لاقسم کے معنی کی تاکید کے لیے زیادہ کیا گیا ہے جس طرح وجوبِ علم کی تاکید کے لیے لئلا یعلم میں لا زائد کیا گیا ہے۔ ❷

امام ناصرالدین احمد بن محمد فرماتے ہیں میرے نزدیک ظاہر بات یہ ہے ویسے تو اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں کہ فلا وربك میں لا مقسم علیہ منفی لا یؤمنون کی تمہید اور ہموارگی اور توطئہ کے لیے آیا ہے۔ لہذا اس آیت کریمہ میں فلا وربک میں لا کو موطئہ بنانا متعین ہوگا قرآن پاک کے علاوہ مثبت قسم پر لا کا داخل ہونا نہیں پایا جاتا۔ لا کا اس قسم میں داخل ہونا زیادہ ہے جس کا جواب نفی ہو۔ ❸

التاویل النحوی فی القرآن الکریم کے مصنف فلا وربک لا یومنون کے لا کے بارے میں چار قول نقل کرتے ہیں:۔

(۱) پہلا لا اس کلام کی تردید کے لیے ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہے یعنی جو تم کہتے ہو صحیح نہیں یا معاملہ تمہارے خیال کے مطابق نہیں اس لا کے بعد والی کلام وربک لا یؤمنون نئی کلام ہے اور یہی بات ظاہر ہے۔

(۲) پہلا لا زائد ہے قسم سے پہلے نفی کے اہتمام کے لیے لایا گیا ہے پھر تاکید کے لیے لا یؤمنون میں دوبارہ لایا گیا ہے۔ (۳) لا یؤمنون میں لا زائدہ ہے۔

(۴) پہلا لا زائدہ ہو یہ زمخشری کا قول ہے اور ایک قول ہے کہ لا صرف اس وقت زائدہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے ماسوا کی صراحتاً قسم اٹھائی جائے اللہ تعالیٰ کی قسم کے ساتھ لا کا زائدہ

---

❶ تفسیر ابن جریر جلد۸صفحه۵۱۲ ❷ الکشاف جلد اول صفحه۵۳۸

❸ الانصاف فی ماتضمنه الکشاف من الاعتزال علی هاشیة الکشاف جلد اول صفحه۵۳۶

ہونا نہیں سنا گیا مگر جب جواب منفی ہو۔اور ابن ھشام نے ذکر کیا ہے کہ لا کا زائدہ ہونا لفظ اللہ کے ساتھ سنا گیا ہے۔ ❶

امام رازی فرماتے ہیں فلا پس نہیں کہہ کر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے خیال اور دعوے کی نفی فرمارہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی شریعت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے کے بعد اپنے نزاعات اور جھگڑوں کے فیصلے طاغوت کی طرف لے جاتے ہیں اور قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کروانا چاہتے ہیں فرمایا معاملہ ایسے نہیں جس طرح ان کا خیال ہے کہ زبانی قرآن وسنت کو ماننے کا دعویٰ کریں لیکن نہ تو اللہ کی کتاب کو اور نہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو آخری سند مانتے ہوں۔اور اللہ تعالیٰ نے نئے سرے سے وربک لا یؤمنون فرمایا کہ اے محمد ﷺ آپکے رب کی قسم یہ لوگ ایماندار نہیں ہوسکتے جب تک ان میں تین شرطیں نہ پائی جائیں۔

(۱)۔ حتی یحکموك فیما شجر بینهم جب تک اپنے باہمی اختلاف میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں رسول اللہ ﷺ کا حکم نہ ماننے والا مومن نہیں ہوسکتا۔

(۲)۔ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں تنگی نہ محسوس کریں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر دلی رضا کا ہونا ضروری ہے اور یہ یقین رکھنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کا فیصلہ ہی حق اور سچ ہے۔

(۳)۔ویسلموا تسلیما اور سر بسر تسلیم کر لیں اس سے معلوم ہوا کہ حکمِ رسول ﷺ پر قلبی رضا اور دلی یقین ہی کافی نہیں بلکہ ظاہر میں اسے تسلیم کرنا ضروری ہے۔

ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت سے باطنی انقیاد اور ویسلموا تسلیما فرمان سے ظاہر اطاعت وفرمانبرداری مراد ہے۔ ❷

اس آیت کریمہ میں واؤ حرف جارہ قسم کے لیے ہے اور ربک مقسم بہ ہے اور لا

---

❶ التاویل النحوی فی القرآن الکریم جلد دوم صفحہ ۱۳۸۰

❶ تفسیر الکبیر جلد ۱۰ صفحہ ۱۶۵

یومنون آخر آیت تک مقسم علیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے حقوق کے لیے اپنی ربوبیت کی قسم اٹھائی ہے کہ میں نے محمد ﷺ کی جس انداز سے تربیت کی ہے اور انہیں پروان چڑھایا ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کی امت اپنے تمام نزاعات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا مان کر جب تک دل و جان سے اس پر راضی نہ ہوں اور ظاہراً اسے تسلیم نہ کر لیں ایماندار نہیں ہیں۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام فتوی اور احکام میں معصوم ہیں اور قیاس کے ساتھ نص کی تخصیص جائز نہیں۔ ❶

علامہ رشید رضا مصری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت میں ثم کو اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ انسان کے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ جب اسے اپنی کامیابی کی امید میں ناکامی ہو اور مخالف کے خلاف جب فیصلہ نہ ہو تو انسان دلی طور پر تنگی اور درد محسوس کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اچانک صدمے کے وقت دل میں آنیوالی تنگی کو معاف فرمادیا اور ایمان کے لیے یہ شرط تراخی پر رکھی اور ثم کے ساتھ عطف ڈالا۔ کامل الایمان مومن کا سینہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے لیے شروع ہی سے کھل جاتا ہے کیونکہ اسے علم اور یقین محکم ہوتا ہے کہ حکمِ رسول ہی حق ہے اور اس کی بھلائی حکم رسول اللہ میں ہی ہے اور نیک بختی آپ ﷺ کے حکم کو مان لینے میں ہے۔ لیکن جب ایمان کے اندر کمزور ہو تو مرضی کے خلاف فیصلے کے فوراً بعد اس کے سینے میں تنگی ہوتی ہے انشراح نہیں ہوتا۔ پھر وہ اپنے نفس کو نصیحت کرتا ہے اور اپنے نفس کو ملامت کر کے حکمِ رسول پر مائل کرتا ہے حتیٰ کہ نورِ ایمان کے ذریعہ سے اس کا سینہ کھل جاتا ہے اور خواہشِ نفس پر حق کو ترجیح دیتا ہے جس کا آپ نے حکم دیا ہے۔ ❷

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذاتِ مقدسہ کے ساتھ قسم

---

❶ ایضا ❷ تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۲۳۷۔۲۳۶

اٹھائی ہے کہ وہ اس وقت تک مومن نہیں جب تک وہ اپنی تمام جھگڑوں میں اُس کے رسول کو حاکم نہ بنالیں اور حصول ایمان میں یہ کافی نہیں بلکہ آپ ﷺ کے فیصلے سے ان کے دلوں میں کوئی تنگی نہ رہے حتیٰ کہ راضی ہوں اور تسلیم کرلیں۔

(۱)۔ مقسم علیہ جملہ کو حرفِ نفی کے ساتھ شروع کیا جو مقسم علیہ کی نفی کی تاکید کو متضمن ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے جملہ مثبتہ کو اِنَّ کے ساتھ مؤکد کرتے ہیں۔

(۲)۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی قسم اٹھائی ہے۔

(۳)۔ مقسم علیہ کو فعل کے ایسے صیغہ کے ساتھ لائے جو صیغہ حدوث پر دلالت کرتا ہے یعنی جب تک آپ کو حاکم نہ بنائیں وہ مومن نہیں ہوسکتے۔

(۴)۔ غایت میں الی کی بجائے حتیٰ کو لائے جو یہ معلوم کرواتا ہے کہ آپ ﷺ کو حاکم بنانے کے بعد ہی ایمان کا وجود ہوگا کیونکہ حتیٰ کا مابعد اس کے ماقبل میں داخل ہوتا ہے۔

(۵)۔ جس چیز میں حاکم بنانا ہے اسے اسمِ موصول کی شکل میں لائے جو کہ عموم پر دلالت کرتا ہے اور وہ ہے اللہ سبحانہ کا فرمان فیما شجر بینھم یعنی چھوٹے اور بڑے تمام جھگڑوں میں۔

(۶)۔ انتفائے حرج کی قید یعنی آپ ﷺ کے حکم سے تنگی نہ محسوس کریں۔

(۷)۔ انتفائے حرج کو بھی سیاق نفی میں نکرہ کی شکل میں لائے۔ (حرجاً) یعنی تنگی کی کوئی بھی صورت نہ پائیں۔

(۸)۔ آپ ﷺ کے فیصلے کو ذکر کرتے ہوئے صیغہ عموم لائے مما قضیت میں ما۔ یہ ما یا تو مصدریہ ہے یعنی من قضائک کے معنی میں آپ کے فیصلہ کرنے سے یا یہ موصولہ ہے یعنی اس چیز سے جو آپ نے فیصلہ فرمایا اور عموم کا یہ صیغہ آپ ﷺ کے فیصلہ جات میں ہر ہر فرد کو شامل ہے۔

(۹)۔ اللہ عزوجل نے ان مذکورہ چیزوں کے ساتھ اکتفا نہیں فرمایا حتیٰ کہ اس کے ساتھ تسلیم کا اضافہ فرمایا اور یہ تحکیم اور انتفائے حرج سے زائد چیز ہے کیونکہ ہر حکم جس سے حرج کی نفی

ہو ضروری نہیں کہ وہ تسلیم بھی ہو کیونکہ تسلیم میں آپ ﷺ کے حکم پر راضی ہونا اور اس کے مطیع ہونا داخل ہے۔

(۱۰)۔ اللہ تعالیٰ نے فعلِ یسلموا کو مصدر تسلیماً سے مؤکد کیا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہم جہمیہ کو اس اللہ تعالی کا واسطہ دیتے ہیں جس کے علاوہ کوئی الہ نہیں کیا وہ نصوص کے سامنے اپنے نفسوں میں یہ تسلیم اور فرمانبرداری اور تحکیم پاتے ہیں؟ اور کیا رسول اللہ ﷺ اور آپ کے لائے ہوئے دین کے ساتھ ان کا رویہ یہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کی قسم بے شک ان کے دل اور زبانیں اور ان کی کتابیں ان کے خلاف اس کے ضد کی شہادت دیتی ہیں جیسے مومن اور فرشتے اہل علم اور اللہ تعالیٰ ان کے خلاف شہادت دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ شہادت کے لیے کافی ہے۔ ❶

نیز ابن قیم فرماتے ہیں: کہ آپ کو قسم کے اس انداز سے معلوم ہوگا کہ رب تبارک وتعالیٰ نے اکثر مخلوق کے ایمان نہ رکھنے پر قسم اٹھائی ہے اور امتحان کے وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ کیا یہ تین چیزیں (تحکیمِ رسول انتفائے حرج اور تسلیم) اکثر لوگوں کے دلوں میں موجود ہیں یا نہیں؟ جو اسلام کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ❷

شرح عقیدہ الطحاویہ میں ہے کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی تمام باتوں کو مکمل طور پر تسلیم کریں آپ ﷺ کے حکم کے سامنے سر جھکائیں آپ کی احادیث کی تصدیق کریں کسی باطل خیال، عقل، شک، شبہ کے ساتھ ان کا معارضہ نہ کریں ہم اس وقت تک نجات حاصل نہیں کر سکتے جب تک آپ کی اطاعت نہ کریں اور نہ آپ کے غیر کی جانب فیصلہ لے جائیں اور نہ اس کے فیصلے کو تسلیم کریں اور آپ کے حکم کے نفاذ میں توقف نہ کریں آپ کے حکم کو کسی امام، شیخ کے قول پر پیش نہ کریں۔ بس ایک مسلمان کا یہی حال ہو کہ جب اسے صحیح حدیث کا علم ہو جائے تو یوں سمجھے کہ وہ اس حدیث کو رسول

---

❶ بدائع التفاسیر جلد دوم صفحہ ۳۲۔۳۳ بحوالہ الصواعق المرسلہ ج ٤

❷ التبیان فی اقسام القرآن صفحہ ٤٣١

اللہ ﷺ سے خود سن رہا ہے کیا کسی انسان کے لیے یہ بات زیب دیتی ہے اور کیا اس کا جواز ہے کہ وہ حدیث رسول کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے رکے کہ یہ امام صاحب کی رائے کے خلاف ہے۔ائمہ کرام کی آراء کو حدیثِ رسول کے سامنے چھوڑ دے۔نص کے مقابلہ میں قیاس کا معارضہ نہ کرے۔تمام قیاسات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نصوصِ سنت کے ساتھ وابستگی اختیار کرے۔کسی قسم کی تحریف کا ارتکاب نہ کرے نہ ہی الفاظ کو ان کے حقیقی معنی سے تبدیل کر کے عقل کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے سنت کے مقابلہ میں عقل مجہول ہے بلکہ راہ صواب سے دور ہے رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور سنت کو بہر حال قبول کیا جائے خواہ کسی کی موافقت ہوتی ہو یا نہ، کسی کا خیال نہ کیا جائے۔ ❶

خود ائمہ کرام اس کی تاکید کرتے تھے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں" اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔"جو صحیح حدیث میں ہو وہی میرا مذہب ہے۔

((اذا قلت قولا یخالف کتاب اللہ وخبر الرسول ﷺ فاترکوا قولی))

"جب میں کوئی ایسی بات کہوں جو قرآن اور حدیث کے خلاف ہو تو میری بات کو چھوڑ دینا۔"

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

((انما انا بشر أخطی واصیب فانظروا فی رایی فکل ما وافق الکتاب والسنة فخذوہ وکل مالم یوافق الکتاب والسنة فاترکوہ))

"میں انسان ہی ہوں مجھ سے خطا اور صواب دونوں کا امکان ہے اس لئے تم میری رائے اور فتویٰ میں غور وتامل سے کام لو جو قرآن وحدیث کے مطابق ہو اسے قبول کرلو اور جو قرآن وحدیث کے مطابق نہ ہو اسے ترک کردو۔"

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

((اجمع المسلمون علی ان من استبان لہ سنة عن رسول اللہ ﷺ لم

❶ شرح عقیدة الطحاویہ ص۲۱۷

یحل له ان یدعها لقول احد))

''تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جسے رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث مل جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ حدیث کو چھوڑ کر کسی اور کے قول پر عمل کرے۔'' اور نیز فرماتے ہیں اذا وجدتم فی کتابی خلاف سنة رسول الله ﷺ فقولوا بسنة رسول الله ﷺ ودعوا ما قلت۔

''جب تمہیں میری کتاب میں حدیث کے خلاف کوئی بات ملے تو تم حدیث کو لو اور میری بات کو ترک کردو۔'' نیز فرماتے ہیں کل ما قلت فکان عن النبی خلاف قولی مما یصح فحدیث النبی اولی فلا تقلدو نی۔

''میرا قول جو بھی ہو لیکن نبی ﷺ سے اس کے خلاف ثابت ہو تو اس صورت میں حدیث واجب الاتباع ہوگی اور میری تقلید کرنا ناروا ہوگا۔ [1]

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں من رد حدیث رسول الله فهو علی شفا هلکة جس نے نبی ﷺ کی حدیث ٹھکرا دی وہ ہلاکت کے دہانے پر ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اور اجماع امت سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت فرض کی ہے اور کسی معین انسان کی اطاعت امت پر واجب نہیں کی ہے۔ کہ وہ جو بھی حکم دے اور منع کرے امت ضروری طور پر ایسا کرے۔ صرف اپنے رسول کی اطاعت فرض کی ہے حتیٰ کہ اس کے صدیق اور نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل فرماتے ہیں کہ میری اطاعت اس وقت تک کرنا جب تک میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا رہوں اور جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت کرنا ضروری نہیں ہے۔ امت کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر حکم اور نہی میں کوئی بھی معصوم نہیں۔ اسی لئے کئی ائمہ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر کسی کی بات چھوڑی بھی جا سکتی ہے اور لی بھی جا سکتی ہے اور ائمہ

[1] مقدمہ صفة صلوة النبی للالبانی

اربعہ نے لوگوں کو اپنے ہر ایک فتویٰ میں تقلید کرنے سے منع فرمایا۔ ❶

امام قاسمی زیر تفسیر آیتِ قسم کی تفسیر کے تحت پانچویں تنبیہہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ جان لیں کہ ہر حدیث جو رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہو اس طرح کہ اس کو صحیح حدیثوں کے جمع کرنے والوں نے روایت کیا ہو یا اس حدیث کو کسی امامِ حدیث نے صحیح قرار دیا ہو جن ائمہ کی طرف تصحیحِ حدیث میں رجوع کیا جاتا ہے۔ آیت کریمہ مما قضیت اس کو بھی شامل ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھنے والے ہر ایک مومن پر اس حدیث کو ظاہراً و باطناً لینا اور قبول کرنا ضروری ہے۔ ورنہ اگر کوئی آپ کی حدیث کی تردید یا ظاہر حدیث کے خلاف تاویل کو تلاش کرے اپنے مذہب کی خاطر جس کا وہ مقلد ہے اور مذہبی تعصب کی خاطر جس پر اس کی تربیت ہوئی۔ جس طرح حدیث اور اہل حدیث کے دشمن مقلدین کی حالت ہے تو وہ بھی اس سخت وعید میں داخل ہوگا جو اس آیت میں مذکور ہے جس وعید کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل کانپ جاتے ہیں۔ ❷

(۲) سورت یونس

﴿وَيَسْتَنْبِئُونَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ وَمَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ﴾ آیت ۵۳

”اور آپ سے پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو میرے رب کی قسم یہ بالکل سچ ہے اور تم عاجز نہیں کر سکتے۔“

اس آیت کریمہ میں پہلا موقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول مقبول ﷺ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ ﷺ بعث بعد الموت اور قیامت کے برحق ہونے پر اپنے رب تبارک و

❶ مقدمہ صفة صلوة النبی للالبانی

❷ تفسیر قاسمی جلد ۳ صفحہ ۲۱۱

تعالیٰ کی قسم اٹھائیں آیت کریمہ میں واو حرف قسم ہے ربی مقسم بہ ہے اور انه لحق وما انتم بمعجزین مقسم علیہ ہے

أحق ھو میں ضمیر ھو سے مراد بعث الموت اور قیامت ہے یا عذاب مراد ہے۔ ❶

حرفِ استفہام أ انکار واستہزاء کے طور پر ہے اور ضمیر ھو سے مراد زمخشری کے نزدیک عذابِ موعود ہے۔ ❷

ابن کثیر رحمہ اللہ کے نزدیک بھی ھو سے مراد بعث بعد الموت اور قیامت مراد ہے۔اسی حرف ایجاب نعم جی ہاں کے معنی میں ہے اثبات کے موقعہ میں تاکید و تحقیق کے مفہوم میں آتا ہے جیسے اردو میں زور دینے کے موقعہ پر ہاں ہاں (مکرر) آتا ہے اور یہ حرف ای صرف قسم سے پہلے آتا ہے سوال کرنے والوں کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر صرف سادہ جواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قسم کے ساتھ جواب کو مؤکد کیا اور اس کے شروع میں حرف ایجاب ای کو لا کر مزید پختگی پیدا فرمائی۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو تین آیات میں جزا اور آخرت پر قسم اٹھانے کا حکم دیا ہے۔(یونس۔۵۳۔السباء۔۳۔التغابن۔۷) یہ اس لئے کہ عوام الناس کو آخرت کا علم صرف نبیوں کے بتانے سے ہوتا ہے اگر چہ بعض لوگ غور وفکر سے بھی آخرت کو معلوم کر لیتے ہیں۔نیز فرماتے ہیں:۔کہ جس طرح نبوت' قرآن' آخرت پر خود اللہ تعالیٰ نے قسمیں اٹھائی ہیں اسی طرح صرف تین مقامات پر اپنے نبی ﷺ کو قسمیں اٹھانے کا حکم فرمایا ہے۔جو تمام مخلوق سے سچے ہیں اور جس چیز پر قسم اٹھوائی ہے اس کے ثبوت پر قطعی دلائل قائم فرمائے لیکن ظالم انکار و تکذیب پر اڑے رہے۔ ❸

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ

❶ جامع البیان جلد ۱ صفحہ ۳۰۱ ❷ الکشاف جلد ۲ صفحہ ۱۹۳

❸ التبیان فی اقسام القرآن

الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝﴾

(السبا ۳.۴.۵)

''اور کفار نے کہا کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی وہ تم پر آ کر رہے گی اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے تا کہ اللہ تعالیٰ جزا دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں ان کے لئے مغفرت ہے اور رزق کریم اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔''

نیز رب العزت نے فرمایا:۔

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝﴾(التغابن.۷)

''کافروں نے بڑے دعویٰ سے کہا ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے ان سے کہو نہیں میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ کیا ہے اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان ہے۔''

نیز رب العزت نے فرمایا:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ

يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ٥ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ٥﴾

(النحل. ۳۸. ۳۹. ۴۰)

''اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کہ اللہ تعالیٰ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا۔ کیوں نہیں؟ یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ عزوجل ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے۔ (رہا اس کا امکان تو) ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں ہو جا بس ہو جاتی ہے۔''

نیز رب العزت نے فرمایا:۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا وَتَرَی الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِیْجٍ ٥ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ یُحْیِ الْمَوْتٰی وَاَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ٥ وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ ٥﴾

(الحج. ۵. ۶. ۷)

''لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو

کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقتِ خاص تک رحموں میں ٹھہرا رکھتے ہیں' پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے' اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے' اور یہ (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی' اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں' اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں۔''

نیز رب العالمین نے فرمایا:۔

﴿وَقَالُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ○ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ○ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ○ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ○﴾

(الاسراء:۴۹۔۵۰۔۵۱۔۵۲)

''وہ کہتے ہیں جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ ان سے کہو تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ یا

اس سے بھی زیادہ کوئی سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبولِ حیات۔ سے بعید تر ہو۔ (پھر بھی تم اٹھ کر رہو گے)۔ وہ ضرور پوچھیں گے کون ہے وہ جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا؟ جواب میں کہو وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا۔ وہ سر ہلا ہلا کر پوچھیں گے اچھا تو یہ ہوگا کب؟ تم کہو کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ لگا ہو جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر میں اس حالت میں پڑے رہے ہیں۔''

نیز اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾

(الاعراف:۵۷)

''اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لیے ہوئے بھیجتا ہے پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ زمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر اسی مری ہوئی زمین سے طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو اس طرح ہم مردوں کو حالتِ موت سے نکالتے ہیں شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق سیکھ لو۔''

نیز اللہ رب العزت نے فرمایا:۔

﴿اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ○ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ○الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ○ اَوَ لَیْسَ

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿ اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (یس :۷۷.۷۸.۷۹.۸۰.۸۱.۸۲.۸۳)

''کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے کہتا ہے کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا؟ جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟ اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور تخلیق کا ہر کام جانتا ہے وہی جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں جب کہ وہ ماہرِ خلاق ہے وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔''

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک منکرِ آخرت کے لئے آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اسے آخرت کے آنے کی خبر قسم کھا کر دیں یا قسم کھائے بغیر دیں وہ جب اس چیز کو نہیں مانتا تو محض اس بنا پر کیسے مان جائے گا کہ آپ قسم کھا کر اس سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو رسول اللہ ﷺ کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ چیز خوب جانتے تھے کہ محمد ﷺ نے کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا چاہے وہ آپ ﷺ کے کتنے بھی مخالف تھے لیکن اپنے دلوں میں وہ یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ ایسا سچا انسان کبھی رب تعالی کی قسم کھا کر وہ بات کہہ سکتا ہے جس کے برحق ہونے کا اسے کامل یقین

نہ ہو۔دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ محض آخرت کا عقیدہ ہی بیان نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے لیے نہایت معقول دلائل بھی پیش فرماتے تھے۔

ایک سوال یہ ہے کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنے کی ضرورت کیا ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ اس برحق کائنات میں جس مخلوق کو کفر وایمان میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہو اور جسے اس کائنات میں بہت سی چیزوں پر تصرف کا اقتدار بھی عطا کیا گیا ہو اور جس نے کفر یا ایمان کی راہ اختیار کر کے بہت سی بھلائیاں یا بہت سی برائیاں خود اپنی ذمہ داری پر کی ہوں اس کے بارے یہ تصور کرنا انتہائی غیر معقول ہے کہ یہ سب کچھ جب وہ کر چکے تو آخرکار بھلے کی بھلائی اور برے کی برائی دونوں بے نتیجہ رہیں اور سرے سے کوئی وقت ایسا آئے ہی نہیں جب اس مخلوق کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو جو شخص ایسی غیر معقول بات کہتا ہے وہ لامحالہ دو حماقتوں میں سے ایک حماقت کا ارتکاب کرتا ہے۔

(۱)۔ یا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات ہے تو مبنی بر حکمت مگر یہاں انسان جیسی با اختیار مخلوق کو غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۲)۔ یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک الل ٹپ بنی ہوئی کائنات ہے جسے بنانے میں سرے سے کسی حکیم کی حکمت کارفرما نہیں ہے۔

پہلی صورت میں وہ ایک متناقض بات کہتا ہے کیونکہ مبنی بر حکمت کائنات میں ایک با اختیار مخلوق کو غیر دار ہونا صریحاً خلاف عقل وحکمت ہے اور دوسری صورت میں وہ اس بات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایک الل ٹپ بنی ہوئی بے حکمت کائنات میں انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا وجود میں آنا آخر ممکن کیسے ہوا اور اس کے ذہن میں عدل وانصاف کا تصور کہاں سے آ گیا؟ بے عقل سے عقل کی پیدائش اور بے عدل سے عدل کا تصور برآمد ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا قائل یا تو ایک ہٹ دھرم آدمی ہو سکتا ہے یا پھر وہ جو بہت زیادہ فلسفہ بگھارتے بگھارتے دماغی مریض ہو چکا ہے۔

بعث بعد الموت ممکن ہے اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل نہیں ہے ظاہر ہے جس ذات کے

لئے کائنات کا اتنا بڑا نظام بنا دینا دشوار نہ تھا اور جس کے لئے اس دنیا میں پہلی دفعہ انسانوں کو پیدا کرنا دشوار نہ تھا اس کے لیے یہ بات آخر کیوں دشوار ہوگی کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اپنے سامنے حاضر کرے اور ان کا حساب لے۔

ہر زمانے میں منکرین حق جس بنیادی گمراہی میں مبتلا رہے ہیں اور جو بالآخران کی تباہی کا موجب ہوئی وہ یہ تھی کہ انہوں نے بعث بعد الموت یعنی آخرت کا انکار کیا اگر چہ کسی منکرِ آخرت کے پاس نہ پہلے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا نہ آج ہے نہ کبھی ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ لیکن ان نادانوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ دعویٰ کیا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کئے جائیں حالانکہ قطعیت کے ساتھ آخرت کا انکار کر دینے کی نہ کوئی عقلی بنیاد موجود ہے اور نہ ہی علمی۔

یہ عقیدہ کہ قیامت والے دن دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے یہ کافروں کا محض گمان ہے جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں جو لوگ آخرت کے منکر ہیں اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں طرح طرح سے ان کو قائل کیا ہے کہیں فرمایا:۔ کہ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے جو تمام جہان پیدا کیا ہے وہ تو ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہے اور یہ ہر انسان کا عقلی تجربہ ہے کہ جو کام ایک دفعہ ہو چکا ہو دوسری دفعہ اس کا کرنا بالکل نہایت آسان ہو جاتا ہے پھر کیوں یہ لوگ حشر کا انکار کرتے ہیں؟

کہیں فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ عقل دی ہے وہ جو کام کرتا ہے کسی مصلحت اور فائدے کے لئے کرتا ہے وہ رب العزت جس نے سب عقل مندوں کو پیدا کیا اس کے کام کو یہ لوگ بے فائدہ اور عبث کیوں ٹھہراتے ہیں؟ اتنا نہیں سمجھتے کہ جزا سزا کا ایک دن نہ ہو اور نیک و بد کو جزا سزا نہ ہو تو جہاں کا پیدا کرنا عبث اور بے فائدہ ٹھہرے گا اللہ تعالیٰ نے آخرت کے منکروں کا جواب دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ میری قسم کھا کر انہیں بتاؤ آخرت برحق ہے ضرور آئے گی اس طرح جواب اس لیے دلوایا گیا ہے کہ انسان کی عادت میں ہے کہ قسم کھا کر جو بات کہی جاتی ہے اس کا انسان کو اعتبار ہو جاتا ہے اس قدر

سمجھانے اور قسم کھانے کے بعد بھی جو آخرت کا منکر ہے یا زبانی تو اقرار کرے لیکن اپنے اقرار کا پابند ہو کر آخرت کی تیاری نہ کرے اس کی حالت قابل افسوس ہے۔ خود رب العزت نے سورت یس میں ایسے لوگوں کے حال پر افسوس ظاہر فرمایا ہے۔ ❶

زیر تفسیر سورت یونس کی آیت کریمہ میں وربی کی قسم میں دلیل کا ایک لطیف پہلو مضمر ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جس کی شانیں اس کائنات کے ہر گوشہ میں نمایاں ہیں اس بات کو واجب کرتی ہیں کہ وہ نیک اور بدکار دونوں کے ساتھ ایک جیسا معاملہ نہیں کرے گا بلکہ لازماً وہ نیکوں کو انکی نیکی کا صلہ دے گا اور بدکاروں کو ان کی بدی کی سزا اس کی شانِ ربوبیت اس کی متقاضی ہے۔ اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد لوگوں کو اٹھائے۔ ان کا حساب لے۔

اس مقسم بہ ای وربی اور مقسم علیہ انه لحق وما انتم بمعجزين کے مابین نہایت ہی عمدہ مناسبت ہے خصوصاً جب لفظ رب کی اضافت یائے متکلم کی طرف کی ہے جس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کی تمام کائنات مظہر ہے لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تو رب العالمین کی شانِ ربوبیت کا عظیم ترین شاہکار ہے جس کی نظیر کائنات میں نہیں ہے ایسی شخصیت کے پروردگار رب العالمین نے آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ ای وربی کے انداز میں قسم اٹھا کر انہیں جواب دو کہ قیامت' آخرت' بعث بعد الموت' جزا سزا' قرآن مجید برحق ہے اور تم زمین میں ریزہ ریزہ ہو کر بھی دوبارہ اٹھانے سے عاجز نہیں کر سکتے اور نہ ہی عذاب الٰہی سے بچ سکتے ہو۔ جو خالق کائنات اور پروردگارِ عالم محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت تیار کرے اور اس کو پروان چڑھائے اور اعلیٰ ترین انداز مین انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت وتربیت کی توفیق عطا فرمائے اور دین اسلام کے لیے جو شخصیت دن رات انتھک کوشش فرمائے اور تکلیفیں اٹھائیں اس کو دوبارہ زندہ کر کے جزاؤں سے نہ نوازے ۔ اور اس کے مخالفین اور منکرین کو سزاؤں کے شکنجہ میں نہ

❶ احسن البیان

کسے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور وہ اس کی گرفت اور پکڑ سے نکل بھاگیں یہ کس طرح ممکن ہے؟ ضرور وہ انسانوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا آخرت آئے گی جزا سزا ہوگی۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق آخرت پر ایمان نہایت ضروری ہے اس کے بغیر توحید و رسالت کا عقیدہ بھی درست نہیں ہوتا۔ اگر آخرت کا حساب و کتاب، جزا، سزا برحق نہیں تو کوئی آخر توحید و رسالت پر ایمان کیوں لائے؟ توحید و رسالت پر ایمان لانے سے اس کے علم و عمل میں کیا تبدیلی واقع ہوجائے گی؟ یہی سبب ہے کہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں بعث و نشور کے معاملے کو اس قدر اہمیت دی اور رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ بار بار میری ربوبیت کی قسمیں اٹھا کر انہیں بتاؤ کہ آخرت برحق ہے جزاء سزا ضرور ہوگی۔ ❶

حدیث جرائیل علیہ السلام میں ماالایمان کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الایمان ان تومن باللہ وملائکتہ وکتبہ وبلقائہ ورسلہ وتومن بالبعث۔ ❷

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سورت یونس آیت ۵۳ میں کفار کے سوال احق ھو کے جواب میں قل ای وربی انہ لحق وما انتم بمعجزین کے ساتھ جواب دینے میں کئی وجوہ سے تاکید ہے۔

(۱)۔ انّ حرف تاکید کا ہونا (۲) لحق میں لامِ تاکید کا آنا (۳) جواب قسم کا جملہ اسمیہ ہونا۔ جواب میں تاکید کا یہ انداز دلالت کرتا ہے کہ قسم کے مخاطب لوگ انکار اور سرکشی میں انتہاء تک پہنچ چکے تھے۔ مخالفین کا احق ھو کہہ کر سوال کرنا ان کے استہزاء اور انکار کو نمایاں کرتا ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں: وما انتم بمعجزین جملہ کے بارے دو احتمال ہیں۔ (۱) ایک یہ ہے کہ اس کا عطف انہ لحق جواب قسم جملہ پر ہے (۲) دوسرا احتمال ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ ❸

یستنبؤنك احق ھو میں منکرین کے حیرت و استعجاب کے اظہار سے مقصود صورت

---

❶ تدبر القرآن ❷ صحیح بخاری جلد اول ص ۱۲

❸ فتح القدیر ج ۲ ص ۴۵۲

حال کو دریافت کرنا نہیں تھا بلکہ تکذیب وتعریض تھی۔ ❶

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں آٹھ مقامات پر اپنی ربوبیت کی قسمیں اٹھائی ہیں:۔

(۱)سورت النساء آیت ۶۵فلا وربك

(۲)سورت الانعام آیت ۳۰قالوا بلی وربنا

(۳)سورت یونس آیت ۵۳قل ای وربی

(۴)سورت سبا آیت (۳) قل بلی وربی

(۵)سورت الاحقاف آیت ۳۴ قالوا بلی وربنا

(۶)سورت الذاریات آیت ۲۳ فورب السماء و الارض

(۷)سورت التغابن آیت ۷ قل بلی وربی

(۸)سورت المعارج آیت ۴۰ فلا اقسم برب المشارق والمغارب انا لقادرون۔

(۳) سورت الحجر

﴿لَعَمْرُکَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَکْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾ آیت ۷۲.

''تیری جان کی قسم بے شک وہ اپنی مدہوشی میں (بالکل) بھکے ہوئے تھے۔''

اس آیت کریمہ میں لام قسمیہ ہے اور عمرک مقسم بہ اور باقی مقسم علیہ ہے۔نحوی کہتے ہیں:لعمرک مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے اس کا معنی لعمرک قسمی ہے خبر قسمی کو حذف کر دیا کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے۔ ❷

عُمر اور عَمر دونوں ایک ہیں لیکن قسم میں عمر ع کے فتحہ کیساتھ کہتے ہیں کیونکہ یہ عُمر سے زیادہ خفیف ہے اور قسم کے کثرت استعمال کی بنا پر تخفیف کے حصول کے لئے عَمر عین کے فتح سے استعمال ہوتا ہے اور اسی تخفیف کے لیے اس کی خبر حذف کر دیتے ہیں اسکی تقدیر یوں

---

❶ تفسیر ماجدی ❷ التفسیر الکبیر جلد۷ صفحہ ۱۵۶

ہے لعمرک مما اقسم بہ۔ مما اقسم بہ خبر کو حذف کر دیا ہے۔[1] ابن جریر طبری فرماتے ہیں:۔ کہ لعمرک میں مخاطب محمد ﷺ ہیں اور لفی سکرتھم یعمھون کی ضمائر سے قریش مراد ہیں اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں اے محمد! تیری زندگی کی قسم بے شک تیری قوم قریش اپنی گمراہی اور جہالت میں حیران پھرتے ہیں۔ ابن جریر طبری اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا ہے:

((ما خلق الله وما ذرأ وما برأ اكرم على الله من محمد وما سمعت الله اقسم بحياة احد غيره))

کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مکرم محترم کوئی مخلوق نہیں بنائی اور نہ پیدا کی مجھے نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سوا کسی کی زندگی کی قسم اٹھائی ہو۔

ایک روایت حضرت ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ماحلف الله بحياة احد الا بحياة محمد ﷺ۔))

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری زندگی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے کسی کی زندگی کی قسم نہیں اٹھائی ہے۔[2]

زمخشری کہتے ہیں کہ لعمرک میں فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو مخاطب کیا ہے کہ اے لوط تیری زندگی کی قسم تیری قوم کی بدکاری نے ان کی عقل ماردی ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ کے الفاظ میں دونوں احتمالوں میں سے کسی ایک کا قرینہ نہیں ہے ظاہر لفظ اور سیاق تو اسی بات پر دلالت کرتا ہے جسے سلف نے

---

[1] الکشاف جلد۲ صفحہ۳۱۸

[2] فتح البیان فی مقاصد الرحمن جلد۳ صفحہ۵۹۴

سمجھا ہے یعنی لعمرک میں آپ محمد ﷺ کی زندگی کی قسم اٹھائی گئی ہے۔ معتزلہ اور معطلہ اس میں حضرت لوط علیہ السلام کی زندگی مراد لیتے ہیں۔

محمد ﷺ کی زندگی اور عمر نہایت شرف و منزلت والی یہ ایک عظیم چیز ہے جو اس لائق ہے کہ اس کی قسم اٹھائی جائے کیونکہ بنی آدم کی تمام عمروں پر آپ کی عمر کی فضیلت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی زندگی اور عمر اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت اور نشانی ہے تو وہ اس اہل ہے کہ اس کی قسم اٹھائی جائے۔ ❶

تفسیر ماجدی میں ہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی صداقت اور پاکیزگی کو جو کافروں کو بھی مسلم تھی بطور گواہ پیش کیا جا رہا ہے اور یہی مقصد قسم کا ہوتا ہے اصل قصہ کے درمیان یہ اتنا جزء براہ راست رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے اور یہ طریقہ عین خطبات عرب کے مطابق ہے۔

لعمرک قسم سے غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقسم بہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہت بلند مقام و مرتبہ ہے اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور تمام مقربین میں سے اللہ عزوجل کے ہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہت شان و مرتبہ ہے۔ اور دوسری اصل غرض حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی شہوت پرستی اور بدمستی کی خبر کو مؤکد اور پختہ کرنا ہے۔ ❷

یعمهون قوم لوط سیدھی راہ کو چھوڑ کر اندھے ہو چکے تھے ان کی بصیرت مٹ چکی تھی العمہ بصیرت کے مٹ جانے کو کہتے ہیں۔ جس کے بعد انسان بھٹکتا پھرتا ہے۔

قوم لوط پر آنے والا عذاب نہایت ہولناک تھا۔ ارشاد فرمایا:۔

﴿فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ ۝ فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۝ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ ۝

❶ تبیان فی اقسام القرآن

❷ قوائد التدبر الامثل صفحہ ۴۷۵

﴿وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ○ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ○﴾

(الحجر ۷۳ تا ۷۷)

''آخرکار پو پھٹتے ہی ان کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر کے رکھ دیا وران پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسادی۔ اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو صاحب فراست ہیں اور وہ علاقہ (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) گزرگاہ عام پر واقع ہے اس میں سامان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو صاحب ایمان ہیں۔

حجاز سے شام اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستہ میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے ان آثار کو دیکھتے ہیں۔ جو اس علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ صحیح جامع صغیر میں حضرت ابن عباس سے حدیث ہے کہ:

((من وجدتموه يعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول)) [1]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔ جس کو لواطت کرتے پاؤ کرنے اور کروانے والے دونوں کو قتل کر دو۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت لوط علیہ الصلاۃ والسلام کی پاک وصاف مطہر زندگیاں مقسم بہ بن کر قریش یا قوم لوط کی غلیظ' گندی شہوت پرستی اور بدمستی سے آلودہ زندگیاں مقسم علیہ بنا کر دو متضاد زندگیاں سامنے رکھ کر مقسم بہ کی طرف تشویق اور اس کے محبوب خدا ہونے اور مقسم علیہ کے مبغوض اور قابل نفرت ہونے کو نمایاں کیا گیا ہے۔

[1] صحيح جامع الصغير حديث ٦٥٨٩

(۴) سورت الحجر

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

(الحجر ۹۲۔۹۳)

''تو قسم ہے تیرے رب کی ہم ضرور ان سب کو پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔''

واؤ حرف قسم ہے ربك مقسم بہ ہے لنسئلنهم اجمعين عما كانوا يعملون مقسم علیہ ہے۔

ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد ﷺ کو فرما رہے ہیں اے محمد ﷺ! تیرے رب کی قسم ہم ان لوگوں سے جنہوں نے دنیا میں قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کیا آخرت میں ان کے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کی پوچھ گچھ کریں گے اس بارے جو ہم نے انہیں حکم دیا اور جو کتاب آپ کو دے کر مبعوث کیا اور جن چیزوں کے اقرار کی طرف ہم نے انہیں دعوت دی۔ اپنی توحید کی طرف بلایا اور بتوں اور شریکوں سے برأت کا حکم دیا۔ [1]

جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ پر مثانی اور قرآن عظیم نازل ہوا ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی کتابیں اتری تھیں جنہوں نے ان کے ٹکڑے کیے کسی حصے کو مانا اور کسی کو نہ مانا کتاب اللہ کو اپنی خواہشاتِ نفس کا کھلونا بنایا جو بات پسند آئی مان لی اور باقی کو چھوڑ دیا چونکہ اللہ تعالیٰ کی سب کتابوں کی تعلیم ایک جیسی ہے اصولِ دعوت ایک ہیں حق ایک ہے اور ہر دور میں ناحق اور تکذیب وکفر بھی ایک تھا لہذا رسول اللہ ﷺ کے مکذبین سے یہ فرمایا گیا کہ نہ یہ کتاب انوکھی چیز ہے نہ یہ رسول انوکھا ہے۔ کتابیں پہلے بھی اتاری گئی تھی اور رسول پہلے

---

[1] جامع البیان عن تاویل آی القرآن الجزء ١٤ صفحه ٦٦

بھی بھیجے گئے تھے مگر لوگوں نے ہر زمانے میں کتابوں کے ٹکڑے کیے بعض حصے مان لیے اور بعض کا انکار کر دیا۔ جس طرح کہ آج بھی رسول اللہ ﷺ اور آپ کی کتاب کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے جس طرح پہلے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے دو حصے کیے تھے ایک حصہ مقبول تھا اور دوسرا غیر مقبول اسی طرح اس قرآن کے بھی دو حصے انہوں نے کیے ہیں جو مرضی اور خواہش کے خلاف نہ ہوا سے مان لیا اور دوسرے کا انکار کر دیا قران برحق ہے اور قیامت بھی برحق ہے لہذا ان سے بالضرور سوال کیا جائے گا کیا انہوں نے اس سوال کا جواب سوچ لیا ہے؟ ❶

ابن جریر طبری لنسئلنهم اجمعين عما كانوا يعملون سوال کے مخاطب کفارِ مکہ کو قرار دیتے ہیں۔ قرآن اور رسول کے بارے ان کے غلط اور بدترین رویہ پر ضرور باز پرس ہوگی اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھا کر فرمایا اے محمد ﷺ! تیرے پروردگار کی قسم ان کی کرتوتوں کی بابت ہم ان سے ضرور پوچھیں گے۔ ہماری کتاب کو کبھی جادو کبھی شعر کبھی جھوٹی کہانیاں اور کبھی کہانت اور محمد ﷺ کی خود ساختہ بنائی ہوئی کتاب قرار دینے والوں سے ضرور پوچھ گچھ ہوگی۔ ایسے ہی ہمارے رسول کو کبھی شاعر کبھی کاہن کبھی ساحر اور کبھی جھوٹا قرار دینے والوں سے ضرور باز پرس ہوگی ان کی تکذیب کرنے والے مجرم ہیں ان کی تفتیش ضرور ہوگی۔

ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں سب انسانوں سے دو چیزوں کی بابت قیامت کے دن سوال ہوگا ایک کن چیزوں کی عبادت کرتے رہے؟ دوسرا رسولوں کو جواب کیا دیا تھا؟ ❷

رب مقسم بہ کی کاف ضمیر کی طرف اضافت مقسم علیہ لنسئلنهم اجمعين عما كانوا يعملون کے ساتھ خصوصی مناسبت پیدا کر رہی ہے۔ کہ اے ہمارے رسول ﷺ تیری تربیت ہم نے جس انداز میں کی ہے کہ تمام انسانوں کے سارے کمالات تجھ میں جمع ہوگئے اور نقص دور کر دیئے ایسے رسول کی تکذیب کرنے والوں کی باز پرس قیامت کے دن

❶ فی ظلال القرآن جلد ٥ صفحہ٢٩٣

❷ جامع البیان طبری جلد٨ جزء ١٤

ضرور ہوگی۔

بعض نے اس سوال کے مخاطب اہل کتاب بالخصوص یہود کو قرار دیا ہے نہایت زوردار الفاظ میں قسم کے ساتھ ارشاد فرمایا: کہ جنہوں نے کتمانِ حق اور اپنے اغراض واہوا کے لیے کتابِ الٰہی کے ساتھ یہ سلوک کیے ہیں ہم ان سے ان کی ان کارستانیوں کی بابت ایک دن ضرور باز پرس کریں گے۔ یہود نے حق کو چھپانے کے لیے تورات کی ترتیب بھی بدل ڈالی اور اس کو مختلف اجزاء میں تقسیم کرکے اس کے بعض حصے کو چھپاتے اور بعض کو ظاہر کرتے۔ ❶

(۵) سورت النحل

﴿وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ تَاللّٰهِ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ﴾ آیت ۵٦

"یہ لوگ جن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں ان کے حصے ہمارے دیے ہوئے رزق سے مقرر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی قسم ضرور تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ جھوٹ تم نے کیسے گھڑ لیے تھے۔"

کافر اور مشرک جن کو حاجت روا' مشکل کشا اور معبود سمجھتے ہیں وہ پتھر کی مورتیاں یا جنات وشیاطین جن کی حقیقت کا ان کو علم ہی نہیں اسی طرح قبروں میں مدفون لوگوں کی حقیقت بھی کوئی نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ وہاں کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ افراد ہیں یا کسی دوسری فہرست میں ہیں؟ ان باتوں کو کوئی نہیں جانتا لیکن ظالم' کافر' مشرک' لوگوں نے ان کی حقیقت سے ناآشنا ہونے کے باوجود انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے ان کے لیے بھی نذر ونیاز کے طور پر حصہ مقرر کرتے ہیں بلکہ اللہ عزوجل کا حصہ رہ جائے تو بے شک رہ جائے اللہ تعالیٰ کے شریکوں

❶ تدبر القرآن جلد۳ صفحہ ٦٢٦

کے حصہ مین کمی نہیں کرتے۔ رب العزت فرماتے ہیں: ''ان کے اس افتراء، جھوٹ پر ہم ضرور ان سے باز پرس کریں گے۔'' مشرکوں' کافروں کے اس طرز عمل کی اللہ تعالیٰ نے سورت الانعام میں خوب تفصیل بیان فرمائی ہے ارشاد ہے:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْباً فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَاءِ نَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَاءِ هِمْ فَلاَ يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَا نَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَاءِ هِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ٥﴾(الانعام ۱۳۶)

''ان لوگوں نے اللہ عزوجل کے لیے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں مین سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بزعم خوذ اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ عزوجل کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ۔''

ظالم' مشرک' کافر' جاہل جس ظلم شرک' کفر جہالت پر اصرار کرتے ہیں اور جسے چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے انہیں اللہ عزوجل بتاتے ہیں کہ تمہارا ظلم وکفر کیا ہے؟۔ اس بات کے وہ خود قائل تھے کہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور کھیتیاں وہی اگاتا ہے نیز ان جانوروں کا خالق بھی اللہ عزوجل ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہین لیکن ان کا تصور یہ تھا کہ ان پر اللہ تعالیٰ یہ فضل ان دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جنات' اور آسمانی ستاروں اور بزرگانِ سلف کی ارواح کے طفیل وبرکت سے ہے جو ان پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیدوار اور اپنے جانوروں مین سے دو حصے نکالتے تھے ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے نام کا اس شکریہ میں کہ اس نے یہ کھیت اور یہ جانور انہیں بخشے اور دوسرا حصہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سرپرست کی نذر ونیاز کا تاکہ ان کی مہربانیاں ان کے شاملِ حال رہیں اللہ تعالیٰ ان کے اسی ظلم پر گرفت فرماتا ہے کہ یہ سب

مویشی ہمارے پیدا کیے ہوئے اور ہمارے عطا کردہ ہیں ان میں یہ دوسروں کی نذر ونیاز کیسی؟ یہ نمک حرامی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اپنے محسن کے احسان کو جو اس نے سراسر خود اپنے فضل وکرم سے تم پر کیا دوسروں کی مداخلت اور ان کے توسط کا نتیجہ قرار دیتے ہو اور شکریہ کے استحقاق میں انہیں اس کے ساتھ شریک کرتے ہو۔

پھر اشارۃً دوسری گرفت اس بات پر بھی فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حصہ ہے جو انہوں نے مقرر کیا ہے یہ بھی بزعمِ خود کرلیا ہے اپنے شارع خود بن بیٹھے ہیں آپ ہی جو حصہ چاہتے ہیں اللہ عزوجل کے لیے مقرر کر لیتے ہین اور جو چاہتے ہیں دوسروں کے لیے طے کر دیتے ہین حالانکہ اپنی بخشش کا اصل مالک ومختار خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے اور یہ بات اسی کی شریعت کے مطابق طے ہونی چاہیے کہ اس بخشش میں سے کتنا حصہ اس کے شکریہ کے لیے نکالا جائے اور باقی میں کون کون حق دار ہیں۔ پس درحقیقت اس خودمختارانہ طریقہ سے جو حصہ یہ لوگ اپنے زعمِ باطل میں اللہ تعالی کے لیے نکالتے ہین اور فقرا مساکین پر خیرات کرتے ہیں وہ بھی کوئی نیکی نہیں ہے۔ پھر کیسی گندی یہ حرکت کہ وہ اللہ تعالی کے نام سے جو حصہ نکالتے ہیں اس میں بھی طرح طرح کی چالبازیاں کرکے کمی کرتے رہتے تھے۔ اور ہر صورت میں سے اپنے خودساختہ شریکوں کا حصہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو دلچسپی انہیں اپنے ان شریکوں کے حصے میں ہے وہ اللہ تعالی کے حصہ میں نہیں شریکوں کی جو شے اللہ تعالی کے حصے میں مل جاتی تو اسے انہی کے حصہ میں واپس شامل کر دیا جاتا تھا۔ کھیت کا جو حصہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے اگر اس میں سے پانی اس حصہ کی طرف پھوٹ بہتا جو اللہ تعالی کی نذر کے لیے مختص ہوتا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصہ میں داخل کر دی جاتی ہے لیکن اس کے برعکس صورت پیش آتی تو اللہ تعالی کے حصہ میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔

اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر ونیاز کا غلہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو اللہ تعالیٰ کا حصہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصہ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہیں کوئی

بلا نہ نازل ہو جائے اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصہ میں کمی آ جاتی تو وہ اللہ تعالیٰ کے حصہ سے پوری کی جاتی تھی لیکن رب العالمین کے حصہ میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصہ میں سے ایک حبہ بھی اس میں نہ ڈالا جاتا۔ اس طرز عمل پر کوئی نکتہ چینی کرتا تو جواب میں طرح طرح کی دل فریب توجیہیں کی جاتی تھیں مثلاً کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اسکے حصہ میں سے کچھ کم بھی ہو جائے تو اسے کیا پروا ہو سکتی ہے۔ رہے یہ شریک تو یہ بندے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرح غنی نہیں ہیں اس لئے ذرا کمی بیشی پر بھی ان کے ہاں گرفت ہو جاتی ہے۔ ان توہمات کی اصل جڑ یہ تھی کہ جہلائے عرب اپنے مال مین سے جو حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے نکالتے تھے وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مد میں صرف کرتے اور جو حصہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے نکالتے وہ یا تو براہ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صورت میں پیش کیا جاتا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پجاریوں تک پہنچ جاتا تھا اسی لیے ان خود غرض مذہبی پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھائی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے حصہ میں کمی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں مگر "اللہ تعالیٰ کے پیاروں" کے حصہ میں کمی نہ ہونی چاہیے بلکہ کچھ اضافہ ہوتا رہے تو بہتر ہے۔ ❶

آیت کریمہ تاللہ لتسئلن عما کنتم تفترون میں تاء حرف قسم ہے۔ اللہ مقسم بہ ہے لتسئلن عما کنتم تفترون مقسم علیہ ہے ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ جل ذکرہ فرما رہے ہیں واللہ اے مشرکو! اپنے معبودوں اور اللہ تعالیٰ کے شریکوں کے لیے ہمارے دیئے ہوئے رزق سے حصہ ٹھہرانے والو! قیامت کے روز وہ تم سے ضرور سوال کرے گا تمہارے ان جھوٹے دعووں پر اور اس ناشکری پر ضرور تمہیں سزا دے گا۔ ❷ قسم کے اس انداز میں سخت وعید ہے امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وھو سؤال تقریع و توبیخ۔ ❸

---

❶ تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۵۸۴ تا ۵۸۵

❷ طبری جلد ۸ الجز ۱۴ صفحہ ۱۲۲ ❸ فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۳۵۳

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔ کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لما لا یعلمون میں واؤ ضمیر کے مرجع کی بابت دو قول ہیں (۱) مشرکین کی طرف لوٹتی ہے (۲) یہ بتوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی بت نہیں جانتے کہ ان کے پوجا کرنے والے کیا کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تاللہ لتسئلن عما کنتم تعملون ایسے ہی ہے جیسا فرمان فوربك لنسئلنهم اجمعين عما كانوا يعملون (الحجر:۹۲۔۹۳)

یہ سوال مشرکین سے قیامت کے روز ہوگا۔ ❶

(٦) سورت النحل

﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ٥﴾(النحل:٦٣)

"اللہ تعالیٰ کی قسم اے نبی ﷺ! تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں شیطان نے ان کے برے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے وہی شیطان آج ان لوگوں کا بھی سرپرست بنا ہوا ہے اور یہ دردناک سزا کے مستحق بن رہے ہیں۔"

اللہ عزوجل اپنے نبی ﷺ کو اپنی ذاتِ گرامی کی قسم کھا کر فرما رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی قسم اے محمد! ﷺ! آپ سے پہلی امتوں کی طرف رسولوں کو ہم نے وہی پیغام دے کر بھیجا جو پیغام دے کر آپ کو آپ کی امت کی طرف بھیجا ہے۔ کہ توحید باری تعالیٰ کی دعوت دو اور صرف اسی کی عبادت کی طرف بلاؤ اور اس کی اطاعت کرو اور شرکاء کو چھوڑنے کی دعوت دو لیکن شیطان نے وہ اعمال ان کے لیے خوشنما بنائے جو وہ کرتے آ رہے تھے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور بتوں کی پوجا کرنا حتیٰ کہ انہوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور پیغمبر

---

❶ التفسير الكبير جلد ٧ صفحه ٢٢٤

اپنے رب تعالیٰ کی طرف جو لے کر آئے اس کی انہوں نے تردید کی آج بھی آپ کی آمد کے بعد کفارِ مکہ کا شیطان ولی بنا ہوا ہے۔ یہ کفار جب آخرت میں اپنے رب کے پاس جائیں گے تو وہ انہیں سخت عذاب دے گا۔ اللہ تعالیٰ (حضرت محمد ﷺ) اپنے رسول کو تسلی دیتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ آج جو کچھ تمہیں پیش آ رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہی کچھ تم سے پہلے آنے والے رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف سے پیش آ چکا ہے، ہم نے اپنے رسول بھیجے کہ لوگ ان کے ذریعے سے ہدایت کی راہ اختیار کریں لیکن لوگوں نے رسولوں کی بجائے شیطان ہی کو اپنا رہنما بنایا اس نے ان کی نگاہوں میں ان کے برے اعمال کھا دیے، مزین اور خوشنما بنائے وہ اپنی گمراہیوں سے نکلنے پر راضی نہ ہوئے آج بھی کفارِ مکہ کے لیے شرک ، بت پرستی ، بے حیائی اور گندے اعمال اور آپ کی تکذیب شیطان نے ان کے لیے خوشنما بنا دیے ہیں جو ان کو دردناک سزا کا حقدار بنا رہا ہے۔

اس آیت کریمہ میں تا حرف قسم ہے اللہ مقسم بہ اور باقی پوری آیت آخر تک مقسم علیہ ہے اس میں آپ ﷺ مخاطب ہیں آپ کو تسلی دینا مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ سورت الانعام میں فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی اُمَمٍ مِنْ قَبْلِکَ فَاَخَذْنٰھُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّھُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ٥فَلَوْلَا اِذْ جَآءَ ھُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰکِنْ قَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ٥﴾(الانعام: ۲ تا ۴)

”تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تا کہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے لیے مزین کیا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔“

قومیں جب اخلاق و کردار کی پستی میں مبتلا ہو کر اپنے دلوں کو زنگ آلود کر لیتی ہیں تو

اس وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب بھی انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے میں ناکام رہتے ہیں۔ پھر ان کے ہاتھ طلبِ مغفرت کے لیے اللہ عزوجل کے سامنے نہیں اٹھتے بلکہ اپنی بداعمالیوں پر تاویلات وتوجیہات کے حسین غلاف چڑھا کر اپنے دل مطمئن کر لیتی ہیں جسے شیطان نے ان کے لئے خوبصورت بنادیا ہے۔

اللہ عزوجل نے سورت النمل میں ہدہد کا قول بیان فرمایا ہے:

﴿وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝﴾

(النمل: ۲۴۔۲۵۔۲۶)

’’میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ عزوجل کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے۔ شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیئے اور انہیں شاہراہ سے روک دیا‘ اس وجہ سے وہ یہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اس اللہ تعالیٰ کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کہ جس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں جو عرش عظیم کا مالک ہے۔‘‘

پرندے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا احساس اور شعور رکھتے ہیں اسی لیے ہدہد نے حیرت و استعجاب کے انداز میں کہا کہ یہ ملکہ اور اس کی قوم اللہ عزوجل کی بجائے سورج کے پجاری ہے اور شیطان کے پیچھے لگی ہوئی ہے جس نے ان کے لیے سورج کی عبادت کو خوشنما کر کے دکھلایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا

مُسْتَبْصِرِيْنَo﴾(العنکبوت:۳۸)

''اور عاد وثمود کو ہم نے ہلاک کیا تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے ان کی بداعمالیاں شیطان نے ان کے لیے خوشنما بنادیں اور انہیں راہ سے روک دیا تھا باوجودیکہ وہ آنکھوں والے اور ہوشیار تھے۔''

شیطانی تحریک اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایسی چیزوں کو جو واقعی حسن وزیبائی سے خالی ہیں۔ظاہری اور عارضی خوشنمائی دے دیتی ہے۔چنانچہ جتنے بھی شیطانی اعمال ہیں ان کا جائزہ لے ڈالئے سب میں یہی چیز مشترک رہے گی شرابی کو فوری اور عارضی لذت شراب میں محسوس ہوتی ہے جواری کو جوا دولت کمانے کا بہترین اور آسان راہ خوب صورت اور اچھی محسوس ہوتی ہے۔شیطان کی چالوں سے بچنے کا آسان اور مؤثر طریقہ تعوذ باللہ اور اپنی عقل اور قوتِ فکر کو صحیح استعمال کرنا جہاں انسان نے غور وفکر سے کام لیا اور چیزوں کا اصلی حسن وقبح اس کی نظر میں ظاہر ہونے لگا شیطانی ترغیبات کی کشش بھی اس کے لیے از خود مفقود ہو جاتی ہے۔

(۷) سورت مریم

﴿وَيَقُولُ الانسَانُ ءِ اِذَا مَا مِتُّ لَسَوفَ اُخرَجُ حَيًّاo اَوَلَا يَذكُرُ الانسَانُ اَنَّا خَلَقنٰهُ مِنْ قَبلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًاo فَوَرَبِّكَ لَنَحشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحضِرَنَّهُمْ حَولَ جَهَنَّمَ جِثِيًّاo ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن كُلِّ شِيعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحمٰنِ عِتِيًّاo ثُمَّ لَنَحنُ اَعلَمُ بِالَّذِينَ هُم اَولٰى بِهَا صِلِيًّاo وَاِنْ مِّنكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتمًا مَّقضِيًّاo ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّاo﴾

(مریم:۶٦ تا ۷۲)

''اورانسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مرچکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لیا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اسے پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی گھیر لائیں گے' پھر جہنم کے گرد لا کر انہیں گھٹنوں کے بل گرادیں گے پھر ہر گروہ میں سے ہر اس شخص کو چھانٹ لیں گے جو رحمان کے مقابلے میں زیادہ سرکش بنا ہوا تھا پھر ہم یہ جانتے ہیں کہ ان مین سے کون سب سے بڑھ کر جہنم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو جہنم پر وارد نہ ہو یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو (دنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اسی میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔''

دنیا کے بہت سے انسانوں نے مختلف انداز اور مختلف اوقات میں قیامت کا انکار کیا ہے گویا کہ یہ ہر قوم وملت کے انسانوں کا متفقہ شبہ ہے اس لئے اسے انسان کی طرف منسوب کر کے بیان فرمایا جارہا ہے۔ اور یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس کا باعث انسان کی غفلت ہے اگر وہ اپنی ابتداء بھول نہ جاتا تو یہ بات ہرگز نہ کہتا انسان سوچے کہ وہ کہاں تھا کیسا تھا وہ کوئی چیز نہ تھا اس کو عدمِ محض سے اللہ تعالیٰ نے وجود بخشا انسان اگر اپنی ابتداء کو یاد کرلے تو اقرار کرلے گا کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھانا زیادہ آسان اور عقل کے قریب ہے۔ پس ارشاد فرمایا: ''کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اسے پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا اگر انسان غفلت کے پردے کو ذرا چاک کرے تو بات کو سمجھ لینا مشکل نہیں پھر اللہ تعالیٰ بطورِ ڈانٹ کے اپنی قسم کھا کر فرمارہے ہیں جو اس کائنات میں عظیم ترین قسم ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ انسان کو اٹھایا جائے گا۔

تیرے رب کی قسم! ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی گھیر لائیں گے پھر جہنم کے گرد لا کر انہیں گھٹنوں کے بل گرادیں گے پھر ہر گروہ میں سے ہر اس شخص کو چھانٹ لیں گے جو رحمان کے مقابلہ میں زیادہ سرکش بنا ہوا تھا۔ آخرت کے منکرین کو اور

ان کو گمراہ کرنے والے وسوسہ اندازی کر کے بھٹکانے والے شیاطین کو بھی ان کے ساتھ جمع کیا جائے گا سب کو جہنم کے گرد گھٹنوں کے بل اکٹھا کیا جائے گا وہ ایک ذلت ورسوائی کا منظر ہوگا جسے یہ لوگ اس وقت تصور میں نہیں لا سکتے سب جبار، متکبر، فرعون، نمرود ابو جھل وابو لہب اس منظر میں اکٹھے ہونگے۔

ارشاد فرمایا پھر ہم جانتے ہیں کہ ان مین کون سب سے بڑھ کر جہنم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے۔ درحقیقت یہ ایک خوفناک منظر ہوگا سب مجرم جمع ہوں گے ذلیل ہونگے اور پھر ان کی چھانٹی کی جائے گی کہ بڑے اور اول درجے کے بدمعاش کون ہیں اور ان سے کم تر کون سے ہیں بڑے بدمعاشوں اور منکروں کو جہنم مین پہلے پھینکا جائے گا اور پھر درجہ بدرجہ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی پناہ کسی پر زیادتی نہ ہوگی پورا عدل وانصاف ہوگا محض انداز سے اور اٹکل سے فیصلے نہیں ہوں گے بلکہ پورے علم ویقین کی بنا پر فیصلے صادر ہوں گے۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وارد ہونے کے معنی بعض روایات میں داخل ہونے کے بیان کیے گئے ہیں مگر کسی کی سند بھی رسول اللہ ﷺ تک قابلِ اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچتی اور پھر یہ بات قرآن مجید اوران کثیر التعداد صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے جن میں مومنین صالحین کے دوزخ میں جانے کی قطعی نفی کی گئی ہے مزید برآں لغتِ میں ورود کے معنی دخول کے نہیں ہیں اس لیے صحیح مطلب یہی ہے کہ جہنم پر گزر تو سب کا ہوگا مگر جیسا کہ بعد والی آیت بتا رہی ہے کہ پرہیز گار لوگ اس سے بچا لیے جائیں گے اور ظالم اس مین جھونک دیئے جائیں گے۔ (تفہیم القرآن)

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ اِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا میں ورود کے معنی کے بارے میں سلف کا اختلاف ہے ایک قول ہے کہ اس سے مراد دخول ہے مسند احمد اور سنن نسائی اور حاکم کے حوالہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ذکر کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ورود دخول کے معنی میں ہے ہر نیک، برا جہنم میں داخل ہوگا مومنوں پر ٹھنڈک اور سلامتی ہوگی۔

دوسرا قول کہ ورود جہنم پر گزرنے کے معنی میں ہے ان دونوں قولوں کی بابت فرماتے ہیں:

((وھذا ن القولان اصح ماورد فی زلك ولاتنا فی بینھما لان من عبر بالدخول تجوز به عن المرور، ووجھه أن المار علیھا فوق الصراط فی معنی من دخلھا))۔[1]

کہ ورود کے کے معنی کے بارے آنے والے اقوال سے یہ دونوں قول زیادہ صحیح ہیں اور ان دونوں کے مابین منافات نہیں کیونکہ جس نے ورود کا معنی دخول کیا ہے اس سے مجازاً اس نے مرور مراد لیا ہے اور اس کی وجہ یہ کہ پل صراط پر گزرنے والا اس میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہنم کی پشت پر پل صراط رکھا جائے گا آپ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے میں اس پل صراط کے پار ہو جاؤں گا اس دن رسول بھی یہی دعا کریں گے یا اللہ! بچائیو۔ اس پل پر کنڈیاں ہوں گی اس صورت کی جیسے سعدان کے کانٹے ہوتے ہیں تم نے سعدان کے کانٹے دیکھے ہیں؟ صحابہ رضوان اللہ علیھم اجمعین نے عرض کیا جی ہاں دیکھے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: بس اسی صورت کے (ٹیڑھے منہ والے) کنڈیاں کتنی بڑی ہوں گی؟ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ کنڈیاں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ان کے اعمال کے لحاظ سے دوزخ میں گھسیٹ لیں گی کوئی تو بالکل ہی ہلاک ہو جائیں گے کوئی چھیل چھلا کر گرتے گرتے بچ جائے گا۔[2]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پل صراط کو لائیں گے اور جہنم کی پشت پر رکھیں گے ہم نے پوچھا یا رسول اللہ پل صراط کیا چیز ہے آپ ﷺ نے فرمایا ایک گرنے پھسلنے کا مقام ہے اس پر کنڈیاں چوڑے چوڑے کانٹوں والی ہیں ان کا سر خمدار سعدان کے کانٹوں کی طرح جو نجد میں ہوتے

---

[1] فتح الباری جلد۳ صفحہ ۱٦٠

[2] صحیح بخاری ج ۲ کتاب الرقاق

ہیں۔ مسلمان اس پر پلک جھپکنے اور بجلی کی طرح اور آندھی کی طرح اور تیز گھوڑوں کی طرح اور اونٹیوں کی طرح گزر جائیں گے۔ بعض تو صحیح سلامت بچ کر نکل جائیں گے بعض کچھ زخمی ہو کر چھل چھلا کر نجات پا جائیں گے اور بعض زخمی چھل چھلا کر دوزخ میں گر جائیں گے۔ آخری شخص جو پل صراط سے پار ہوگا اس کو کھینچ کھینچ کر پار کریں گے۔ ❶

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

پل صراط جہنم کی پشت پر رکھا ہوا ہے یہ وہ پل ہے جو جنت اور جہنم کے درمیان ہے لوگ اپنے اعمال کے مطابق گزریں گے بعض آنکھ جھپکنے کی طرح گزر جائیں گے اور بعض بجلی کی طرح اور بعض آندھی کی طرح اور بعض تیز رفتار گھوڑے کی طرح اور بعض اونٹوں کی طرح اور بعض دوڑ کر اور بعض چل کر اور بعض گھسٹ کر اور بعض کو اچک کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا پل پر کنڈیاں ہوں گی جو لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق اچک لیں گی جو پل صراط سے گزر جائے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ❷

امام طحاوی فرماتے ہیں ہم بعث اور قیامت کے دن اعمال کی جزا اور پیشی اور نامہ اعمال کے پڑھنے اور ثواب سزا اور پل صراط اور ترازو پر ایمان رکھتے ہیں۔ ❸

سنن بیہقی میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے موقوف صحیح حدیث ہے کہ پل صراط تلوار کی دھار کی طرح پھسلنے گرنے کی جگہ ہوگی اور امام طبرانی المعجم الکبیر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی لائے ہیں علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔ ❹

صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو سعید فرماتے ہیں ان الصراط احد من السیف و ادق من الشعرة کہ پل صراط تلوار سے تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ ❺

---

❶ صحیح بخاری جلد ۲ کتاب التوحید

❷ شرح عقیدہ و اسطیہ صفحہ ۱۴۷

❸ شرح عقیدہ طحاویہ صفحہ ۴۴۴

❹ حاشیہ شرح عقیدہ طحاویہ صفحہ ۴۷۰۔

❺ صحیح مسلم بحوالہ فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۵۴۴

سورت مریم کی ان آیات میں فو ربک میں واؤ حرف قسم ہے اور ربلك مقسم به اور باقی آیات جثیاتک مقسم علیہ ہے علامہ شنقیطی فرماتے ہیں کہ لنحشرنهم و الشياطين مقسم علیہ اور اس کے بعد مذکورہ جملوں کا اس پر عطف ہے یعنی وہ بھی جواب قسم ہیں جن پر قسم کھائی جارہی ہے کیونکہ ثم لنحضرنهم اور ثم لننزعن اور ثم لنحن اعلم ان میں لام قسم کا آنا قرینہ ہے کہ یہ سب جوابِ قسم ہیں اور فرمان وان منکم الا واردھا کے متعلق ایک احتمال یہ ہے کہ اس کا بھی سابقہ جواب قسم بننے والے جملوں پر عطف ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو جواب قسم نہ ہو ویسے علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ❶

مقسم بہ فو ربک اور مقسم علیہ جملوں کے درمیان نہایت اعلیٰ مناسبت ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ جیسی شخصیت کی پرورش کرنے والے رب تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ انسانوں کو مارنے کے بعد جزا سزا کے لیے دوبارہ نہیں اٹھائے گا عقل و فکر کے بالکل خلاف ہے آپ ﷺ اور دیگر انبیاء علیہ السلام کے مخالفین کو اٹھا کر سزا دینا اور انہیں جہنم میں داخل نہ کرنا کیوں مان لیا جائے؟ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان آیات میں الانسان سے کافر انسان مراد ہیں کیونکہ أ ذا مت میں استفہام انکار استہزاء اور بعث بعد الموت کی تکذیب کے لیے ہے اور یہ کام کافر انسان کا ہے تمام انسانوں کا نہیں اور ایک قول ہے کہ الانسان میں الف لام جنس کے لیے ہے یعنی سب انسان مراد ہیں اگر چہ مذکورہ بات کہنے والے کافر ہیں۔ جماعت کی طرف بعض کا قول منسوب کر دیا جاتا ہے پھر جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مرنے کے بعد اٹھنے کے دلائل میں سے سب سے قوی ترین دلیل و حجت ذکر فرمائی تو انکو اپنے پاک نام کی قسم اٹھا کر پختہ اور مؤکد کیا جس نام مبارک یعنی رب کی اضافت اپنے رسول کی طرف کی اپنے رسول کی تعظیم وتشریف کے لیے پس فرمایا فو ربك لنحشرنهم والشياطين الخ۔ ❷

---

❶ اضواء البیان جلد ۳

❷ فتح القدير جلد ۳ صفحہ ۳۴۳

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کہ آیت کریمہ وان منکم الا واردھا میں مقام قسم کے بارے اختلاف ہے ایک قول ہے کہ یہاں قسم واللہ ان منکم مقدر ہے اور ایک قول ہے کہ سابقہ قسم فو ربك لنحشرنھم پر عطف ہے یعنی وربک ان منکم الا وارد ہے۔ ❶

زمخشری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے مقدس ناموں میں سے رب نام اپنے رسول کی طرف اضافت کر کے قسم کھانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شان کو بڑا کرنا اور بلند کرنا ہے یعنی لفظ رب کی ک مخاطب ضمیر کی طرف اضافت کر کے جس سے مراد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے قسم کھانا آپ کی شان کو بلند اور بڑا کرنا مقصود ہے جس طرح اپنے فرمان فو رب السماء والارض انه لحق میں رب کو السماء والارض کی طرف اضافت کے آسمان اور زمین کی شان کو بڑا اور بلند کیا ہے۔ ❷

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کے تین بچے فوت ہو جائیں تو وہ صرف قسم پوری کرنے کے لیے جہنم میں داخل ہوگا یعنی وہ جنتی ہے صرف جہنم کے اوپر پل صراط سے اس کا گزر ہوگا۔ ❸

دوزخ سے گزر تو بہر حال سب ہی کا ہوگا یہ اور بات کہ مومنوں کو اس سے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچے گا جس طرح دوزخ پر مقرر ملائکہ کو اس دوزخ سے مطلق تکلیف نہ ہوگی۔ جو کامل مومن ہوں گے انہیں تو کسی قسم کی تکلیف کی ہوا بھی نہ لگنے پائے گی بلکہ دوزخ کی حالت معاینہ اور پھر اس سے اپنی محفوظیت کا تقابل تو اور زیادہ ان میں فرح وسرور کی کیفیت پیدا کر دے گا جس سے وہ بہت شکر گزاری کا انداز

---

❶ فتح الباری جلد۳ صفحہ ۱٦۰

❷ الکشاف جلد۲ صفحہ ٤۱۸

❸ صحیح بخاری کتاب الجنائز جلد اول

اختیار کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت کی بابت عالیشان اسلوب سورہ یسین کے اختتام پر بیان فرمایا ہے ارشاد ہے:

﴿اولم یر الانسان انا خلقنه من نطفة فاذا هو خصيم مبين○ وضرب لنا مثلا ونسى خلقه قال من يحى العظام وهى رميم○ قل يحييها الذى أنشأها اول مرة وهو بكل خلق عليم○الذى جعل لكم من الشجر الاخضر نارا فاذا انتم منه توقدون○ اوليس الذى خلق السموات والارض بقدر على ان يخلق مثلهم بلى وهو الخلق العليم ○ انما امره اذا اراد شيئا ان يقول له كن فيكون ○ فسبحن الذى بيده ملكوت كل شى واليه ترجعون○﴾

''کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے کہتا ہے ''کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟ اس سے انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے وہی جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں جب کہ وہ ماہر خلاق ہے وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ جاتی ہے پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔''

(۸) سورت سبا

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍo لِيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ o وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِىْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌo﴾

(سبا ۳ تا ۵)

''اور منکروں نے کہا ہمارے پاس قیامت نہیں آئے گی کہو! قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی وہ تم پر ضرور آ کر رہے گی اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے (اور یہ قیامت اس لیے آئے گی) کہ اللہ تعالیٰ جزا دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے مغفرت اور رزق کریم ہے اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد اٹھنے کی بابت کفار کے انکار اور اس کے جوابات کا کئی جگہ ذکر فرمایا سورت النحل میں فرمایا:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ o لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِىْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَo اِنَّمَا قَوْلُنَا

لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَاہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ﴾ (آیت ۳۸ تا ۴۰)

''یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا کیوں نہیں؟ یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ عزوجل ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ جھوٹے تھے (رہا اس کا امکان تو) ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا ہوتا کہ اسے حکم دیں ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں جب توحید و رسالت کے ساتھ ساتھ آخرت کا بیان 'مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا ذکر فرمایا تو لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبا آپ کی یہ بات ہوئی کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا لوگ کہتے تھے کہ یہ تو بالکل انہونی بات ہے عقل باور نہیں کرتی کہ ایسا ہو سکتا ہے آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہمارا ذرہ ذرہ زمین میں منتشر ہو چکا ہو تو ان پراگندہ اجزا کو ہزارہا برس گزرنے کے بعد پھر سے اکٹھا کر کے ہمارا یہی جسم از سرِ نو بنا دیا جائے گا اور ہم زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں؟ اللہ عزوجل نے اس کے جوابات کئی اسلوبوں میں دیے ہیں سورت ق میں مختصر طریقے سے چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایک طرف آخرت کے امکان اور اس کے وقوع پر دلائل دیئے ہیں اور دوسری طرف لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ تم خواہ تعجب کرو یا بعید از عقل سمجھو یا جھٹلاؤ بہرحال اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی حقیقت اور قطعی اٹل حقیقت یہ کہ تمہارے جسم کا ایک ایک ذرہ جو زمین میں منتشر ہوتا ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس حال میں کس جگہ موجود ہے اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ اس کے لیے کافی ہے کہ یہ تمام منتشر ذرات پھر جمع ہو جائیں اور تم کو اسی طرح دوبارہ بنا کر کھڑا کیا جائے

جیسے پہلے بنایا تھا۔

سورت ق میں فرمایا:

﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِo بَلْ عَجِبُوْا اَنْ جَآءَ هُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌo ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌo قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌo بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَ هُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ o اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍo وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍo تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍo وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِo وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌo رِزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُo﴾

”ق قسم ہے قرآن مجید کی بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے ان کے پاس آ گیا پھر منکرین کہنے لگے یہ تو عجیب بات ہے کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے)؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے (حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔ بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا اسی وقت اسے صاف جھٹلا دیا اسی وجہ سے یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔ تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگائیں یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس

بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کیے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ برتہ لگتے ہیں یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا بھی اسی طرح ہوگا۔''

آسمان یعنی پورا عالم بالا جسے انسان شب و روز اپنے اوپر چھایا ہوا دیکھتا ہے جس میں دن کو سورج چمکتا ہے اور رات کو چاند اور بے حد و حساب تارے روشن نظر آتے ہیں جسے آدمی آنکھیں کھول کر دیکھے تو حیرت طاری ہو جاتی ہے لیکن دوربین لگائے تو ایک ایسی وسیع و عریض کائنات اس کے سامنے آتی ہے جو ناپیدا کنار ہے کہیں سے شروع ہو کر کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہماری زمین سے لاکھوں گنے بڑے عظیم الشان سیارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں ہمارے سورج سے ہزاروں درجہ زیادہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ ہمارا یہ پورا نظام شمسی اس کی صرف ایک کہکشاں کے ایک کونے میں پڑا ہوا ہے تنہا اسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم دو ارب دوسرے تارے (ثوابت) موجود ہیں اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی ایسی دس لاکھ کہکشانوں کا پتہ دے رہا ہے ان لاکھوں کہکشانوں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشان اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے یہ تو کائنات کے صرف اس حصے کی وسعت کا حال ہے جو اب تک انسان کے علم اور اس کے مشاہدہ میں آئی ہے اللہ تعالیٰ کی خدائی کس قدر وسیع ہے اس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کر سکتے ہو سکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات اس پوری کائنات کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو جو قطرے کو سمندر سے ہے۔ اس عظیم کارگاہ ہست و بود کو جو اللہ تعالیٰ وجود میں لایا ہے اس کے بارے میں زمین پر رینگنے والا یہ چھوٹا سا حیوانِ ناطق، جس کا نام انسان ہے اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا تو یہ اس

کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی۔

جس اللہ تعالی نے زمین کے اس کرے کو زندہ مخلوقات کی سکونت کے لیے موزوں مقام بنایا اور جس نے زمین کی بے جان مٹی کو آسمان کے بے حیات پانی کے ساتھ ملا کر اتنی اعلیٰ درجے کی نباتی زندگی پیدا کر دی جسے تم اپنے باغوں اور کھیتوں کی شکل میں لہلہاتے دیکھ رہے ہو اور جس نے اس نباتات کو انسان وحیوان سب کے لیے رزق کا ذریعہ بنا دیا ہے اس کے متعلق تمہارا یہ گمان کہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے سراسر بے عقلی کا گمان ہے تم اپنی آنکھوں سے آئے دن دیکھتے ہو کہ ایک علاقہ بالکل خشک اور بے جان پڑا ہوا ہے بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے اندر سے یکا یک زندگی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں مدتوں کی مری ہوئی جڑیں یک لخت جی اٹھتی ہیں اور طرح طرح کے حشرات الارض زمین کی تہوں سے نکل کر اچھل کود شروع کر دیتے ہیں یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ناممکن نہیں ہے اپنے اس صریح مشاہدے کو جب تم نہیں جھٹلا سکتے تو اس بات کو کیسے جھٹلاتے ہو کہ جب اللہ تعالی چاہے گا تم خود بھی اسی طرح زمین سے نکل آؤ گے جس طرح نباتات کی کونپلیں نکل آتی ہیں۔ ❶

منکرین آخرت جن وجوہ کی بنا پر زندگی بعد موت کو بعید از عقل سمجھتے تھے ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ جب سارے انسان مر کر مٹی میں رل مل جائیں اور ان کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائے گا تو کس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ بے شمار اجزاء پھر سے اکٹھے ہوں گے اور ان کو جوڑ کر ہم دوبارہ اپنے انہی اجسام کے ساتھ پیدا کر دیے جائیں گے۔ اس شبہ کو سورت سبا میں ذکر کر کے یہ جواب دیا گیا ہے کہ اے پیغمبر! کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی کہ وہ تم پر ضرور آ کر رہے گی اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔ جواب یہ دیا گیا کہ ہر ذرہ جو کہیں گیا ہے اللہ تعالیٰ کے دفتر میں اس کا اندراج موجود

❶ تفهيم القرآن ج ٥

اور اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کیا چیز کہاں گئی ہے جب وہ دوبارہ پیدا کرنے کا ارادہ کریگا تو اسے ایک انسان کے اجزائے جسم کو سمیٹ کرلانے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی پس کن کہنے کی دیر ہوگی کہ وہ فوراً ہو جائے گا۔

سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کا جو تصور سورت سبا کی ان آیات میں پیش کیا گیا ہے یہ انسانی تصور نہیں ہے اس کلام کی کوئی نظیر انسانی نظم ونثر کلام میں نہیں گزری ہے۔ انسان جب کمال علم، شمولِ علم، احاطہ علم اور اس کی گہرائی کی بات کرے گا تو کسی انسان کے ذہن میں یہ عجیب وغریب کائناتی تصویر نہیں گزرتی اور میں انسانی کلام میں علم دقیق شامل وکامل کی اس قسم کی کوئی تعبیر نہیں پاتا۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے جو اپنا وصف خود بیان کرتا ہے اپنے علم کا وصف بیان فرماتا ہے کسی نے ایسا وصف بیان کیا ہے او نہ ہی کرسکتا ہے انسان کے ذھن ودماغ میں اس کا تصور نہیں آسکتا۔ ❶

زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ عزوجل نے لا تاتینا الساعۃ نفی کے بعد بلیٰ کیساتھ اثبات فرمایا ہے کہ معاملہ یہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو کہ قیامت نہیں آئے گی قیامت ضرور آئے گی پھر قیامت کی آمد کو انتہائی تاکید کے انداز میں ثابت کیا ہے وہ اس طرح کہ اللہ عزوجل کے پاک نام رب کی قسم کھا کر تاکید کی پھر قسمی تاکید کو مزید مقسم بہ رب کی صفات عالم الغیب سے لے کر لیجزی تک لا کر پختہ کیا کیونکہ مقسم بہ کی حالت کی عظمت اور بڑائی مقسم علیہ کی حالت کی قوت اور اس کے ثبوت کی مضبوطی اور درستگی کو معلوم کرواتی ہے کیونکہ قسم شھادت لانے کے مرتبہ میں ہے شہادت جتنی مضبوط ہوگی افضل ہوگی اور بلند مرتبہ ہوگی مشہود علیہ یعنی مقسم علیہ اتنا ہی زیادہ مضبوط اور زیادہ پختہ اور زیادہ راسخ اور ثابت ہوگا۔ مزید فرماتے ہیں اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ کفار نے تو قیامت کی آمد کا انکار کردیا اور منکر ہوگئے تو فرض کریں نبی ﷺ ان کے لیے بڑی پختہ اور کڑی قسم کھائیں تو فائدہ کیا؟ جب کہ آپ ﷺ ان کے عقیدہ میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے

❶ فی ظلال القرآن

والے تھے آپ کا قسم کھانا ان کے انکار کو کیسے صحیح کر سکتا ہے؟ تو میں جواباً کہوں گا کہ اگر صرف قسم کا یہاں ذکر ہوتا تو آپ کا اعتراض بجا لیکن جب قسم کے ذرائع سے مقسم علیہ کو پختہ کرنے کے بعد لیجزی الذین الخ۔ قطعی اور نمایاں حجت لائے جس سے قیامت کی آمد ضرور ہو جاتی ہے تو پھر تو آپ اعتراض نہیں کر سکتے۔ دلیل و حجت قسم کے بعد یہ ذکر فرمائی ہے کہ اللہ عزوجل نے انسانی عقلوں اور طبائع میں جزا کا ضروری ہونا رکھا ہے۔ نیکوکار کو جزا اور بدکار کے لئے سزا ضروری ہے۔ اللہ عزوجل کے فرمان لیجزی کا تعلق لتاتینکم کے ساتھ ہے یہ اس کا مفعول لہ ہے یعنی یہ قیامت کے ضرور آنے کی علت اور وجہ بیان ہو رہی ہے۔ (1) اور بعض کے نزدیک لیجزی کا تعلق لا یعزب کے ساتھ ہے۔ (2)

جامع البیان فی تفسیر القرآن کے محشی الوجیز کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ لیجزی کے بارے دو قول ہیں راجح اور اولیٰ قول یہ ہے کہ اس کا تعلق لتاتینکم کے ساتھ ہے۔ دوسرا قول ہے کہ اس کا تعلق لا یعزب کے ساتھ ہے۔

کفار نے جب قیامت کی آمد کا انکار کیا تو قل بلی وربی لتاتینکم علم الغیب الخ۔ کے اسلوب سے نہایت پختہ اور مؤکد طریقہ سے ان کی نفی کو دو چیزوں سے ثابت کیا۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات سے علم الغیب صفت لانے کی وجہ یہ ہے کہ قیامت تمام غیبی اشیاء سے زیادہ مخفی غیب ہے اس کے مناسب صفت علم الغیب ہی ہے۔ (3)

علامہ محمد جمال الدین القاسمی فرماتے ہیں کہ وربی کی صفت عالم الغیب لانے میں تاکید کو تقویت دینا ہے کیونکہ قسم کے بعد مقسم بہ کی بڑی بڑی صفات کا تذکرہ مقسم علیہ کی فخامتِ شان کی بڑائی اور اس کے اثبات کی قوت اور صحت کو معلوم کرواتا ہے کیونکہ جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے وہ مقسم علیہ کے لئے شہادت ہوتی ہے خاص طور پر جب مقسم بہ کے وہ اوصاف لائے جائیں جن کا مقسم علیہ (یعنی دعویٰ) کے ساتھ خصوصیت ہو (جیسا یہاں ربی

---

(1) الکشاف جلد ۲ صفحہ ۲۵۱ (2) املاء مامن بہ الرحمن جلد ۲ صفحہ ۱۹۵

(3) جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۷۴

کی صفت عالم الغیب لا یعزب الخ) کیونکہ قیامت کا برپا ہونا غیبی اور مخفی ہونے میں اس کا زیادہ دخل ہے اور تمام غیبی امور میں سے دل میں جلدی آتی ہے۔ ❶

زیر تفسیر سورت سباء کی ان آیات میں واؤ حرف قسم اور ربی مقسم به لتاتینکم مقسم علیه ہے اور عالم الغیب سے لے کر فی کتب مبین تک ربی کی صفت ہے اور لیجزی الذین سے لے کر من رجز الیم تک لتأتینکم یا لایعزب کا مفعول لہ ہے اور ایک رائے ہے کہ والذین مبتدا اور اولئك لهم آخر تک اس کی خبر اس کا لتاتینکم کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔

(۹) سورت یٰسین

﴿یٰسٓ ٥ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ٥ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ٥ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ٥﴾ (یس ۱ . ۲ . ۳ . ۴)

”یٰس قسم ہے قران حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں مین سے ہو سیدھے راستے پر ہو۔“

سورت یٰس کے فضائل مین بہت سی روایات مشہور ہیں مثلاً یہ قرآن کا دل ہے اسے قریب المرگ شخص پر پڑھو وغیرہ لیکن سند کے لحاظ سے کوئی روایت بھی درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ بعض بالکل موضوع ہیں یا پھر ضعیف ہیں قلب قران والی روایت کو ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے موضوع قرار دیا ہے الضعیفه رقم الحدیث ۱۶۹۔

یٰس کے معنی کے بارے مفسرین کے کئی اقوال ہیں صحیح یہ ہے کہ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں درست بات یہ ہے کہ یٰس بمرتبہ حم، الم کے ہے یہ نبی ﷺ کا نام مبارک نہیں ہے۔ التبیان فی اقسام القرآن۔

ان آیات میں واؤ حرف قسم ہے اور القرآن الحکیم مقسم بہ اور انك لمن

❶ تفسیر قاسمی جلد۸ صفحہ ۱۳۳

المرسلین علی صراط مستقیم مقسم علیہ ہے۔

آپ ﷺ کی رسالت کے برحق ہونے پر قرآنِ حکیم کی قسم کھائی گئی ہے قسم کا آغاز اسی طرح کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ نبی ﷺ کو اپنی نبوت مین کوئی شک تھا اور آپ کو یقین دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو قسم کھانے کی ضرورت پیش آئی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کفارِ قریش پوری شدت کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کر رہے تھے۔

ارشاد فرمایا:

﴿ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴾ [1]

یہ کافر کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں آپ کہہ دیں کہ مجھ میں اور تم میں اللہ گواہی دینے والا کافی ہے اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے

اثبات کے لیے قسم اٹھانے کا تقاضا کفار کا آپ کی رسالت کا انکارِ شدید تھا وہ کسی صورت آپ کو رسول ماننے پر تیار نہ تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی تمہید کے تقریر کا آغاز ہی اس فقرے سے فرمایا کہ قرآن حکیم کی قسم کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو یعنی وہ لوگ سخت غلط کار ہیں جو تمہاری نبوت کا انکار کرتے ہیں اس پر قسم کھائی گئی ہے اور قرآن کی صفت میں لفظ حکیم کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے نبی ہونے کا کھلا ثبوت یہ قرآن ہے جو سراسر حکمت سے لبریز ہے یہ چیز خود شھادت دے رہی ہے کہ جو شخص ایسا حکیمانہ کلام پیش کر رہا ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا رسول ہے کوئی انسان ایسا کلام تصییف کر لینے پر قادر نہیں ہے اور محمد ﷺ کو جو لوگ جانتے ہیں وہ ہرگز اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے کہ یہ کلام آپ ﷺ خود گھڑ گھڑ کر لا رہے ہیں یا کسی دوسرے انسان سے سیکھ سیکھ کر سنا رہے ہیں۔

قرآن کی حکیم صفت کیوں لائے؟ حکمت تو عاقل کی صفت ہے قرآن کو حکیم کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسطرح کی تعبیر قرآن کو حیات اور مقصد وارادہ کی خلعت

---

[1] الرعد: ٤٣

پہناتی ہے کیونکہ حکیم ہونے کے یہی تقاضے ہیں اور باوجود کہ یہ تعبیر ایک مجاز ہے مگر وہ حقیقت کی تصویر کھینچتی ہے اور اس کے قریب ہے کیونکہ اس قرآن کی بھی ایک روح ہے اور اس میں زندوں کی صفات پائی جاتی ہیں کیونکہ جس طرح کسی زندہ کا تمہاری طرف جھکاؤ ہوتا ہے جبکہ تم اپنے دل کو اس کے خلوص سے بھرپور اور اپنی روح کو اس کی طرف جھکالو اور تم اس کے پوشیدہ رازوں پر مطلع ہوجاتے ہو بشرطیکہ اپنا دل اس کے سامنے کھول دو اور اپنی روح کی گہرائی سے اس کے ساتھ سلوک رکھو۔ اسی طرح اس قرآن کا بھی معاملہ ہے کہ جوں جوں تم اس کی طرف خلوص کے ساتھ جھکو گے وہ بھی تمہاری طرف آئے گا اس کی پوشیدگیوں اور گہرائیوں پر اطلاع پاؤ گے۔ تم اس کی بعض صفات کے باعث اس کا اشتیاق رکھو گے جیسا کہ دوست کی بعض صفات کے باعث اس کی طرف جھکاؤ رکھتے ہو اگر تم اس سے دوستی رکھو گے تو وہ بھی تمہارا ساتھی بن جائے گا تم اس کی صحبت میں انس اور راحت محسوس کرو گے رسول اللہ ﷺ دوسروں سے قرات سننے کے لیے دروازے پر کھڑے ہوجاتے تھے جیسے کہ ایک دوست اپنے دوست کی سیرت اور احوال سننا پسند کرتا ہے۔ قرآن کا حکیم ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ ہر ایک کے ساتھ خطاب میں اس کی عقل وفہم اور قوت کو مدنظر رکھتا ہے ایسے احکام دیتا ہے جو لوگوں کی طاقت و وسعت کے اندر ہیں ان کے قلوب پر اثر کرتا ہے اور انکی صلاحیت واہلیت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ اس لحاظ سے بھی حکیم ہے کہ حکمت کے ساتھ تربیت کرتا ہے جو عقلی ونفسی طریقے کے مطابق ہے انسان کی تمام طاقتوں کو آزاد کرتا ہے اور اس کو ایسی راہ پر چلاتا ہے جو بہرصورت اس کے لیے صالح اور سیدھی راہ ہے زندگی کا ایسا نظام وضع کرتا ہے جو حکمت کی حدود کے اندر ہر بہتر انسانی عمل کے لیے متوازن اور متناسب اور موافق ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن حکیم کی قسم کھا کر وحی ورسالت کی حقیقت کی تائید و توثیق فرمائی کہ بلاشبہ اے رسول آپ رسولوں سے ہیں سیدھی راہ پر ہیں قرآن حکیم اس پر شاہدِ صادق ہے۔ صراط مستقیم انك کی دوسری خبر ہے امام طبری رحمہ اللہ

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے۔[1] آپ کے صادق رسول ہونے کے اعلان کے بعد علی صراط مستقیم کے ساتھ یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ رسالت کی حقیقت و کیفیت کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں استقامت پائی جاتی ہے پس یہ سیدھی راہ جیسے تلوار کی دھار سیدھی ہوتی ہے اس میں کجی اور انحراف نہیں ہے نہ کوئی ٹیڑھ ہے اس میں حسن واضح ہے اس میں کوئی پوشیدگی نہیں یہ کسی کی خواہش کے ساتھ یا کسی کی مصلحت کے ساتھ مڑ نہیں جاتی جو اس کی تلاش کرے اس کو آسانی اور خلوص سے پالیتا ہے۔

یہ راستہ چونکہ سیدھا ہے لہذا سادہ ہے اس مین کوئی گنجلک نہیں نہ کوئی چکر ہے یہ معاملات کو الجھن میں نہیں ڈالتا نہ قضایا اور تصورات اور اشکال میں پھنساتا ہے حق کو بالکل سادہ صورت میں برسرِ عام صاف طور پر بیان کرتا ہے کوئی الائش اس میں نہیں ہے یہ راستہ تشریح سے بے نیاز ہے عبارات ڈھالنے اور چباچبا کر بیان کرنے کا محتاج نہیں ہے اس کے معانی ایسے نہیں جن کو گلیوں اور پر پیچ راستوں میں تلاش کیا جائے اس پر شہری، دیہاتی، ان پڑھ، پڑھا لکھا، کٹیا کا رہنے والا اور عمارت میں مقیم سب اس پر اس کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں ہر شخص اس میں اپنی ضرورت پا سکتا ہے یہ راستہ اس لیے بھی سیدھا ہے کہ کائنات کی فطرت اور وجود کا قانون بھی یہی ہے انسان کے اردگرد چیزوں اور زندوں کی فطرت وطبیعت بھی یہی ہے یہ راستہ اشیاء کی فطرت سے متصادم نہیں ہے اور نہ انسان کو حکم دیتا ہے کہ ان کے ساتھ ٹکرائے یہ اشیاء کی طبیعت وفطرت کے ساتھ موافق ہے اس وجودِ کائنات پر حکومت کرنے والے تمام قوانین کے ساتھ بھی اس کا تعاون ہے یہی وجہ ہے کہ یہ راستہ سیدھا اللہ تعالیٰ تک جاتا ہے خود وہاں پہنچتا ہے اور لوگوں کو بھی پہنچاتا ہے اس پر چلنے والا اس بات کا خوف نہیں رکھتا کہ وہ اپنے خالق کی راہ سے بھٹک جائے گا۔ کیونکہ وہ اس راستے کا مالک ہے جو صراط مستقیم ہے اور اس راستے کا راہنما

[1] تفسیر طبری جلد ۱۲ جزء ۲۲ صفحہ ۱۴۹

قرآن حکیم ہے قرآن حق کی تصویر کھینچتا ہے اس کی طرف چلنے کا حکم دیتا ہے اس کے احکام صحیح اقدار کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ❶

قرآن کی حکیمانہ پر مغز تعلیمات خود اس بات کی گواہ ہیں کہ آپ ﷺ مرتبہ رسالت پر فائز ہیں کوئی غیر خدائی ماٰخذ ایسی تعلیمات کا ہوسکتا ہی نہیں قریش یا قوم عرب جو پیام اسلام کے اولین مخاطب تھی جس دور سے دنیا اس وقت گذر رہی تھی اور جس منزل میں اس وقت تھی لوگوں کی سمجھ میں یہی آنا ذرا مشکل تھا کہ کوئی نبی اپنی قوم یا قبیلہ کی اصلاح کے لیے بھی آسکتا ہے تو عالم گیر نبوت اور کائناتی پیمبری کا تخیل تو وقت کے عام ذہنوں کی گرفت سے بالکل ہی باہر تھا یہی راز ہے اس کا کہ قرآن رسول اللہ ﷺ کے پیغام کی عالم گیری کو اس تصریح اور اس تکرار کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے جس طرح آپ ﷺ کی پیغمبری خود آپ کی قوم قریش یا عرب کی طرف بیان کی ہے۔ نبوت محمدی کی یہ عالمگیر حیثیت بھی متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے مثلاً لیکون للعالمین نذیرا اور ما ارسلناك الا كافة للناس بشيرا و نذيرا وغیرہ لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت و تکرار کے ساتھ زور آپ ﷺ کی قومی نبوت پر دیا گیا ہے۔ ❷

زمخشری فرماتے ہیں علی صراط مستقیم یا تو ان کی خبر ثانی ہے یا مرسلین کا صلہ ہے۔ اگر مرسلین کا صلہ ہے یعنی اس کا متعلق ہے تو معنی ہوگا قرآن حکیم کی قسم بے شک تم سیدھی راہ پر بھیجے گئے ہو۔ ❸

امام نقاش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں کسی رسول کی رسالت کی قسم نہیں کھائی یہ بھی آپ ﷺ کے امتیازات اور خصائص میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی رسالت کے اثبات کے لیے قسم کھائی ہے۔ ❹

---

❶ ظلال القرآن

❷ ماخوذ از ماجدی

❸ الکشاف ❹ فتح القدیر

(۱۰) سورت الصّٰفّٰت

﴿وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا ۝ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝﴾

(الصّٰفّٰت۔۱تا۵)

''قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم سخت ڈانٹنے پھٹکارنے والوں کی پھر کلامِ نصیحت سنانے والوں کی بے شک تمہارا معبودِ حقیقی بس ایک ہی ہے وہی آسمانوں اور زمین کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک ہے۔''

مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ الصافات اور فالزاجرات اور فالتالیات تینوں سے فرشتوں کے تین گروہ مراد ہیں ان کی تفسیر مین دیگر اقوال بھی آئے ہین لیکن راجح یہی ہے کہ ان سے فرشتوں کے تین گروہ مراد ہیں۔

صافات صافۃ کی جمع ہے اس سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر صف بستہ کھڑے نماز وغیرہ عبادات بجا لا رہے ہیں یا حکم الٰہی سننے کے وقت صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہین جیسا کہ اس سورت میں آگے آرہا ہے:

﴿وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۝﴾

(الصافات ۶۵۔۶۶)

اور یقیناً ہم صف باندھے کھڑے رہتے ہیں اور ہم یقیناً تسبیح کرتے رہتے ہیں

پہلے قول کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمین لوگوں پر تین

چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح بنائی گئی ہیں اور ساری زمین ہمارے لیے مسجد بنائی گئی ہے اور جب ہمیں پانی نہ ملے تو اس کی مٹی ہمارے لئے طہارت و پاکیزگی بنائی گئی ہے۔ ❶

دوسرے قول کا مطلب ہے کہ فرشتے ہمیشہ فضا میں صف باندھے اللہ تعالیٰ کے حکم کے لئے گوش برآواز رہتے ہیں اور جب کوئی حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

زاجرات زجراً کے لفظ سے بنا ہے جس کے معنی روکنا' ڈانٹنا' پھٹکارنا' ہے مراد فرشتوں کا وہ عمل ہے جس کے ذریعہ شیاطین کو عالمِ بالا تک پہنچے سے روکتے ہیں جیسا کہ آگے اسی صورت میں آ رہا ہے:

﴿ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ٥وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ٥لَايَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ٥ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ٥﴾

یا فرشتوں کا لوگوں کو نیکی و خیر کا الہام کر کے گناہوں سے منع کرنا مراد ہے اور فالتالیات سے مراد انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کی آیات کو پڑھنے والے فرشتے مراد ہیں۔

صفا الصافات کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جسے تاکید کے لئے لائے ہیں ایسے زجرا زاجرات کا مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہے جسے زاجرات کی تاکید کے لئے لائے ہیں اور ذکرا تالیات کا مفعول بہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ بھی صفا اور زجرا کی طرح مفعول مطلق ہو۔ ❷

امام زمخشری فرماتے ہیں کہ فالزاجرات زجرا اور فالتالیات ذکرا دونوں میں فا وجوہِ ترتیب صفات کے لیے ہے یا فضیلت میں ان کے موصوفوں کی ترتیب بتانے کے لیے ہے

---

❶ صحیح مسلم

❷ تفسیر قاسمی

یعنی پہلے درجے والے صافات پھر زاجرات پھر تالیات ہیں۔ ❶

علامہ شنقیطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فاء کے ساتھ ترتیب صرف ترتیب ذکری کے لئے ہے یہ اسلوب کئی مقامات پر قرآن مجید میں آیا ہے اور کلام عرب میں بھی بہت ہے۔ ❷

امام ناصر الدین المالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صورت الصّٰفّٰت کی ان آیات میں سیبویہ اور خلیل کے مذہب کی دلیل ہے کہ واللیل اذا یغشی والنھار اذا تجلی آیات میں دوسری واؤ عطف کے لئے ہے قسم کے لئے صرف پہلی واؤ ہے ان دونوں کے علاوہ نحوی کہتے ہیں کہ دوسری واؤ بھی قسم کی ہے سورت الصّٰفّٰت میں فالزاجرات اور فالتالیات میں فا کا واؤ کی جگہ آنا جب کہ دونوں کا معنی ایک ہے مگر واؤ کی بجائے فاء ترتیب کا فائدہ دیتی ہے اس میں واضح دلیل ہے کہ قسم کے مواقع میں پہلی واؤ قسم کے لئے بعد میں آنے والی واؤ عطف کیلئے ہے۔ ❸

والصّٰفّٰت صفا میں واؤ قسم کے لئے ہے اور فالزاجرات اور فالتالیات میں فاء عطف کے لئے ہے۔

صٰفّٰت، زاجرات، تالیات مقسم بہ ہیں اور ان الھکم لواحد مقسم علیہ یعنی جواب قسم ہے اور رب السموات والارض وما بینھما ورب المشارق کے متعلق تین قول ہیں راجح یہ ہے کہ یہ اِنَّ کی دوسری خبر ہے اور جواب قسم ہے دوسرا قول یہ ہے لواحد سے بدل ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ مقدر مبتدا ھو کی خبر ہے۔

رب المشارق میں لفظ رب کا تکرار اس لیے ہے کہ مشارق میں ربوبیت کے آثار نہایت نمایاں ہیں اور روزانہ نئے ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان ان الھکم لواحد کی تاکید قسم کھا کر اور پھر اِنَّ اور لام

---

❶ الکشاف

❷ اضواء البیان

❸ الانتصاف بر حاشیہ الکشاف

تاکید لاکر اس لیے کی ہے کہ کفار ایک معبود ہونے کے سخت انکاری تھے اور اس پر انہیں بہت تعجب تھا جیسے سورت ص میں کفار کا قول ہے۔

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ (ص ۵)

کیا اس نے سارے معبودوں کا ایک ہی معبود کر دیا ہے واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔

فرشتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اللہ عزوجل نے سورت المدثر میں فرمایا:

﴿وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا هُوَ﴾ (المدثر ۳۱)

''تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

رب تعالیٰ کے لشکر تو اتنے ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں صرف فرشتے ہی اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ ستر ہزار فرشتے روزانہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بیت المعمور میں داخل ہوتے ہیں پھر قیامت تک ان کی باری نہیں آئے گی۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آسمانوں میں چار انگلی کے بقدر جگہ ایسی نہیں ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کوئی فرشتہ نہ کر رہا ہو[1]

سورت صافات مکی ہے دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا بنیادی موضوع ایمانیات ہے مشرکین کے عقائد کی تردید ہے۔ مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ عزوجل کی بیٹیاں کہا کرتے تھے اس سورت میں شرک کی اس خاص قسم کی تردید نمایاں کی ہے سورت کے شروع میں فرشتوں کی قسم کھا کر ان کے وہ اوصاف بیان کیے جن سے ان کی مکمل بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کے ان اوصافِ بندگی پر غور کرو گے تو وہ خود تمہارے سامنے اس بات کی گواہی دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ باپ بیٹی کا نہیں بلکہ بندہ و آقا ہے صرف اللہ عزوجل ہی حقیقی معبود ہے اور آسمانوں و زمین اور ان کا مابین مغربوں اور مشرقوں کا پروردگار ہے۔

---

[1] جامع الترمذی

فرشتوں کے اعمال وفرائض کو اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہی جانتا ہے یہاں ان کی تین اقسام صافات، زاجرات، تالیات کی اللہ تعالیٰ نے قسم اپنی توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت پر کھاتی ہے اس وسیع وعریض کائنات کا فرشتوں کے ذریعہ انتظام محکم اس پر شاہد ہے کہ انسان کا معبود حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے اوران کا معبود ہی زمین وآسمان اوران کے مابین چیزوں اور مغربوں اور مشرقوں کا پروردگار ہے۔

یہ کائناتِ ارضی وسماوی جو بندوں کے گردو پیش میں قائم ہے یہ انہیں معبود کی وحدانیت بتاتی ہے۔ وہی اس عظیم کائنات کا رب ومدبر ہے۔ اس ارضی وسماوی کائنات کی ضخامت' عظمت' تنوع' جمال' تناسق ایسا حیران کن ہے کہ کوئی دلِ بیدار اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اگر انسان کا دل مردہ ہو تو دوسری بات ہے ورنہ خود یہ کائنات اور اس کی چیزیں ہی وجودِ باری تعالیٰ اور توحیدِ الٰہی پر دلالت کرتی ہیں۔ رب المشارق جو فرمایا گیا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ ہر ستارے اور ہر سیارے اور ہر آسمانی کرے کا ایک ایک الگ مشرق ہے یوں ثابت ہوتا ہے کہ آسمانوں کی کھلی فضاؤں میں بے شمار مشارق ہیں یہ تو اس تعبیر کا ایک معنی ہے۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ ہماری اس زمین کے نقطہ نگاہ سے جو سورج کے گرد چکر کاٹتی ہے اس کے بہت سے علاقوں کے مشارق مختلف ہیں اور اسی طرح مغارب یکے بعد دیگرے اس چکر سے ہر وقت پیدا ہوتے رہتے ہیں جو کوئی حصہ زمین سورج کے سامنے آتا ہے تو اس حصے کا وہ صرف مشرق ہوتا ہے اور اس کے مدمقابل جو کرہ زمین کا علاقہ ہے وہاں مغرب ہوتا ہے پھر اگلا مشرق سورج کے سامنے آتا ہے اور اس کے مقابلے میں مغرب اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اور یہ علمِ ہیئت ہے جس کو لوگ نزولِ قرآن کے زمانے مین نہیں جانتے تھے مگر ان لفظوں مشارق اور مغارب کے ساتھ قرآن نے انہیں اس کا تصور دلایا تھا۔

مشارق ومغارب کا یہ دقیق نظام جو دنیا میں چل رہا ہے اور طلوع کے وقت مشرق میں

جو خوبصورت نظارہ ہوتا ہے اگر انسان اس پر تھوڑا سا غور کرے تو قلبِ بشری پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے اور خالقِ کائنات اور موجد و مدبرِ کائنات کے وجود اور اس کی توحید کا ایک واضح نشان ہے۔ سوچنے دیکھنے والا اسے دیکھ کر ایمان کا اعلان کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ ❶

فرشتوں کا عالیشان نظام جو ہمیں نہیں نظر آتا ہے پوری کائنات کا نظام چلانے والے ہیں وہ توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت کے شاہد صادق ہیں۔ ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرمانروا ہی انسانوں کا اصل معبود ہے اور وہی درحقیقت معبود ہو سکتا ہے اور اسی کو معبود ہونا چاہیے یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ اب کوئی دوسرا اور الٰہ ہو جائے۔

عبادت کی بنیادی وجہ بھی یہ ہے کہ آدمی کا نفع و ضرر اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا پورا ہونا اس کی قسمت کا بگڑنا، سنورنا بلکہ بجائے خود اس کا وجود و بقا ہی جس کے اختیار میں ہے اس کی بالاتری تسلیم کرنا اور اس کے آگے جھکنا آدمی کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اس وجہ کو آدمی سمجھ لے تو خود بخود اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ اختیارات والے کی عبادت نہ کرنا اور بے اختیار کی عبادت کرنا دونوں صریح عقل و فطرت کے خلاف ہے۔

عبادت کا استحقاق پہنچتا ہی اس کو ہے جو اقتدار رکھتا ہے۔ بے اقتدار ہستیاں تو وہ نہ اس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے اور نہ ان کی عبادت کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے۔ کیونکہ ہماری درخواست پر کوئی کاروائی کرنا سرے سے ان کے اختیار میں ہے ہی نہیں۔ ان کے سامنے عاجزی و نیازی کے ساتھ جھکنا اور ان سے دعائیں مانگنا ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے جائے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کی بجائے دوسرے سائلین وہاں درخواستیں لیے کھڑے ہوں انہی میں سے کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔ ❷

---

❶ ظلال القرآن

❷ تفہیم القرآن

(۱۱) سورت ص

﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ﴾

''ص، قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی۔''

ذی الذکر کے دو معنی ہیں (۱) نصیحت والے (۲) شان اور مرتبت والے قرآن کی قسم۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں دونوں معنی صحیح ہیں اس لیے کہ قرآن عظمت و شان کا بھی حامل ہے اور اہل ایمان وتقویٰ کے لیے نصیحت اور درسِ عبرت بھی ہے۔

اس آیت کریمہ میں واؤ حرف قسم ہے اور القرآن ذی الذکر مقسم بہ ہے مقسم علیہ یعنی جواب قسم کے بارے مفسرین کا اختلاف ہے بعض کہتے ہین کہ جواب قسم مذکور ہے پھر اس کی تعیین میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ جوابِ قسم سورت ص کی آیت ان ذلك لحق تخاصم اهل النار ہے اور بعض کہتے ہیں: ان هذا لرزقنا ماله من نفاد جواب قسم ہے اور بعض ان كل الاكذب الرسل فحق عقاب کو جواب قسم مانتے ہیں اور بعض كم اهلكنا من قبلهم کو جس کے شروع سے لام طوالتِ کلام کی وجہ سے حذف کر دیا ہے اصل میں لکم۔ اور بعض مفسرین ص کو جواب قسم مانتے ہیں جو صدق الله یا صدق محمد ﷺ کا مخفف ہے اور قسم سے مقدم آیا ہے۔ بعض مفسرین والقران ذی الذکر قسم کا مقسم علیہ محذوف مانتے ہیں۔ لیکن محذوف کے مقدر کرنے میں اختلاف ہے زمخشری انه لمعجز مقدر مانتے ہیں۔ ابن عطیہ وغیرہ ما الامر کما یقوله الکفار کو مقدر مانتے ہیں۔ علامہ شنقیطی فرماتے ہین قرآن کریم کے استقراء اور تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ درست بات یہ کہ جوابِ قسم محذوف ہے اور محذوف عبارت ما الأمر کما یقوله الکفار ہے یعنی نصیحت بھرے قرآن کی قسم معاملہ ویسے نہیں جیسے کفار کہتے ہیں۔

مقسم علیہ ما الامر کما یقولہ الکفار جس کی نفی پر قسم کھائی گئی ہے یہ تین چیزوں کو شامل ہے جو آپس میں لازم وملزوم ہیں۔

(۱) نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں کفار جو آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں معاملہ اس طرح نہیں ہے۔

(۲) معبودِ حقیقی صرف ایک اللہ عزوجل ہیں کفار جو توحیدِ الوہیت کے منکر ہیں معاملہ اس طرح نہیں۔

(۳) اللہ عزوجل مرنے والوں کو دوبارہ اٹھائے گا کفار جو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا سختی سے جو انکار کرتے ہیں معاملہ اس طرح نہیں ہے۔

سورت ص میں مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی دلیل اللہ عزوجل کا فرمان بل الذین کفروا فی عزۃ وشقاق ہے کیونکہ حرف بل کے ساتھ اضراب مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی واضح دلیل ہے۔[1]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اکثر مفسرین کہتے ہیں ص والقرآن ذی الذکر کا جواب قسم محذوف القرآن لحق ہے۔[2]

مولانا مودودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر ص کو ان حروف مقطعات میں سے سمجھا جائے جن کا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا تو پھر قسم کا جواب محذوف ہے جس پر بلکہ اور اس کے بعد کا فقرہ خود روشنی ڈالتا ہے یعنی پوری عبادت پھریوں ہوگی کہ ان منکرین کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ جو دین ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس میں کوئی خلل ہے یا محمد ﷺ نے ان کے سامنے اظہارِ حق میں کوئی کوتاہی کی ہے بلکہ اس کی وجہ صرف ان کی جھوٹی شیخی ان کی جاہلانہ نخوت اور ان کی ہٹ دھرمی ہے اور اس پر یہ نصیحت بھرا قرآن شاہد ہے جسے دیکھ کر ہر غیر متعصب آدمی تسلیم کرے گا کہ اس میں فہمائش کا حق پوری طرح ادا کر دیا گیا ہے۔[3]

---

[1] اضواء البیان جلد ٦ صفحہ ٣٢٦ [2] التبیان فی اقسام القرآن

[3] تفہیم القرآن

(۱۲) سورت الزخرف

﴿حٰمٓ ٥ وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ٥ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥ وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ﴾

(الزخرف ۱ تا ۴)

''حم۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تا کہ تم لوگ اسے سمجھو۔ اور درحقیقت یہ ام الکتب میں ہمارے پاس بہت بڑے بلند مرتبے والی اور حکمت سے لبریز کتاب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کے عربی ہونے کا بہت سی آیات میں ذکر فرمایا ہے ارشاد فرمایا:۔

﴿الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ٥ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥﴾ (یوسف ۱. ۲)

''ا ل ر۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ہم نے اسے عربی زبان مین قرآن بنا کر نازل کیا تا کہ تم اسے سمجھ سکو۔''

نیز ارشاد فرمایا:

﴿حٰمٓ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ٥ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا فَاَعْرَضَ اَکْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ٥﴾ (حم السجدہ: ۱ تا ۳)

''ح م۔ رحمان ورحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں عربی زبان کا قرآن ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں بشارت دینے والا اور ڈرانے والا پس اکثر لوگوں نے روگردانی کی

پس وہ سنتے نہیں ہیں۔

اور قرآن مجید کے ام الکتب یعنی لوح محفوظ میں ہونے کا ذکر سورت البروج میں بھی ہے ارشاد فرمایا:۔

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ٥فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ٥﴾(البروج ۲۱.۲۲)

''بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے لوح محفوظ میں ثبت ہے۔''

زیرِ تفسیر سورت الزخرف کی آیات میں واوٗ حرف قسم ہے اور الکتب المبین مقسم بہ ہے بعد والی دونوں آیات مقسم علیہ یعنی جوابِ قسم ہیں۔

قرآن مجید کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف ہم خود ہیں نہ کہ محمد ﷺ اور قسم کھانے کے لیے قرآن کی جس صفت کا انتخاب کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتاب مبین ہے اس صفت کے ساتھ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر خود قرآن کی قسم کھانا آپ سے آپ یہ معنی دے رہا ہے کہ لوگو یہ کھلی کتاب تمہارے سامنے موجود ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو اس کے صاف صاف غیر مبہم مضامین اس کی زبان اس کا ادب اس کی حق و باطل کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دینے والی تعلیم یہ ساری چیزیں اس حقیقت کی صریح شہادت دے رہی ہیں کہ اس کا مصنف رب العالمین کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔

پھر یہ جو فرمایا کہ ہم نے اسے عربی کا قرآن کا بنایا ہے تا کہ تم اسے سمجھو اس کے دو مطلب ہیں۔ایک یہ کہ یہ کسی غیر زبان میں نہیں ہے بلکہ تمہاری اپنی زبان میں ہے اس لیے اسے جانچنے پرکھنے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں تمہیں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔اگر یہ کسی عجمی زبان میں ہوتا تو تم یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم اس کے کلامِ الٰہی ہونے نہ ہونے کی جانچ کیسے کریں؟ جب کہ یہ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آرہا ہے لیکن یہ عربی قرآن کے متعلق تم یہ عذر کیسے کر سکتے ہو اس کا ایک ایک لفظ تمہارے لیے واضح ہے اس کی ہر عبارت اپنی زبان اور اپنے مضمون دونوں کے لحاظ سے تم پر روشن ہے خود دیکھ لو کہ کیا یہ محمد

ﷺ کا یا کسی دوسرے عرب کا کلام ہو سکتا ہے؟ دوسرا مطلب اس ارشاد کا یہ ہے کہ اس کتاب کی زبان ہم نے عربی اس لیے رکھی ہے کہ ہم عرب قوم کو مخاطب کر رہے ہیں اور وہ عربی زبان کے قرآن کو ہی سمجھ سکتی ہے۔ عربی میں قرآن نازل کرنے کی اس صریح معقول وجہ کو نظر انداز کر کے جو شخص صرف اس بنا پر اسے کلامِ الٰہی کی بجائے کلام محمد قرار دیتا ہے کہ محمد ﷺ کی مادری زبان بھی عربی تھی تو وہ بڑی زیادتی کرتا ہے۔

ام الکتاب سے مراد اصل کتاب ہے یعنی وہ کتاب جس سے تمام انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والی کتابیں ماخوذ ہیں۔ اسے سورت الواقعہ میں کتاب مکنون اور سورت البروج میں لوح محفوظ کہا گیا ہے قرآن کے متعلق یہ فرما کر کہ یہ ام الکتب میں ہے ایک اہم حقیقت پر متنبہ فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زبانوں میں مختلف ملکوں اور قوموں کی ہدایت کے لیے مختلف انبیاء علیہم السلام پر مختلف زبانوں میں کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ مگر ان سب میں دعوت ایک ہی عقیدے کی طرف دی گئی ہے حق ایک ہی سچائی کو قرار دیا گیا ہے خیر وشر کا معیار ایک ہی پیش کیا گیا ہے اخلاق وتہذیب کے یکساں اصول بیان کیے گئے ہیں اور فی الجملہ ایک ہی دین ہے جسے یہ سب کتابیں لے کر آئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سب کا اصل ایک ہے اور صرف عبارتیں مختلف ہیں۔

لدينا لعلي حكيم اس فقرے کا تعلق کتاب مبین سے بھی ہے اور ام الکتب سے بھی یعنی یہ تعریف قرآن کی بھی ہے اور اس اصل کتاب کی بھی جس سے یہ قرآن منقول یا ماخوذ ہے اس تعریف سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ کوئی شخص اپنی نادانی سے اس کتاب کی قدر ومنزلت نہ پہنچانے اور اس کی حکیمانہ تعلیم سے فائدہ نہ اٹھائے تو یہ اس کی اپنی بد قسمتی ہے اگر اس کی حقیقت کو گرانے کی کوشش کرے اور اس کی باتوں میں کیڑے ڈالے تو یہ اس کی اپنی رذالت ہے کسی کی ناقدری سے یہ بے قدر نہیں ہو سکتی اور کسی کے خاک ڈالنے سے اسکی حکمت چھپ نہیں سکتی یہ تو بجائے خود ایک بلند مرتبہ کتاب ہے جسے اس کی بے نظر تعلیم، اس کی معجزانہ بلاغت، اس کی بے عیب حکمت اور اس کے عالیشان مصنف کی شخصیت

نے اسے بلند کیا ہے یہ کسی کے گرانے سے کیسے گر جائے گی۔ آگے چل کر اسی سورت کی آیت ۴۴ میں قریش کو خاص طور پر اور اہل عرب کو بالعموم یہ بتایا گیا ہے کہ جس کتاب کی تم اس طرح ناقدری کر رہے ہو اس کے نزول نے تم کو ایک بہت بڑے شرف کا موقع عطا کیا ہے جسے اگر تم نے کھو دیا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہیں سخت جواب دہی کرنی ہوگی۔ [1]

اللہ عز و جل نے قرآن مجید کو عربی زبان میں اتارا کیونکہ اپنی آخری رسالت کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے اس نے عربوں کو چنا تھا وہ قرآن مجید کے مخاطب اول تھے ان کے مناسب عربی زبان تھی تا کہ وہ صحیح طور پر اس کو سمجھ سکیں اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ اس عربی زبان میں اس کے آخری پیغام کو اٹھانے اور ساری دنیا تک پہنچانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسی طرح ان عربوں میں بھی قابلیت موجود تھی کہ وہ قرآن کو اپنا دستور العمل بنائیں اور پھر ساری دنیا کو اس کے سامنے جھکا دیں اور اللہ عز و جل خوب جانتے ہیں کہ اپنی رسالت کو کہاں بھیجے؟

والکتب المبین میں مبین متعدی اور لازم دونوں طرح ہوسکتا ہے متعدی ہو تو اس کا معنی ہے ہدایت کے راستوں کو ظاہر کرنے والا اور اگر لازم مانیں تو واضح اور ظاہر معنے والا ہوگا۔ امام زمخشری فرماتے ہیں کہ یہ قسم نہایت خوبصورت اور عمدہ ہے کیونکہ قسم اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت ہے اور یہ دونوں ایک ہی وادی سے ہیں۔ [2]

وانہ فی ام الکتاب اس جملہ کا مقسم علیہ جملہ پر عطف ہے یعنی یہ بھی جواب قسم بنتا ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے جو پہلے جملہ کو ثابت کر رہا ہے۔ [3]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں لدینا کا تعلق ام الکتاب کے ساتھ بھی جائز ہے یعنی قرآن مجید اس کتاب میں ثبت ہے جو ہمارے ہاں ہے حضرت ابن عباس نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا تعلق لعلی حکیم خبر کے ساتھ ہو یعنی یہ قرآن مجید ہمارے

---

[1] تفہیم القرآن

[2] الکشاف [3] فتح القدیر

نزدیک نہایت بلند مرتبہ اور پراز حکمت ہے اس کی تکذیب کرنے والے جیسا سمجھتے ہیں ایسا نہیں ہے یعنی اگر تم اس کی تکذیب کرو اور اس کا انکار کرو تو تمہاری مرضی ہمارے ہاں تو اس قرآن کو بہت رفعت اور شرف اور پختگی حاصل ہے۔ ❶

سنن نسائی و مستدرک حاکم وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ کی صحیح روایتیں ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ لیلۃ القدر میں ایک دفعہ سارا قرآن مجید لوح محفوظ سے اول آسمان پر اترا اور پھر آہستہ آہستہ تیئیس سال تک رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔ ❷

فائدہ سورت الزخرت کی آیت:

﴿ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾(الزخرف ۸۸)

میں زمخشری وقیلہ میں واؤ کے قسمیہ ہونے کو ترجیح دیتے ہیں اور جمہور مفسرین واؤ کو عاطفہ ٹھہراتے ہیں۔

(۱۳) سورت الدخان

﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝﴾(الدخان ۱ تا ۸)

”حم۔ قسم ہے اس کتابِ مبین کی کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یہ وہ رات

---

❶ بدائع التفاسیر بحوالہ شفاء الغلیل

❷ احسن التفاسیر

تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے تیرے رب کی رحمت کے طور پر یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہے اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے تمہارا رب اور تمہارے ان اسلاف کا رب جو پہلے گزر چکے ہیں۔''

کتابِ مبین کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف محمد ﷺ نہیں ہیں بلکہ ہم ہیں اور اس کا ثبوت کہیں اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں خود یہ کتاب ہی اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ تم لوگ اس قرآن کو محمد ﷺ کی تصنیف سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو یہ کتاب تو اپنی ذات میں خود اس امر کی بین شہادت ہے کہ یہ کسی انسان کی نہیں بلکہ خداوندِ عالم کی کتاب ہے۔ تم اس کتاب کی قدر و قیمت سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو تمہارے نزدیک یہ ایک بلا ہے جو تم پر نازل ہوگئی ہے حالانکہ درحقیقت وہ گھڑی انتہائی مبارک گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے سراسر رحمت کی بنا پر تمہارے ہاں اپنا رسول بھیجنے اور اپنی کتاب، نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

تم اپنی نادانی سے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ اس رسول اور اس کتاب سے لڑ کر تم جیت جاؤ گے حالانکہ اس رسول کی بعثت اور اس کتاب کی تنزیل اس ساعتِ خاص میں ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ قسمتوں کے فیصلے فرمایا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے بودے نہیں ہوتے کہ جس کا جی چاہے انہیں بدل ڈالے نہ وہ کسی جہالت و نادانی پر مبنی ہوتے ہیں کہ ان میں غلطی اور خامی کا کوئی احتمال ہو وہ تو اس فرمانروائے کائنات کے پختہ اور اٹل فیصلے ہوتے ہیں جو سمیع و علیم اور حکیم ہے ان سے لڑنا کوئی کھیل نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو تم خود بھی زمین و آسمان اور کائنات کی ہر چیز کا مالک و پروردگار مانتے ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ زندگی و موت اسی کے اختیار میں ہے مگر اس کے باوجود تمہیں دوسروں کو معبود

بنانے پر اصرار ہے اور اس کے لیے حجت تمہارے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ باپ دادا کے وقتوں سے یہی کام ہوتا چلا آ رہا ہے حالانکہ اگر کوئی شخص شعور کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ ہی مالک و پروردگار اور زندگی موت کا مختار ہے تو اسے کبھی یہ شبہ تک لاحق نہیں ہو سکتا کہ معبود ہونے کے مستحق اس کے سوا یا اس کے ساتھ دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ تمہارے باپ دادا نے اگر یہ حماقت کی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ تم بھی آنکھیں بند کر کے اس کا ارتکاب کرتے چلے جاؤ حقیقت میں تو ان کا رب بھی اکیلا وہی رب العالمین تھا جو تمہارا رب ہے اور انہیں بھی اس ایک کی بندگی کرنی چاہیے تھی جس کی بندگی تمہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ورحمت کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ تمہارا پیٹ پالے بلکہ یہ بھی ہے کہ تمہاری رہنمائی کا انتظام کرے اسی رہنمائی کے لیے اس نے رسول بھیجا ہے اور کتاب نازل کی ہے۔

وہ بڑی خیر و برکت والی رات تھی جس میں اسے نازل کیا گیا یعنی نادان لوگ جنہیں اپنی بھلائی برائی کا شعور نہیں ہے اس کتاب کی آمد کو اپنے لیے بلائے ناگہانی سمجھ رہے ہیں۔ اور اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر مین غلطاں و پیچاں ہیں۔ لیکن درحقیقت ان کے لیے اور تمام نوعِ انسانی کے لیے وہ ساعت بڑی ہی سعید تھی جب ہم نے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے یہ کتاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس رات میں قرآن مجید نازل کرنے کا مطلب بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ نزولِ قرآن کا سلسلہ اس رات شروع ہوا اور بعض مفسرین اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس میں پورا قرآں ام الکتاب سے منتقل ہو کر حاملینِ وحی فرشتوں کے حوالہ کر دیا گیا اور پھر وہ حالات و وقائع کے مطابق حسبِ ضرورت نبی ﷺ پر ۲۳ سال تک نازل کیا جاتا رہا۔ صحیح صورت معاملہ کیا ہے اسے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اس رات سے مراد وہی رات ہے جسے سورت القدر میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔

﴿اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝﴾

اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ پھر یہ بات بھی قرآن مجید ہی

میں بیان کر دی گئی ہے کہ وہ ماہِ رمضان کی ایک رات تھی شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن۔

حکیم کے دو معنی ہیں ایک وہ حکم جو سراسر حکمت پر مبنی ہوتا ہے کسی غلطی یا خامی کا اس میں کوئی امکان نہیں دوسرے کہ وہ ایک پختہ اور محکم فیصلہ ہوتا ہے اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں۔

لیلۃ القدر کی رات ملائکہ اور جبرئیل اپنے رب کے اذن سے ہر طرح کا حکم لے کر اترتے ہیں اللہ تعالیٰ کے شاہی نظم ونسق میں یہ ایک ایسی رات ہے جس مین وہ افراد اور قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے کر کے اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر وہ انہی فیصلوں کے مطابق عملدر آمد کرتے رہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے لیلۃ مبارکہ سے نصف شعبان کی رات مراد لی ہے لیکن جمہور مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ رمضان کی وہی رات ہے جسے لیلۃ القدر کہا گیا ہے اس لیے کہ قرآن مجید خود اس کی تصریح کر رہا ہے۔ اور جہاں قرآں مجید کی صراحت موجود ہو وہاں کوئی دوسری رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہین کہ عثمان بن محمد کی جو روایت امام زہری نے شعبان سے شعبان تک قسمتوں کے فیصلے ہونے کے متعلق نقل کی ہے وہ ایک مرسل روایت ہے اور ایسی روایات نصوص کے مقابلے میں نہیں لائی جا سکتیں۔ قاضی ابن العربی کہتے ہیں کہ نصف شعبان کے متعلق کوئی حدیث قابلِ اعتماد نہیں ہے نہ اس کی فضیلت کے بارے میں اور نہ اس امر کے بارے میں کہ اس رات قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں لہٰذا ان کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے۔ ❶

شعبان کی پندرہویں رات کی بابت جتنی بھی روایات آتی ہیں اس کی فضیلت کے بیان یا ان میں اس رات کے فیصلے کی رات کہا گیا ہے تو یہ سب روایات سنداً ضعیف ہیں یہ قرآن کی نص صریح کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہیں۔ ❷

---

❶ تفہیم القرآن ❷ احسن البیان

فائدہ: صحیح جامع صغیر میں حدیث نمبر ۱۴۹۷ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا براہیم علیہ السلام کے صحیفے ماہ رمضان کی پہلی رات اترے اور تورات رمضان کی چھٹی رات نازل کی گئی اور انجیل ماہ رمضان کی تیرہویں رات کو نازل کی گئی اور زبور رمضان کی اٹھارویں رات کو نازل کی گئی اور قرآن رمضان کی چوبیسویں رات کے گزرنے پر نازل ہوا۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر حسن کا حکم لگایا ہے۔

﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾

مشیتِ تکوینی کو جس طرح پر جس کام کی انجام دہی منظور ہوتی ہے وہ اسی متعین طور پر ملائکہ متعلقہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے بشری حساب وتخمینہ کے حساب سے یہ ایک سال کی مدت کے لئے ہوتا ہے۔ ہر حکمت والے معاملے سے یہ مراد نہیں کہ کچھ معاملے حکمت والے نہیں ہوتے با حکمت تو سب ہی معاملات ہوتے ہیں حکیم کی قید قیدِ واقعی ہے۔

حکیم کا دوسرا معنی محکم ومضبوط ہے اللہ تعالیٰ کے اٹل قوانین سالانہ کے اجراء کا وقت یہی ہوتا ہے۔ امر کے صیغہ کا نکرہ ہونا اظہار عظمت وشان کے لئے ہے امر کے ساتھ حکیم کا اضافہ خود ہی اظہار عظمت وجلالت کے لئے تھا پھر اس پر امرا من عندنا کے مزید اضافہ نے اس عظمت وجلالت کو اور کئی گنا بڑھا دیا۔

اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ہر نعمت بڑی ہی نعمت ہے لیکن اس کی ساری بڑی نعمتوں میں اگر کوئی نعمت سب سے بڑی قرار دی جاسکتی ہے تو یہ کہ اس نے ہر تاریکی کو روشن کرنے، ہر کجی کو درست کرنے، ہر پستی کو بلند کرنے، ہر مرض کو شفا دینے، ہر دکھ کو مٹا دینے کے لئے، ہر موسم اور ہر زمانہ ہر خطہ اور ہر ملک، ہر قوم اور ہر امت، ہر فرد اور ہر جماعت، ہر مرد اور ہر عورت، ہر بوڑھے اور ہر جوان کے ہاتھ میں ایک کامل ومکمل ہدایت نامہ اور ایک جامع ومفصل دستور العمل دے دیا ہے جس کے بعد کسی انسان کو کسی علم وفن کسی حکمت وصنعت کی، استاذ ومرشد کی، مدرسہ اور مکتب کی قطعاً کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

جس گھڑی اس آفتابِ ہدایت کا طلوع ہوا ہے وہ وقت رات کا تھا اس مبارک رات

کی بزرگیوں اور سعادتوں کا کوئی انسانی دماغ احاطہ کرسکتا ہے؟ جس شب مبارک کو خود خالقِ لیل ونہار شب مبارک ارشاد فرمائے کس بشر کے قلم میں یہ قوت ہے کہ اس کی کرامتوں اور فضیلتوں کی شرح کر سکے؟ کوئی لفظ کوئی عبارت کوئی عنوان تحریر ایسا ممکن ہے جو اس پاک رات کی پاکیزگیوں اور ستھرائیوں، رحمتوں اور برکتوں، نعمتوں اور دولتوں کی تفسیر کے لئے کافی ہو سکے؟ پھول بہار ہی میں کھلتے ہیں کلیاں بہار ہی میں پھوٹتی ہیں گلستانِ دہر اور چمنِ حیات کے لئے اس سب سے خوش رنگ، شاداب اور دلکش پھول کے اس سدا بہار پھول نے اپنی عطر بیزیوں سے اہلِ ذوق کے مشامِ جان کو معطر کیا۔

شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن یہ رمضان کا وہی مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔

اسی مبارک ماہ کی ایک شب تھی جب اس شاہدِ رعنا نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹا ہے ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اسے ایک شب مبارک میں اتارا ہے انا انزلناه فی ليلة مباركة انا كنا منذرين الخ ہم ہمیشہ اسی طرح ڈراتے رہے ہیں اسی شب میں ہر حکمت والی بات کا فیصلہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہ حکم بھی ہماری ہی طرف سے ہے اور ہم ہمیشہ بھیجتے ہی رہتے ہیں یہ تیرے رب کی طرف سے رحمت ہی ہے جو سب کچھ سننے والا اور جاننے والا آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا وہی پروردگار ہے اگر تم یقین رکھتے ہو۔ وہی معبود جس کے سوا کوئی معبود نہیں زندگی اور موت سب اس کے ہاتھ میں ہے اور وہی رب ہے تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا۔

امر حکیم سے مراد سب کو ربوبیت کے قانون سے آگاہ کر دیا جائے اور سب کی زندگی اور موت کے اصول بتائے جائیں۔ قرآن حکیم کا اصلی کام یہی ہے اور اس کی تعلیم تربیت کے قانون کی تشریح وتوضیح کرتی ہے اور افراد واقوام کو زندگی بخشتی ہے۔ نزول قرآن اسی معنی میں دنیا کے لئے سب سے بڑی رحمت اور نعمت ہے یہی سبب ہے بڑی رحمت شب مبارک کو نازل ہوئی تھی اور اسی کی یادگار میں اسی کے ماتحت ہر سال اسی شب کو جزئیات و

تفصیلات سے متعلق ہر امر حکیم ہر حکمت والی بات کا نزول وتصفیہ ہوتا رہتا ہے۔

جس مبارک رات کو قرآن جیسی بے نظیر نعمت دنیا کی ملی ہو آسمانوں اور زمینوں کے فرمانروا نے خاک کے پتلے کو اپنے محفوظ کلام کے شرف سے سرفراز کیا ہو اس کی رحمتوں اور برکتوں کا احاطہ کرنا انسانی دماغ کے تراشے ہوئے علم الحساب کے اعداد سے بھلا کس طرح ممکن ہے؟

یہ شبِ مبارک کب آتی ہے؟ روح وجان کے عالم میں بہار کے موسم کا نام ماہِ رمضان ہے اس ماہِ مبارک کا سب سے زیادہ مبارک زمانہ اس کا آخری عشرہ ہوتا ہے پھول کوئی بھی کھلتا ہے چمن مہکنے لگتا ہے۔ لیکن گلاب کی کلی جب کھلتی ہے تو اس وقت چمن کی مہک ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ رمضان کا آخری عشرہ چمن میں گلاب کے کھلنے کا زمانہ ہوتا ہے پاکوں اور پاک بازوں کے سردار کا یہ عشرہ ذکر وعبادتِ الٰہی کے لئے وقف رہتا تھا (ویسے تو وہ کون سا زمانہ ہوتا تھا جب وہ عبادت الٰہی کے لیے وقف نہ ہوتا تھا) اسی عشرہ کی کسی مقدس رات میں وہ مقدس گھڑی آجاتی ہے جس کی فضیلتوں اور برکتوں کی شرح و تفصیل کے لیے لفظ وعبارت کا دفتر ناکافی ہے اس دولت بے بہا کی تلاش میں اگر انسان اپنی راتوں کی نیند بھی نہ قربان کر سکے تو یقیناً اس کے دل کو اس مبارک رات کی ذرا بھی قدر نہیں۔

اس کی تعین سے اس لیے قصداً ومصلحتاً بے التفاتی برتی گئی ہے اور وہ رات جو شام سے صبح تک سرتاسر رحمت ہی رحمت ہے اس کی بابت دنیا کا سب سے بڑا حکیم ﷺ اپنی امت سے یہ ارشاد فرما گیا ہے کہ اس کو تلاش کرو آخری عشرہ رمضان کی تاک راتوں میں۔ جن جاگے ہوئے دلوں کی آنکھیں آج ان راتوں کو کسی کی یاد میں جاگ جاگ کر کاٹیں گی کل وہ خود محسوس کرینگے کہ ان کی آنکھیں نہیں ان کا نصیبہ جاگ رہا تھا۔ [1]

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت پر اس رات میں فضل وکرم خداوندی کا ایک دروازہ کھلا تھا

[1] ماجدی

اس قسم کی رات اور کوئی بھی نہ ہو سکتی ہے اس رات میں بشریت کا اتصال عالمِ بالا سے ہوا۔
قرآن ایک کتابِ مفتوح کے طور پر انسانی قلب وضمیر کی رہنمائی کے لیے زمان ومکان کی حدود سے ماوراء موجود رہا ہے اور رہے گا اس کا اثر بے مثال ہے جادو انسان پر یہ اثر نہیں کر سکتا یہ اثر شعوری ہے جان بوجھ کر ہے علوی ہے اور اس میں رفعت وعظمت ہے یہ قرآن ہر علاقے ہر ملک وقوم، ہر زبان ومکان اور ہر معاشرے میں ایک صالح متوازن انسانی معاشرہ قائم کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف عبادات اور ادعیہ کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں اوامر و نواہی، قوانینِ سیاست، معاش، معاشرت واخلاق سب کچھ موجود ہے انسانی قوانین و دساتیر میں تصنع، جانبداری، تجاوز، ظلم وستم، غیر انسانی عناصر پائے جاتے ہیں جن سے قرآن پاک ہے۔ اسکا خطاب کسی خاص زمانے قوم ملک وملت علاقے اور حالات سے نہیں اس میں بقاء ودوام ہے جعلی حدود سے یہ ماوراء ہے اور سب انسانی تصنعات سے بری ہے اسی لیے اس قرآن کو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کن اور فرق وامتیاز قائم کرنے والا قرار دیا ہے اور اس نے انسان کو اس کی غفلت ونسیان سے بیدار کیا ہے۔ قرآن نے حق وباطل میں جدائی کی۔ درست اور نادرست عقائد میں امتیاز پیدا کیا عبادات کی صحیح شکل وصورت قائم کی اور شرک وکفر اور بدعات کو مٹایا اخلاقی فضائل ورذائل میں فرق کیا۔ انسانی معاملات میں صحیح اور غلط کا امتیاز بتایا۔ حدود مقرر کیں، قوانین قائم کیے، نشانِ راہ ٹھہرائے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی کی۔ حقوق اللہ وحقوق العباد کی تفاصیل بیان کیں۔ قرآن ایک خوبصورت اور کامل عقیدہ پیش کرتا ہے اس میں صرف جمال اور خیر و صلاح ہی نہیں بلکہ کمال وتناسق بھی پایا جاتا ہے یہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ واصل کرتا ہے اور وجودِ کبیر کائنات ارضی وسماوی کے ساتھ اس کو ملا دیتا ہے۔

احیاء واماتت دو ایسے امر ہیں جن کو سب آنکھوں سے دیکھتے ہین اور ان کا معاملہ تمام مخلوقات کی طاقت سے خارج ہے۔ ذرا سے تامل اور معمولی غور سے ہی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے زندگی کے منظر کی مانند موت کا منظر ہی اپنی ہر شکل وصورت میں انسانی قلب کو ہلا

ڈالتا ہے۔ اور اس پر شدید اثر کرتا ہے اسے دیکھ کر ہر انسان چند لمحات کے لیے تو اس دنیا اور اپنے سارے ماحول سے بیزار ہو جاتا ہے اس کے قلب ونظر میں جوش اور استجابت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اس منظر سے بہت متاثر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس کا ذکر بار بار آتا ہے اور وہ انسان کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہو اس کے شعور وادراک میں حرکت پیدا ہو اور اس کا دل نصیحت پذیری پر آمادہ ہو جائے۔ ❶

سورت الدخان کی زیر تفسیر آیات میں وحرف قسم ہے الکتاب المبین مقسم علیہ ہے اور انا انزلناہ سے لے کر الاولین تک جوابِ قسم ہے۔ بعض نحوی انا انزلناہ کو جوابِ قسم نہیں مانتے وہ اسے الکتاب المبین مقسم بہ کی صفت مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مقسم بہ کی صفت قسم کا جواب نہیں بن سکتی ان کے نزدیک جوابِ قسم انا کنا منذرین ہے اور ایک قول ہے کہ انا کنا منذرین دوسرا جواب قسم ہے اور انا کنا مرسلین والا جملہ یا تو انا کنا منذرین سے بدل ہے یا یہ تیسرا جواب قسم ہے یا یہ نیا جملہ ہے۔ ❷

سورۃ ق (۱۴)

﴿ق وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ (۱)

''ق قسم ہے قرآن مجید کی''۔

مجید عربی زبان میں دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک بلند مرتبہ، باعظمت، بزرگ اور صاحبِ عزت وشرف۔ دوسرا کریم 'کثیر العطاء' بہت نفع پہنچانے والا۔ قرآن کے لئے یہ لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال فرمایا گیا ہے۔ قرآن اس لحاظ سے عظیم ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کے مقابلے میں نہیں لائی جا سکتی اپنی زبان اور ادب کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ

❶ فی ظلال القرآن ❷ فتح البیان

ہے۔اور اپنی تعلیم اور حکمت کے لحاظ سے بھی معجزہ جس وقت وہ نازل ہوا تھا اس وقت بھی انسان اس کے مانند کلام بنا کر لانے سے عاجز تھے اور آج بھی عاجز ہیں۔اسکی کوئی بات کبھی کسی زمانے میں غلط ثابت نہیں کی جاسکی ہے نہ کی جاسکتی ہے۔باطل نہ سامنے سے اس کا مقابلہ کرسکتا ہے نہ پیچھے سے حملہ آور ہو کر اسے شکست دے سکتا ہے۔اور اس لحاظ سے وہ کریم ہے کہ انسان جس قدر زیادہ اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اسی قدر زیادہ وہ اس کو رہنمائی دیتا ہے۔اور جتنی زیادہ اسکی پیروی کرے اتنی ہی زیادہ اسے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔اس کے فوائد و منافع کی کوئی حد نہیں ہے جہاں جا کر انسان اس سے بے نیاز ہو سکتا یا جہاں پہنچ کر اسکی نفع بخشی ختم ہو جاتی ہو۔

قرآن مجید کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اسے بیان نہیں کیا گیا اس کا ذکر کرنے کے بجائے بیچ میں ایک لطیف خلا چھوڑ کر آگے کی بات بلکہ سے شروع کر دی گئی ہے۔آدمی ذرا غور کرے اور اس پس منظر کو بھی نگاہ میں رکھے جس میں یہ بات فرمائی گئی ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے۔کہ قسم اور بلکہ کے درمیان جو خلا چھوڑ دیا گیا ہے اس کا مضمون کیا ہے۔اس میں وہ اصل قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے۔کہ اہلِ مکہ نے محمد ﷺ کی رسالت کو ماننے سے کسی معقول بنیاد پر انکار نہیں کیا بلکہ سراسر غیر معقول بنیاد پر کیا ہے۔کہ ان کی اپنی ہی جنس کے ایک بشر اور ان کی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبردار بن کر آجانا ان کے نزدیک سخت قابل تعجب بات ہے۔حالانکہ تعجب کے قابل بات اگر ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی بھلائی اور برائی سے بے پروا ہو کر انہیں خبردار کرنے کا کوئی انتظام نہ کرتا یا انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے کسی غیر انسان کو بھیجتا یا عربوں کو خبردار کرنے کے لیے کسی چینی کو بھیج دیتا اس لیے انکار کی یہ بنیاد تو قطعی نامعقول ہے۔اور ایک صاحب عقل سلیم یقیناً یہ ماننے پر مجبور ہے۔کہ خدا کی طرف سے بندوں کو خبردار کرنے کا انتظام ضرور ہونا چاہیے اور اسی شکل میں ہونا چاہیے کہ خبردار کرنے والا خود انہی لوگوں میں سے کوئی شخص ہو جن کے درمیان وہ بھیجا گیا ہو اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ آیا محمد ﷺ ہی وہ شخص ہیں

جنہیں اللہ عزوجل نے اس کام کے لیے بھیجا ہے۔تو اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی اور شہادت کی حاجت نہیں یہ عظیم وکریم قرآن جسے وہ پیش کررہے ہیں اس بات کا ثبوت دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اس تشریح سے معلوم ہوجاتا ہے۔کہ اس آیت میں قرآن کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے۔کہ محمد ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور ان کی رسالت پر کفار کا تعجب بے جا ہے۔اور قرآن کے مجید ہونے کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔

والقرآن المجید قسم کے جواب کے بارے اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ جواب محذوف ہے۔بعض انه لمعجز اور بعض لتبعثن محذوف مانتے ہیں اور علامہ شنقیطی فرماتے ہیں کہ جواب قسم ما الا مر كما يقو له الكفا ر محذوف ہے یعنی اللہ تعالیٰ کفار کی تکذیب فرمارہے ہیں کہ تم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا اور معبود کے ایک ہونے کا انکار جو کرتے ہو یہ غلط ہے معاملہ اس طرح نہیں جس طرح تم کہتے ہو [1] اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا جواب محذوف نہیں ہے بلکہ سورت ق میں موجود ہے اور وہ بل عجبوا ہے اور ابن کیسان کہتے ہیں کہ جواب قسم ما يلفظ من قول ہے اور ایک قول ہے کہ جواب قد علمنا ما تنقص الأرض منهم ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورت ق میں مقسم بہ اور مقسم علیہ ایک چیز ہے اور وہ قرآن مجید ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی قسم اس بات پر کھائی ہے کہ قرآن سچا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے برحق ہے اسی لیے جواب کو حذف کردیا ہے کیونکہ قسم جواب قسم پر دلالت کرتی ہے یا اس لیے جواب کو حذف کیا ہے کہ اصل مقصود یہاں مقسم بہ ہے۔ [2]

---

[1] اضواء البیان

[2] التبيا ن فی اقسا م القر آن

(۱۵) سورت الذاریات

﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًاo فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًاo فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًاo فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا o اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ o وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ o﴾

(آیات ۱تا۶)

گرد وغبار اڑانے والی، پراگندہ کرنے والی ہواؤں اور (سمندروں سے لاکھوں کروڑوں گیلن پانی کے بخارات بادلوں کی شکل میں) اٹھانے والی ہواؤں اور بادلوں کو لے کر چلنے والی ہواؤں اور (روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیل کر اللہ تعالی کے حکم مطابق جہاں جتنا حکم ہوتا ہے) پانی تقسیم کرنے والی ہواؤں کی قسم حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جارہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہیں۔

یہ وہ بات ہے جس کی قسم کھائی گئی ہے۔اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ جس بے نظیر نظم اور باقاعدگی کے ساتھ بارش کا یہ عظیم الشان ضابطہ تمہاری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے اور جو حکمتیں اور مصلحتیں اس میں صریح طور پر کارفرما نظر آتی ہیں وہ اس بات پر گواہی دے رہی ہیں کہ یہ دنیا کوئی بے مقصد اور بے معنی گھروندا نہیں ہے جس میں لاکھوں کروڑوں برس سے ایک بہت بڑا کھیل بس یونہی الل ٹپ ہوئے جارہا ہے بلکہ یہ درحقیقت ایک کمال درجے کا حکیمانہ نظام ہے۔جس میں ہر کام کسی مقصد اور کسی مصلحت کے لیے ہورہا ہے اس نظام میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ یہاں انسان جیسی ایک مخلوق کو عقل، شعور، تمیز اور تصرف کے اختیارات دے کر اس میں نیکی وبدی کی اخلاقی حس پیدا کر کے اور اسے ہر طرح کے اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے مواقع دے کر زمین میں ترکتازیاں کرنے کیلئے محض فضول اور لایعنی طریقے سے چھوڑ دیا جائے اور اس

سے کبھی یہ باز پرس نہ ہو کہ دل و دماغ اور جسم کی جو قوتیں اس کو دی گئی تھیں دنیا میں کام کرنے کے لیے جو وسیع ذرائع اس کے حوالے کیے گیے تھے اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات اسے دیئے گئے تھے ان کو اس نے کس طرح استعمال کیا جس نظامِ کائنات میں سب کچھ با مقصد ہو اس میں صرف انسان جیسی عظیم مخلوق کی تخلیق کیسے بے مقصد ہو سکتی ہے؟

جس نظام میں ہر چیز مبنی بر حکمت ہو اس میں تنہا ایک انسان ہی کی تخلیق کیسے فضول اور عبث ہو سکتی ہے؟ مخلوقات کی جو اقسام عقل و شعور نہیں رکھتیں ان کی تخلیق کی مصلحت تو اسی عالم طبعی میں پوری ہو جاتی ہے اس لیے اگر وہ اپنی مدتِ عمر ختم ہونیکے بعد ضائع کر دی جائیں تو یہ عین معقول بات ہے کیونکہ انہیں کوئی اختیارات دیے بھی نہیں ہیں اور جس کے افعال محض عالمِ طبیعت تک محدود نہیں ہیں بلکہ اخلاقی نوعیت بھی رکھتے ہیں اور جس کے اخلاقی نتائج پیدا کرنے والے اعمال کا سلسلہ محض زندگی کی آخری ساعت تک ہی نہیں چلتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اس پر اخلاقی نتائج مترتب ہوتے رہتے ہیں۔ اسے صرف اس کا طبیعی کام ختم ہو جانے کے بعد نباتات وحیوانات کی طرح کیسے ضائع کیا جا سکتا ہے؟ اس نے تو اپنے اختیار وارادہ سے جو نیکی یا بدی بھی کی ہے اس کی ٹھیک ٹھیک مبنی بر حق و انصاف جزاء اس کو لازماً ملنی ہی چاہیے کیونکہ یہ اس مصلحت کا بنیادی تقاضا ہے جس کے تحت دوسری مخلوقات کے برعکس اس کو ایک ذی اختیار مخلوق بنایا گیا ہے اس کا محاسبہ نہ ہو اس کے اخلاقی اعمال پر جزاو سزا نہ ہو اور اس کو بھی بے اختیار مخلوقات کی طرح عمرِ طبیعی ختم ہونے پر ضائع کر دیا جائے تو لامحالہ اس کی تخلیق سراسر عبث ہو گی اور ایک حکیم سے فعل عبث کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ آخرت اور جزاو سزا کے وقوع پر ان چار مظاہر کائنات کی قسم کھانے کی ایک اور وجہ بھی ہے منکرینِ آخرت زندگی بعد الموت کو جس بنا پر غیر ممکن سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم جب مر کر خاک میں رل مل جائیں گے اور ہمارا ذرہ ذرہ جب زمین میں منتشر ہو

جائے گا ہم کیسے دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟

اس شبہ کی غلطی ان چاروں مظاہر کائنات پر غور کرنے سے خود بخود رفع ہو جاتی ہے جنہیں آخرت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورج کی شعائیں روئے زمین کے ان تمام ذخائرِ آب پر اثر انداز ہوتی ہیں جن تک ان کی حرارت پہنچتی ہے اس عمل سے پانی کے بے حد وحساب قطرے اڑ جاتے ہیں اور اپنے مخزن میں باقی نہیں رہتے مگر وہ فنا نہیں ہو جاتے بلکہ بھاپ بن کر ایک ایک قطرہ ہوا میں محفوظ رہتا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے تو یہی ہوا ان قطروں کی بھاپ کو سمیٹ لاتی ہے اس کو کثیف بادلوں کی شکل میں جمع کرتی ہے ان بادلوں کو لے کر روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وقت مقرر ہے ٹھیک اسی وقت ایک ایک قطرے کو اسی شکل میں جس میں وہ پہلے تھا زمین پر واپس پہنچا دیتی ہے۔ یہ منظر جو آئے دن انسان کی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ کہ مرے ہوئے انسانوں کے اجزائے جسم بھی اللہ تعالی کے ایک اشارے پر جمع ہو سکتے ہیں اور ان انسانوں کو اسی شکل میں پھر اٹھا کھڑا کیا جا سکتا ہے جس میں وہ پہلے موجود تھے یہ اجزاء خواہ مٹی میں ہوں یا پانی میں یا ہوا میں بہر حال رہتے اسی زمین اور اس کے ماحول ہی میں ہیں جو اللہ تعالیٰ پانی کے بخارات کو ہوا میں منتشر ہو جانے کے بعد پھر اسی ہوا کے ذریعہ سے سمیٹ لاتا ہے اور انہیں پھر پانی کی شکل میں برسا دیتا ہے اس کے لیے انسانی جسموں کے بکھرے ہوے اجزاء کو ہوا پانی اور مٹی میں سے سمیٹ لانا اور پھر سابق شکلوں میں جمع کر دینا آخر کیوں مشکل ہو؟ ❶

والذریت ذروا میں واؤ حرف قسم ہے اور الذریت ذروا اور الحملت وقرا اور الجریت یسرا اور المقسمت امرا مقسم بہ ہیں یعنی دلائل ہیں جنہیں بصورت قسم مقسم علیہ کے ثبوت کے لیے لائے ہیں ان آیات میں فاء حرف عطف ہے اور انما توعدون لصادق اور وان الدین لواقع مقسم علیہ ہیں۔

---

❶ تفہیم القرآن

(۱۶) سورت الذاریات

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُکِ ۝ اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ یُّؤْفَکُ عَنْهُ مَنْ اُفِکَ ۝﴾ (۷ تا ۹)

''قسم ہے متفرق شکلوں والے آسمان کی (آخرت کے بارے میں) تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے اس سے وہی برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے۔''

اختلافِ اقوال پر متفرق شکلوں والے آسمان کی قسم تشبیہ کے طور پر کھائی گئی ہے یعنی جس طرح آسمان کے بادلوں اور تاروں کے جھرمٹوں کی شکلیں مختلف ہیں اور ان میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی اسی طرح آخرت کے متعلق تم لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہو اور ایک کی بات دوسرے سے مختلف ہے کوئی کہتا ہے کہ یہ دنیا ازلی وابدی ہے اور کوئی کہتا ہے قیامت برپا نہیں ہوسکتی کوئی کہتا ہے کہ یہ نظام حادث ہے اور ایک وقت میں یہ جا کر ختم بھی ہوسکتا ہے مگر انسان سمیت جو چیز بھی فنا ہوگئی پھر اس کا اعادہ ممکن نہیں ہے۔

کوئی اعادے کو ممکن مانتا ہے مگر اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے اچھے برے نتائج بھگتنے کے لیے بار بار اسی دنیا میں جنم لیتا ہے کوئی جنت اور جہنم کا بھی قائل ہے مگر اس کے ساتھ تناسخ کو بھی ملاتا ہے یعنی اس کا خیال یہ ہے کہ گنہگار جہنم میں بھی جا کر سزا بھگتتا ہے اور پھر اس دنیا میں سزا پانے کیلئے جنم لیتا رہتا ہے کوئی کہتا ہے کہ دنیا کی زندگی خود ایک عذاب ہے۔ جب انسان کے نفس کو مادی زندگی سے لگاؤ باقی رہتا ہے اس وقت تک وہ اس دنیا میں مر مر کر پھر جنم لیتا رہتا ہے اور اسکی حقیقی نجات (نیروان) یہ ہے کہ وہ بالکل فنا ہو جائے۔ کوئی آخرت اور جنت جہنم کا قائل ہے مگر کہتا ہے کہ اللہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو صلیب پر موت دے کر انسان کے ازلی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا اور اس بیٹے پر ایمان لا کر

آدمی اپنے اعمالِ بد کے برے نتائج سے بچ جائے گا۔ کچھ دوسرے لوگ آخرت اور جزا و سزا ہر چیز کو مان کر بعض ایسے بزرگوں کو شفیع تجویز کر لیتے ہیں جو اللہ عز و جل کے ایسے پیارے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا زور رکھتے ہیں کہ جو ان کا دامن گرفتہ ہو وہ دنیا میں سب کچھ کر کے بھی سزا سے بچ سکتا ہے۔ ان بزرگ ہستیوں کے بارے میں بھی اس عقیدے کے ماننے والوں میں اتفاق نہیں ہے بلکہ ہر گروہ نے اپنے الگ الگ شفیع بنا رکھے ہیں یہ اختلاف اقوال خود ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ وحی و رسالت سے بے نیاز ہو کر انسان اپنے اور اس دنیا کے انجام پر جب بھی کوئی رائے قائم کی ہے علم کے بغیر قائم کی ہے ورنہ اگر انسان کے پاس اس معاملہ میں فی الواقع براہ راست علم کا کوئی ذریعہ ہوتا تو اتنے مختلف اور متضاد عقیدے پیدا نہ ہوتے۔ ❶

یو فك عنه من افك فقرے میں عنہ کی ضمیر کے دو مرجع ہو سکتے ہیں ایک جزائے اعمال دوسرے قول مختلف پہلی صورت میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جزائے اعمال کو تو ضرور پیش آنا ہے تم لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کے مختلف عقیدے رکھتے ہو مگر اس کو ماننے سے وہی شخص برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے۔

دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان مختلف اقوال سے وہی شخص گمراہ ہوتا ہے جو دراصل حق سے برگشتہ ہے۔

الحبك کے بارے مفسرین کے کئی اقوال ہین (۱) الحبك حبيكة یا حباك کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے راستوں والے آسمان کی قسم (۲) الحبک مصدر ہے اور اس کا معنی ہے خوبصورت مضبوط بناوٹ والے آسمان کی قسم ہے۔ والسماء ذات الحبك مقسم بہ ہے اور انكم لفى قول مختلف مقسم علیہ ہے۔ اور واؤ حرفِ قسم ہے۔ مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ کفار کے مختلف اقوال قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کے بارے ایسے ہی مختلف ہے جیسے کہ آسمانی راستے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ❷

---

❶ تفہیم القرآن ❷ تفسیر القاسمی

(۱۷) سورت الذاریات

﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ﴾ (۲۳)

''پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی یہ بات حق ہے ایسے ہی یقینی جیسے تم بول رہے ہو۔''

اللہ سبحانہ نے بہت بڑی چیز پر بہت عظیم چیز کی بہت بڑی قسم کھائی اور اپنی چیز کو اس قسم کے ساتھ مؤکد کیا پھر ایک محقق چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر تاکید پیدا کی جس محقق چیز میں کوئی سلیم الحس انسان شک نہیں کرتا تو فرمایا آسمان وزمین کے پروردگار کی قسم بے شک وہ البتہ حق ہے جیسے تم بولتے ہو اللہ سبحانہ وتعالی نے اپنی دی ہوئی خبر کے اثبات کو آدمی کی گفتگو اور اس کے وجود کے اثبات کے ساتھ تشبیہ دی ہے انسان کی گفتگو اپنے وجود کے لئے استدلال کی محتاج نہیں اور اس کو اپنے ناطق ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالی نے توحید' نبوت' آخرت اور اپنے ناموں اور صفات کی جو خبر دی ہے وہ نفس الامر میں حق ثابت ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہاں جو چیز سمجھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی دی ہوئی خبر کی صحیح ہونے کی شہادت دی حالانکہ وہ سب سچوں سے زیادہ سچا ہے اور اس پر اس نے قسم کھائی جبکہ وہ سب سے زیادہ قسم پورے کرنے والا ہے اور اس کو یوں پختہ کیا کہ اسکو ایک واقع چیز کے ساتھ تشبیہ دی جس میں کسی طرح شک نہیں ہوسکتا اور اس پر مشاہداتی اور برہانی دلائل قائم کر کے اسے آنکھوں کے سامنے رکھ دیا اور مشہود بالبصیرت بنا دیا خواہ آنکھوں سے نظر نہ آئے لیکن اس کے باوجود اکثر انسان اس چیز کے بارے

غفلت میں پڑے ہیں اس کی کوئی تیاری نہیں کرتے اور جو تیاری کرتے ہیں وہ بھی معمولی تیاری کرتے ہیں صرف الاقلیل اس کی صحیح تیاری کر رہے ہیں۔ اکثر لوگ تو اپنی پیدائش اور اس دنیا میں بھیجے جانے میں غور نہیں کرتے اور دار الغرور میں معمولی ٹھہرنے پر اور یہاں سے منتقل ہونے اور کوچ کر جانے پر سوچتے نہیں اور نہ یہ سوچتے ہیں کہ کہاں جا رہے ہیں اور کہاں قرار ہو گا۔ ان کو حواس دیے لیکن عقل بہت کم ہے غفلت نے گھیر رکھا ہے اور سراب جیسی آرزوؤں نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے لمبی امیدوں نے دھوکہ دیا ہے۔ گویا اس دنیا میں رہنے والا جائے گا نہیں اور اٹھا کر اس سے گویا سوال نہیں ہو گا گویا اس دنیا پر رہنے والے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب سے پر امن ہونے اور ثواب کے ساتھ کامیاب ہونے کا اشعام لکھ دیا ہے۔

نفسانی خواہشات اور حسی لذات جس طرح بھی ہو سکا اس نے حاصل کی ہیں اور جدھر سے ملی ہیں انہیں چھوڑا نہیں۔ مطالبے سے غافل، انجام سے بے خوف، جو اس کو مل کر رہے گا اس کی کوشش اور جس کا مطالبہ ہو گا اسکو چھوڑ رہے ہیں جس دنیا سے انہیں منتقل ہو جانا ہے اسے آباد کر رہے ہیں اور جدہر جا رہے ہے اسے برباد اور خراب کر رہے ہیں آخرت سے بے خبر نفسانی خواہشات نے انہیں غافل کر رکھا ہے اپنے نفسوں کی مصلحتوں پر کوئی نظر نہیں اور اپنے سفر کے زادِ راہ کی کوئی تیاری نہیں وہ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے تو اللہ تعالی نے انہیں ان کے نفس بھلا دیے یہی فاسق لوگ ہیں۔

بے پناہ تعجب ہے اس انسان کی غفلت سے جس کا ایک ایک لحظہ شمار ہو رہا ہے اور اس کے سانس گنے جا رہے ہیں اور رات دن کے سواریاں اسکو تیزی سے لے جا رہی ہیں اور اسکو کوئی غور نہیں کہ اسے کدہر اٹھا کر لے جا رہا ہے اور کس منزل میں منتقل ہو گا آنکھ کو اطمینان سے نیند کیسے آ جاتی ہے حالانکہ اسے معلوم نہیں کہ کس مقام پر اس کو اترنا ہے۔ جب موت کا وقت آتا ہے تو اپنی لذات کے ختم ہونے اور اپنی ذات کے خرابی کی بنا پر بے چین ہو جاتا ہے۔ اپنے قصور گناہ اور مرنے کے بعد اپنے برے ٹھکانہ کی وجہ سے پریشانی نہیں اور

اگر کبھی کسی کو اس کا خیال آیا بھی تو اللہ تعالیٰ کی معافی پر اعتماد کر لیتا ہے گویا اس معافی کے ملنے کا اس کو یقین ہو چکا ہے اور یہ ضروری طور پر اس کو مل کر رہے گا۔

اگر انسان اپنی عقل دماغ کو حاضر کر کے غور کر لے اور نشانیوں پر سوچے تو اپنے پیدا ہونے کا مقصد ضرور سمجھ جائے اور اس مسافر کی آنکھ راستہ کو دیکھ لے اور یہ مسافر زادِ راہ بنا لے اور بیمار دوائی حاصل کرے۔ سمجھ دار اور ہوشیار وہ ہے جو آنے والی چیز کو حاصل کرے یقینی چیز کے حاصل کرنے کا تو کہنا ہی کیا ہے اور اس کا ایمان و یقین قوی ہو جائے اور معاملہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائے لیکن ایمان کے مکانات رہنے والے مومنوں سے خالی ہو چکے ہیں اور اس کی چھتیں گر چکی ہیں۔

ابن وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے مسلم بن علی نے اوزاعی سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا کہ (سلف لوگ) فجر سے پہلے یا فجر ہونے پر نہایت خاموشی سے اپنے نفسوں پر متوجہ ہو جاتے اس وقت ان کا کوئی پیارا عرصہ دراز کے بعد آئے تو اس کی طرف بھی متوجہ نہ ہوتے سورج نکلنے تک ان کی یہی کیفیت رہتی پھر جب بعض بعض کی طرف کھڑا ہوتا اور پہلے اپنی آخرت اور انجام درست کرتے پھر فقہ میں مشغول ہوتے تھے۔ ❶

فورب السماء والارض میں واؤ حرف قسم ہے رب السماء والارض مقسم بہ ہے اور انه لحق مثل ما انکم تنطقون مقسم علیہ ہے۔ انہ کی ضمیر کے مرجع کے بارے مختلف اقوال ہیں راجح قول یہ ہے کہ وما توعدون مرجع ہے یعنی عذاب کیونکہ بعد میں تکذیب کرنے والی بعض اقوام کے عذاب کا تذکرہ ہے یعنی آسمان و زمین کے پروردگار کی قسم نبی ﷺ کی تکذیب کرنے والوں کو عذاب دینا قطعی اور یقینی ہے جیسے ان کا گفتگو کرنا یقینی امر ہے۔

---

❶ التبیان لاقسام القرآن ابن قیم

(۱۸) سورت الطّور

﴿وَالطُّوْرِ o وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ o وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ o وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ o وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ o اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ o مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ o يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَاءُ مَوْرًا o وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا o﴾ (آیات ۱ تا ۱۰)

قسم ہے طور کی اور ایک ایسی کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے اور آباد گھر کی اور اونچی چھت کی اور موجزن سمندر کی کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں (وہ اس روز واقع ہوگا) جب آسمان بری طرح ڈگمگائے گا اور پہاڑ اڑے اڑے پھیریں گے۔

والطور سے لیکر والبحر تک (واو) پانچ بار آئی ہے ان میں سے واوٴ اول قسم کی ہے اور باقی واوٴ عطف کی ہیں۔

طور کے اصلی معنی پہاڑ کے ہیں اور والطّور سے مراد وہ خاص پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔

قدیم زمانے میں جن کتابوں اور تحریروں کو زمانہ دراز تک محفوظ رکھنا ہوتا تھا انہیں کاغذ کے بجائے ہرن کی کھال پر لکھا جاتا تھا یہ کھال خاص طور پر لکھنے کیلئے بھی رقیق جلد یا جھلی کی شکل میں تیار کی جاتی تھی اور اصطلاح میں اسے رق کہا جاتا تھا اہل کتاب بالعموم تورات زبور، انجیل اور صحف انبیاء کو اسی رق پر لکھا کرتے تھے تاکہ طویل مدت تک محفوظ رہ سکے۔

یہاں کھلی کتاب سے مراد یہی مجموعہ کتب مقدسہ ہیں جو اہل کتاب کے ہاں موجود تھا اسے کھلی کتاب اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ نایاب نہ تھی بلکہ پڑھی جاتی تھی اور باآسانی معلوم

کیا جا سکتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

آباد گھر سے مراد حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے نزدیک خانہ کعبہ ہے جو کبھی حج، عمرہ اور طواف زیارت کرنے والوں سے خالی نہیں رہتا۔ اور حضرت علی اور ابن عباس اور دوسرے مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہ بیت المعمور ہے جس کا ذکر معراج کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔

اونچی چھت سے مراد آسمان ہے جو زمین پر ایک قبے کی طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے اور یہاں یہ لفظ پورے عالمِ بالا کیلئے استعمال ہوا ہے۔

البحر المسجور کے متعدد معنی بیان کئے گئے ہیں بعض مفسرین نے اس کو آگ سے بھرے ہوئے کے معنی میں لیا ہے بعض اس کو فارغ اور خالی کے معنی میں لیتے ہیں جس کا پانی زمین میں اتر کر غائب ہو گیا ہو۔ بعض اسے محبوس کے معنی میں لیتے ہیں اور اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ سمندر کو روک کر رکھا گیا ہے تاکہ اس کا پانی زمین میں اتر کر غائب بھی نہ ہو جائے اور خشکی پر چھا بھی نہ جائے کہ زمین کے سب باشندے اس میں غرق ہو جائیں بعض اسے مخلوط کے معنی میں لیتے ہیں جس کے اندر میٹھا اور کھاری، گرم اور سرد ہر طرح کا پانی آ کر مل جاتا ہے اور بعض اس کو لبریز اور موجزن کے معنی میں لیتے ہیں۔

ان میں سے پہلے دو معنی موقع و محل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ سمندر کی یہ دونوں کیفیات کہ اس کی تہہ پھٹ کر اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے اور وہ آگ سے بھر جائے قیامت کے وقت ظاہر ہوں گی یہ آئندہ رونما ہونے والی کیفیات اس وقت موجود نہیں ہیں کہ ان کی قسم کھا کر آج کے لوگوں کو آخرت کے وقوع کا یقین دلایا جائے اس لیے ان دو نوں معنوں کو ساقط کر کے یہاں البحر المسبحور کو محبوس، مخلوط اور لبریز و موجزن کے معنی ہی لیا جا سکتا ہے۔

﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ﴾

یہ ہے وہ حقیقت جس پر اس پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ رب کے عذاب سے

مراد آخرت ہے۔ چونکہ یہاں اس پر ایمان لانے والے مخاطب نہیں ہیں بلکہ اس کا انکار کر نے والے مخاطب ہیں اوران کے حق میں اس کا آنا عذاب ہی ہے اس لیے اس کو قیامت یا آخرت یا روز جزا کہنے کی بجائے رب کا عذاب کہا گیا ہے۔

اب غور کیجیے کہ اس کے وقوع پر وہ پانچ چیزیں کس طرح دلالت کرتی ہیں جن کی قسم کھا ئی گئی ہے (یعنی مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت کیا ہے) طور وہ جگہ ہے جہاں ایک دبی اور پسی ہوئی قوم کو اٹھانے اور ایک غالب قاہر قوم کو گرانے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ فیصلہ قانونِ طبعی کی بنیاد پر نہیں بلکہ قانونِ اخلاقی اور قانونِ مکافات کی بنیاد پر تھا اس لیے آخرت کے حق میں تاریخی استدلال کے طور پر طور کو بطور ایک علامت کے پیش کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل جیسی ایک بے بس قوم کا اٹھایا جانا اور فرعون جیسے ایک زبردست فرمانروا کا اپنے لشکروں سمیت غرق کر دیا جانا جسکا فیصلہ ایک سنسان رات میں کوہ طور پر کیا گیا تھا انسانی تاریخ میں اس امر کی ایک نمایاں ترین مثال ہے کہ سلطنت کائنات کا مزاج کس طرح انسان جیسی ایک ذی عقل و ذی اختیار مخلوق کے معاملہ میں اخلاقی محاسبے اور جزائے اعمال کا تقاضا کرتا ہے اور اس تقاضے کی تکمیل کیلیے ایک ایسا یوم الحساب ضروری ہے جس میں پوری نوعِ انسانی کو اکٹھا کر کے اس کا محاسبہ کیا جائے۔

کتب مقدسہ کے مجموعے کی قسم اس بنا پر کھائی گئی کہ رب العالمین کی طرف سے دنیا میں جتنے بھی انبیاء آئے اور جو کتابیں بھی وہ لائے ان سب نے ہر زمانے میں وہی ایک خبر دی ہے جو محمد ﷺ دے رہے ہیں یعنی یہ کہ تمام اگلے پچھلے انسانوں کو ایک دن از سر نو زندہ ہو کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا اور سزا پانی ہے کوئی کتاب آسمانی کبھی ایسی نہیں آئی جو اس خبر سے خالی ہو یا جس نے انسان کو الٹی یہ اطلاع دی ہو کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور انسان بس مر کر مٹی ہو جانیوالا ہے جس کے بعد نہ کوئی حساب ہے نہ کتاب۔ بیت معمور کی قسم اس لئے کھائی گئی ہے کہ خاص طور پر پہلے عرب کیلیئے اس زمانے میں خانہ کعبہ کی عمارت ایک ایسی کھلی نشانی تھی جو اللہ کے

پیغمبروں کی صداقت پراوراس حقیقت پر کہ اللہ جل شانہ کی حکمت بالغہ وقدرت قاہرہ ان کی پشت پر ہے صریح شہادت دے رہی تھی ان آیات کے نزول سے ڈھائی ہزار برس پہلے بے آب وگیاہ اور غیر آباد پہاڑوں میں ایک شخص کسی لاؤ لشکر اور سروسامان کے بغیر آتا ہے اور اپنی ایک بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو بالکل بے سہارا چھوڑ کر چلا جاتا ہے پھر کچھ مدت بعد وہی شخص آکر اس سنسان جگہ پر اللہ تعالی کی عبادت کے لئے ایک گھر بناتا ہے اور پکار دیتا ہے کہ لوگو آؤ اور اس گھر کا حج کیا کرو اور اس پکار کو یہ حیرت انگیز مقبولیت حاصل ہوتی ہے کہ وہی گھر تمام اہل عرب کا مرکز بن جاتا ہے اس پکار پر عرب کے گوشے گوشے سے لوگ لبیک لبیک کہتے ہوئے کھنچے چلے آتے ہیں ڈھائی ہزار برس تک یہ گھر ایسا امن کا گہوارہ بنا رہتا ہے کہ اس کے گردوپیش سارے ملک میں کشت وخون کا بازار گرم رہتا ہے مگر اس کے حدود میں آکر کسی کو کسی پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی اور اسی گھر کی برکت عرب کی ہر سال چار مہینے ایسے ان کو میسر آجاتے ہیں جن میں قافلے اطمنان سے سفر کرتے ہیں تجارت۔چمکتی ہے اور بازار لگتے ہیں پھر اس گھر کا یہ دبدبہ تھا کہ اس کی طرف کوئی میلی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا اور جس نے یہ جراءت کی وہ اللہ کے غضب کا ایسا شکار ہوا کہ عبرت بن کر رہ گیا یہ کرشمہ ان آیات کے نزول سے صرف پینتالیس (۴۵) ہی برس پہلے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور اس کے دیکھنے والے بہت سے آدمی اس وقت مکہ معظمہ میں زندہ موجود تھے جب یہ آیات اہل مکہ کو سنائی جارہی تھیں اس سے بڑھ کر کون سی چیز اس بات کی دلیل ہوسکتی تھی کہ اللہ تعالی کے پیغمبر ہوائی باتیں نہیں کیا کرتے انکی آنکھیں وہ کچھ دیکھتی ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ان کی زبان پر وہ حقائق جاری ہوتے ہیں جن تک دوسروں کی عقل نہیں پہنچ سکتی وہ بظاہر ایسے کام کرتے ہیں جنکو ایک وقت کے لوگ دیکھیں تو دیوانگی سمجھیں اور صدیوں بعد کے لوگ انہی کو دیکھ کر انکی بصیرت پر دنگ رہ جائیں۔اس شان کے لوگ جب بالاتفاق ہر زمانے میں خبر دیتے رہے کہ قیامت آئے گی اور حشر ونشر ہوگا تو اسے دیوانوں کی بڑ سمجھنا خود دیوانگی ہے۔

اونچی چھت (آسمان) اور موجزن سمندر کی قسم اس لئے کھائی گئی کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں اور اسی حکمت وقدرت سے آخرت کا امکان بھی ثابت ہوتا ہے اور اس کا وقوع و وجوب بھی۔ آسمان کی دلالت تو اس طرح ہے کہ اس آسمان کو انسان شب وروز اپنے اوپر چھایا ہوا دیکھتا ہے جس میں دن کو سورج چمکتا ہے اور رات کو چاند اور بے حد وحساب تارے روشن نظر آتے ہیں جسے آدمی کھلی آنکھ سے دیکھے تو حیرت طاری ہو جاتی ہے لیکن اگر دوربین لگائے تو ایک ایسی وسیع وعریض کائنات اس کے سامنے آتی ہے جو ناپیدا کنار ہے جو کہیں سے شروع ہو کر کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑے عظیم الشان سیارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں ہمارے سورج جیسے ہزاروں درجہ زیادہ روشن تارے چمک رہے ہیں ہمارا یہ پورا نظام شمسی اس کی صرف ایک کہکشاں کے کونے میں پڑا ہوا ہے تنہا اسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم تین ارب دوسرے تارے موجود ہیں اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی ایسی دس لاکھ کہکشانوں کا پتہ دے رہا ہے ان لاکھوں کہکشانوں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشاں اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار (۱۸۶۰۰۰) میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے تو یہ کائنات کے صرف اس حصے کی وسعت کا حال ہے جو اب تک انسان کے علم اور اس کے مشاہدہ میں آئی اللہ تعالیٰ کی خدائی کس قدر وسیع ہے اس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات اس پوری کائنات کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو جو قطرے کو سمندر سے ہے اس عظیم کارگاہ ہست وبود کو جو اللہ تعالیٰ وجود میں لایا ہے اس کے بارے میں زمین پر رینگنے والا یہ چھوٹا سا حیوان ناطق جسکا نام انسان ہے اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا تو یہ اس کی اپنی عقل کی تنگی ہے کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی۔

اور موجزن سمندر کی دلالت اس طرح ہے کہ جو شخص بھی انکار کا پیشگی فیصلہ کیے بغیر

اس کو نگاہِ غور سے دیکھے گا اس کا دل یہ گواہی دے گا کہ زمین پر پانی کے اتنے بڑے ذخیرے کا فراہم ہو جانا بجائے خود ایک ایسی کاریگری ہے جو کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہو سکتی پھر اس کے ساتھ اتنی بے شمار حکمتیں وابستہ ہیں کہ اتفاقاً ایسا حکیمانہ نظام قائم ہو جانا ممکن نہیں ہے اس میں بے شمار بے حد وحساب حیوانات پیدا کیے گئے ہیں جن میں سے ہر نوع کا نظام جسمانی ٹھیک اس گہرائی کے لیے موزون بنایا گیا ہے۔ جس کے اندر اسے رہنا ہے اس کے پانی کو نمکین بنا دیا گیا ہے تا کہ روزانہ کروڑوں جانور جو اس میں مرتے ہیں ان کی لاشیں سڑ نہ جائیں۔

اس کے پانی کو ایک خاص حد پر اس طرح روک رکھا گیا ہے کہ نہ تو وہ زمین کے شگافوں سے گزر کر اس کے پیٹ میں اتر جاتا ہے اور نہ خشکی پر چڑھ کر اسے غرق کر دیتا ہے بلکہ لاکھوں کروڑوں برس سے وہ اسی حد پر رکا ہوا ہے اس عظیم ذخیرہ آب کے موجود اور برقرار رہنے سے زمین کے خشک حصوں پر بارش کا انتظام ہوتا ہے جس میں سورج کی گرمی اور ہواؤں کی گردش اس کے ساتھ پوری باقاعدگی کے ساتھ تعاون کرتی ہے اسی کے غیر آباد نہ ہونے اور طرح طرح کی مخلوقات اس میں پیدا ہونے سے یہ فائدہ حاصل ہوا ہے کہ انسان اس سے اپنی غذا اور اپنی ضرورت کی بہت سی چیزیں کثیر مقدار میں حاصل کر رہا ہے۔ اسی کے ایک حد پر رکے رہنے سے وہ براعظم اور جزیرے قائم ہیں جن پر انسان بس رہا ہے اور اسی کے چند اٹل قواعد کی پابندی کرنے سے یہ ممکن ہوا ہے کہ انسان اس میں جہاز رانی کر سکے۔ ایک حکیم کی حکمت اور ایک قادر مطلق کی زبردست قدرت کے بغیر اس انتظام کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انسان اور زمین کی دوسری مخلوقات کے مفاد سے سمندر کے اس انتظام کا یہ گہرا تعلق سب اللہ ٹپ ہی قائم ہو گیا ہے۔

اب اگر فی الواقع یہ اس امر کی ناقابل انکار شہادت ہے کہ ایک اللہ حکیم وقادر نے انسان کو زمین پر آباد کرنے کے لیے دوسرے بے شمار انتظامات کے ساتھ یہ بحر شور بھی اس شان کا پیدا کیا ہے تو وہ شخص سخت احمق ہو گا جو اس حکیم سے اس نادانی کی توقع رکھے کہ وہ

اس سمندر سے انسان کی کھیتیاں سیراب کرنے اور اس کے ذریعہ سے انسان کو رزق دینے کا انتظام تو کردے گا مگر اس سے کبھی یہ نہ پوچھے گا کہ تو نے میرا رزق کھا کر اس کا حق کیسے ادا کیا اور وہ اس سمندر کے سینے پر اپنے جہاز دوڑانے کی قدرت تو انسان کو عطا کردے گا۔ مگر اس سے کبھی یہ نہ پوچھے گا کہ یہ جہاز تو نے حق اور راستی کے ساتھ دوڑائے تھے یا ان کے ذریعے سے دنیا میں ڈاکے مارتا پھرتا تھا۔ اس طرح یہ تصور کرنا بھی ایک بہت بڑی کند ذہنی ہے کہ جس قادر مطلق کی قدرت کا ایک ادنی کرشمہ اس عظیم الشان سمندر کی تخلیق ہے جس نے فضا میں گھومنے والے اس معلق کرّے پر پانی کے اتنے بڑے ذخیرے کو تھام رکھا ہے جس نے نمک کی اتنی بڑی مقدار اس میں گھول دی ہے جس نے طرح طرح کی ان گنت مخلوقات اس میں پیدا کی ہیں اور ان سب کی رزق رسانی کا انتظام اسی کے اندر کر دیا ہے جو ہر سال اربوں ٹن پانی اس میں سے اٹھا کر ہوا کے دوش پر لے جاتا ہے اور کروڑوں مربع میل کے خشک علاقوں پر اسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ برساتا رہتا ہے وہ انسان کو ایک دفعہ پیدا کر دینے کے بعد ایسا عاجز ہو جاتا ہے کہ پھر اسے پیدا کرنا چاہے بھی تو نہیں کرسکتا۔ [1]

یہ قسمیں عظیم ہیں اور ڈراؤنی ہیں جو دل کو ہلا دیتی ہیں اور احساس کو مرعوب کرتی ہیں تعبیرِ الفاظ و معانی سب خوف پیدا کرتے ہیں اور جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ اور بھی خوفناک ہے جو دلوں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ بے شک تیرے رب کا عذاب ضرور آنے والا ہے اسے کوئی ہٹانے والا نہیں ۔۔۔۔۔ یعنی اس کا وقوع حتمی ہے اسے دور کرنے کی کبھی کوئی طاقت نہ رکھے گا ان دو آیتوں کو پڑھ کر ان کے فاصلے اور ایقاع کو دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ عذاب کا فیصلہ جب ہو جائے تو وہ قطعی اور حتمی ہے اور کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جب آدمی ان آیتوں کا مطلب جان لے یہ براہ راست اس تک پہنچیں تو بے پناہ اثر کرتی ہیں حافظ ابوبکر ابن ابی الدنیا نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک رات کو وہ حسب معمول بھیس بدل کر مدینہ میں پھر رہے تھے کہ

[1] تفہیم القرآن

ایک شخص کو صلاۃ میں دیکھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی قرأت کو بغور سننے کیلئے ٹھہر گئے اس شخص نے سورۃ طور کی تلاوت کی حتی کہ وہ اس آیت پر پہنچا کہ:

﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ٥مَا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ٥﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا رب کعبہ کی قسم کہ یہ ایک برحق قسم ہے اپنے گدھے سے نیچے اترے اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے کافی دیر وہاں ٹھہر کر پھر اپنے گھر واپس آئے اور بیمار پڑ گئے ایک ماہ تک بستر پر رہے کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مرض کیا ہے رضی اللہ عنہم۔ ظاہر ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے قبل بارہا اس سورۃ کو پڑھ اور سن چکے تھے اور نمازوں میں اسے پڑھ کر اسے امامت کرا چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا اس سورت کو نماز مغرب میں پڑھنا احادیث صحاح سے ثابت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کو جانتے تھے اور حضور ﷺ کو اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے تھے لیکن اس رات اس سورت نے جوان پر اس قدر اثر کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عمر رضی اللہ عنہ کے آمادہ اور کھلے دل میں داخل ہو گئی۔ ان کا احساس اس وقت بیدار تھا۔ دلوں پر بعض خاص خاص اوقات بھی آتے ہیں جن میں کوئی خاص چیز ان پر بے پناہ اور غیر معمولی اثر کرتی ہے۔ ❶

طور اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر درخت ہوں اور جو خشک پہاڑ ہو اس کو جبل کہتے ہیں۔ بیت المعمور کے متعلق معراج والی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں ساتویں آسمان سے آگے بڑھنے کے بعد مجھے بیت المعمور دکھلایا گیا جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے عبادت اللہ تعالیٰ کیلئے جاتے ہیں دوسرے دن اتنے ہی اور لیکن جو آج گئے ان کی باری پھر قیامت تک نہیں آتی۔ ❷

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات میں یہ ہے کہ بیت المعمور ساتویں آسمان میں ہے۔ ❸

---

❶ ظلال القرآن ❷ ابن کثیر
❸ فتح الباری جلد ٦ صفحہ ٣٨٠

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب مسطور سے مراد سب سے راجح قول کے مطابق قرآن مجید ہے۔ ❶

علامہ قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت المعمور سے مراد کعبہ ہے جو کہ حجاج اور عمرہ کرنے والوں طواف اور اعتکاف کرنے والوں اور مجاورں سے آباد ہے اگر چہ اور بھی اس کے متعلق اقوال ہیں لیکن یہ قول زیادہ ظاہر ہے کیونکہ سورۃ التین میں بلد امین کا عطف طور سینین پر ڈالا گیا ہے اور یہ اس کے مناسب ہے۔

نیز وہ فرماتے ہیں کہ بحر المسجور کا معنی بھرا ہوا سمندر کرنا زیادہ بہتر ہے ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ المسجور کا معنی المملوء کرنا زیادہ بہتر ہے۔

(۱۹) سورت النجم

﴿وَا لنَّجْمِ اِذَا هَوٰی o مَا ضَلَّ صَا حِبُكُمْ وَمَا غَوٰی o وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی o اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰی o عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰی o ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی o وَهُوَ بِالْاُ فُقِ الْا عْلٰی o ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی o فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْاَدْ نٰی o فَاَ وْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی o مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی o اَفَتُمٰرُ وْ نَهٗ عَلٰی مَا يَرٰی o وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی o عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی o عِنْدَ هَا جَنَّةُ الْمَاْ وٰی o اِذْ يَغْشَی السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰی o مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی o لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی o﴾ (آیت ا تا ۱۸)

''قسم ہے تاروں کی جبکہ وہ غروب ہوں تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر کی جاتی ہے اسے

❶ التبیان فی اقسام القرآن

زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے جو کہ بڑا صاحب حکمت ہے وہ سامنے آ کھڑا ہوا جبکہ وہ بالائی افق پر تھا پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا تب اس نے اللہ تعالیٰ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے اور دوسری مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتھی کے پاس اسے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماوی ہے اس وقت سدرۃ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا''۔

ابتدائے بعثت کے کچھ عرصہ بعد تک رسول اللہ ﷺ صرف نجی صحبتوں اور مخصوص مجلسوں ہی میں اللہ تعالیٰ کا کلام سنا سنا کر لوگوں کو اللہ عزوجل کے دین کی طرف دعوت دیتے تھے اس پوری مدت میں آپکو کبھی کسی مجمع عام میں قرآن سنانے کا موقع نہ مل سکا تھا کیونکہ کفار کی سخت مزاحمت اس میں مانع تھی انکو اس امر کا خوب اندازہ تھا کہ آپکی شخصیت اور آپکی تبلیغ میں کس بلا کی کشش اور قرآن مجید کی آیات مین کس غضب کی تاثیر ہے۔اس لئے وہ کوشش کرتے تھے کہ اس کلام کو نہ خود سنیں نہ کسی کو سننے دیں اور آپکے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا کر محض اپنے جھوٹے پروپوگنڈے کے زور سے آپ کی دعوت کو دبا دیں۔اس غرض کیلئے ایک طرف تو وہ جگہ جگہ یہ مشہور کرتے پھرتے تھے کہ محمد ﷺ بہک گئے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں دوسری طرف انکا یہ مستقل طریق کار تھا کہ جہاں بھی آپ قرآن سنانے کی کوشش کریں وہاں شور مچا دیا جائے تا کہ یہ لوگ جان ہی نہ سکیں کہ وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آپ کو گمراہ اور بہکا ہوا آدمی قرار دیا جا رہا ہے۔ان حالات میں ایک روز رسول اللہ ﷺ حرم پاک میں جہاں قریش کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ پر سورۃ النجم کو نازل فرمایا اور کفارِ مکہ کو اس رویے کی غلطی پر متنبہ کیا جو وہ قرآن اور محمد ﷺ کے مقابلے میں اختیار کئے ہوئے تھے۔کلام کا آغاز اس طرح فرمایا گیا کہ ستاروں کی قسم جبکہ وہ غروب ہوں تمہارا رفیق نہ بھٹکا اور نہ بہکا ہے۔الخ

محمد ﷺ بہکے اور بھٹکے ہوئے آدمی نہیں جیسا کہ تم ان کے متعلق مشہور کرتے پھر رہے ہو اور نہ اسلام کی یہ تعلیم اور دعوت انہوں نے خود اپنے دل سے گھڑی جیسا کہ تم اپنے نزدیک سمجھے بیٹھے ہو بلکہ جو کچھ وہ پیش کررہے ہیں وہ خالص وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے جو کچھ وہ تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں وہ انکے اپنے قیاس اور گمان کی آفریدہ نہیں ہے بلکہ انکی آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں انہوں نے اس فرشتے کو خود دیکھا ہے جس کے ذریعے سے انکو یہ علم دیا جاتا ہے انہیں اپنے رب کی عظیم نشانیوں کا براہِ راست مشاہدہ کرایا گیا ہے وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سوچ کر نہیں دیکھ کر کہہ رہے ہیں ان سے تمہارا جھگڑنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی اندھا آنکھوں والے سے اس چیز پر جھگڑے جو اسے نظر نہیں آتی اور آنکھوں والے کو نظر آتی ہے۔

النجم سے ستاروں کی جنس مراد ہے مطلب یہ ہے کہ جب صبح ہوئی اور ستارے غائب ہو گئے۔

وما صاحبکم بمجنون میں مخاطب قریش کے لوگ ہیں۔عربی زبان میں صاحب دوست، رفیق، ساتھی، پاس رہنے والے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے کو کہتے ہیں یہاں آپ کا نام لینے یا ہمارا رسول کہنے کی بجائے تمہارا صاحب کہہ کر ذکر کرنے میں بڑی گہری معنویت ہے اس سے قریش کے لوگوں کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ جس شخص کا تم سے ذکر کیا جارہا ہے وہ تمہارے ہاں باہر سے آیا ہوا کوئی اجنبی آدمی نہیں کہ اس سے تمہاری پہلے کوئی جان پہچان نہ ہو تمہاری اپنی قوم کا آدمی ہے تمہارے ساتھ ہی رہتا بستا ہے تمہارا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ کون ہے کیا ہے کس سیرت و کردار کا انسان ہے کیسے اس کے معاملات ہیں کیسی اس کی عادات و خصائل ہیں اور آج تک تمہارے درمیان اس کی زندگی کیسی رہی ہے اس کے بارے میں منہ پھاڑ کر کوئی کچھ کہہ دے تو تمہارے اندر ہزاروں آدمی اس کے جاننے والے موجود ہیں جو خود بخود دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بات اس شخص میں پائی جاتی ہے یا نہیں۔

ما ضل صاحبکم وما غوی ۔ یہ ہے وہ اصل بات جس پر غروب ہونے والے

تاروں کی قسم کھائی گئی ہے کہ تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے بھٹکنے سے مراد کسی شخص کا راستہ نہ جاننے کی وجہ سے کسی غلط راستے پر چل پڑنا۔ اور بہکنے سے مراد ہے کسی شخص کا جان بوجھ کر غلط راستہ اختیار کر لینا۔ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ جو تمہارے جانے پہچانے آدمی ہیں ان پر تم لوگوں کا یہ الزام بالکل غلط ہے کہ وہ گمراہ یا بدراہ ہو گئے ہیں در حقیقت وہ نہ بھٹکے ہیں نہ بہکے ہیں اس بات پر تاروں کے غروب ہونیکی قسم جس مناسبت سے کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں جب تارے نکلے ہوئے ہوں ایک شخص اپنے گرد و پیش کی اشیاء کو صاف نہیں دیکھ سکتا اور مختلف اشیاء کی دھندلی شکلیں دیکھ کر انکے بارے میں غلط اندازے کر سکتا ہے مثلاً اندھیرے میں دور سے کسی درخت کو بھوت سمجھ لے یا کوئی رسی پڑی دیکھ کر سانپ خیال کرے ریت سے کوئی چٹان ابھری دیکھ کر اسے وہ درندہ خیال کرے۔ لیکن جب تارے ڈوب جائیں اور صبح روشن ہو جائے تو ہر چیز اپنی اصلی شکل میں آدمی کے سامنے آ جاتی ہے اس وقت کسی چیز کی اصلیت کے بارے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا ایسا ہی معاملہ تمہارے ہاں محمد ﷺ کا بھی ہے کہ انکی زندگی اور شخصیت تاریکی میں چھپی ہوئی نہیں بلکہ صبح روشن کی طرح عیاں ہے تم جانتے ہو کہ تمہارا یہ صاحب ایک نہایت سلیم الطبع اور دانا و فرزانا آدمی ہے اس کے بارے میں قریش کے کسی شخص کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ گمراہ ہو گیا ہے تم بھی جانتے ہو کہ وہ کمال درجہ کا نیک نیت اور راست باز انسان ہے اس کے متعلق تم میں سے کوئی شخص کیسے یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر نہ صرف خود ٹیڑھی راہ اختیار کر بیٹھتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اسی ٹیڑھے راستے کی طرف دعوت دینے کیلئے کھڑا ہو گیا ہے۔

وما ینطق عن الھوی : مطلب یہ ہے کہ جن باتوں کی وجہ سے تم اس پر یہ الزام لگاتے ہو کہ وہ گمراہ یا بدراہ ہو گیا ہے وہ اس نے اپنے دل سے نہیں گھڑی ہیں نہ ان کی محرک اسکی اپنی خواہش نفس ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر وحی کے ذریعہ سے نازل کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے اس کا خود نبی بننے کو جی نہیں چاہا تھا کہ اپنی یہ خواہش پوری کرنے

کے لیے اس نے دعوٰی نبوت کر دیا ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے جب وحی کے ذریعے سے آپ ﷺ کو اس منصب پر مامور کیا تب وہ تمہارے درمیان تبلیغ رسالت کے لیے اٹھا اور اس نے تم سے کہا کہ میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں اسی طرح اسلام کی یہ دعوتِ توحید کی یہ تعلیم اور آخرت وحشر ونشر اور جزائے اعمال کی یہ خبریں۔ کائنات وانسان کے متعلق یہ حقائق اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے یہ اصول جو وہ پیش کر رہا ہے یہ سب کچھ بھی اس کا اپنا بنایا ہوا فلسفہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اسکو ان باتوں کا علم عطا کیا ہے اسی طرح یہ قرآن جو وہ تمہیں سناتا ہے یہ بھی اس کا اپنا تصنیف کردہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو وحی کئے ذریعہ سے اس پر نازل کیا جاتا ہے۔

علمه شديد القوى : یعنی کوئی انسان اسکو سکھانے والا نہیں ہے جیسا کہ تم گمان کرتے ہو بلکہ یہ علم اس کو ایک فوق البشر ذریعہ سے حاصل ہو رہا ہے زبردست قوت والے سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ خود قرآن مجید کی دوسری تصریحات سے بھی یہی ثابت ہے سورہ التکویر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے درحقیقت یہ ایک بزرگ فرشتے کا بیان ہے جو زبردست قوت والا ہے مالک عرش کے ہاں بڑا درجہ رکھتا ہے اس کا حکم مانا جاتا ہے اور وہاں وہ معتبر ہے تمہارا رفیق کچھ دیوانہ نہیں ہے وہ اس فرشتے کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھ چکا ہے سورہ بقرہ میں آیت ۹۷ میں اس فرشتے کا نام بھی بیان کر دیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے یہ تعلیم حضور ﷺ کے قلب پر نازل کی گئی تھی قل من كان عدوا لجبريل فانه نزله على قلبك باذن الله ان تمام آیات کو اگر سورہ نجم کی اس آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہاں زبردست قوت والے معلم سے مراد جبریل امین ہی ہیں۔

اس مقام پر بعض حضرات یہ شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ جبریل امین کو رسول اللہ ﷺ کا معلم کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ وہ استاد ہیں اور حضور ﷺ شاگرد اور اس سے حضور پر جبریل علیہ السلام کی فضیلت لازم آئے لیکن یہ شبہ اس لئے غلط ہے کہ

جبریلؑ اپنی کسی ذاتی علم سے حضور کو تعلیم نہیں دیتے تھے جس سے آپ پر فضیلت لازم آئے بلکہ ان کو اللہ تعالی نے آپ ﷺ تک علم پہنچانے کا ذریعہ بنایا تھا اور وہ محض واسطہ تعلیم ہونے کی حیثیت سے مجازاً آپ کے معلم تھے اس سے انکی فضیلت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے پانچ وقت کی نمازیں فرض ہونے کے بعد اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو نماز کے صحیح اوقات بتانے کیلئے جبریل علیہ السلام کو آپ کے پاس بھیجا اور انہوں نے دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں آپ ﷺ کو پڑھائیں لیکن اس طرح محض تعلیم دینے سے جبریل علیہ السلام کا آپ ﷺ سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔

ذو مرۃ کے معنی بعض نے خوبصورت اور شاندار اور بعض نے طاقت ور اور بعض نے صاحب حکمت اور بعض نے تندرست اور صحیح القوی اور بعض نے نہایت صائب الرائے اور عاقل و دانا کیے ہیں اللہ تعالیٰ نے یہاں جبریل علیہ السلام کیلئے یہ جامع لفظ اسی لیے منتخب فرمایا ہے کہ ان میں عقلی اور جسمانی دونوں طرح کی قوتوں کا کمال پایا جاتا ہے اردو زبان میں کوئی لفظ ان تمام معنوں کا جامع نہیں ہے لیکن راجح معنی اس کا بڑا صاحب حکمت ہے کیونکہ جسمانی قوتوں کے کمال کا ذکر اس سے پہلے کے فقرے میں آ چکا ہے۔

بالافق الاعلی سے مراد آسمان کا مشرقی کنارا جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے اور دن کی روشنی پھیلتی ہے اسی کو سورہ التکویر میں افق مبین کہا گیا ہے دونوں آیتیں صراحت کرتی ہیں کہ پہلی مرتبہ جبریل علیہ السلام جب نبی ﷺ کو نظر آئے اس وقت آسمان کے مشرقی کنارے سے نمودار ہوئے تھے اور متعدد معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ اپنی اصلی صورت میں تھے جس میں اللہ تعالی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ آسمان کے بالائی مشرقی کنارے سے نمودار ہونے کے بعد جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی طرف آگے بڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے وہ آپ کے اوپر آ کر فضا میں معلق ہو گئے پھر وہ آپ کی طرف جھکے اور اس قدر قریب ہو گئے کہ آپ ﷺ کے اور ان کے درمیان صرف دو کمانوں کے برابر یا کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ عام مفسرین قوسین کا معنی دو کمان

اور ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم قوسین دو ہاتھ کے معنی میں لیتے ہیں اور مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ دونوں کے درمیان صرف دو ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

فا وحی الی عبدہ ما او حی : وحی کی اس کے بندے پر جو کچھ بھی وحی کی یعنی جبریل نے وحی کی اللہ تعالی کے بندے پر جو کچھ بھی اسکو وحی کرنی تھی۔

جبریل علیہ السلام کا مشاہدہ دن کی روشنی اور پوری بیداری کی حالت میں کھلی آنکھوں سے محمد ﷺ کو ہوا اس پر ان کے دل نے یہ نہیں کہا کہ یہ نظر کا دھوکہ ہے یا یہ کوئی جن یا شیطان ہے جو مجھے نظر آ رہا ہے یا میرے سامنے کوئی خیالی صورت آ گئی ہے اور میں جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں بلکہ ان کے دل نے ٹھیک وہی کچھ سمجھا جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں انہیں اس امر میں کوئی شک لاحق نہیں ہوا کہ فی الواقع یہ جبریل علیہ السلام ہی ہے اور جو پیغام یہ پہنچا رہے ہیں وہ واقعی اللہ تعالی کی طرف سے وحی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو ایسے عجیب اور غیر معمولی مشاہدے کے بارے میں قطعاً کوئی شک لاحق نہ ہوا اور آپ نے پورے یقین کے ساتھ جان لیا کہ آپ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ واقعی حقیقت ہے کوئی خیالی ہیولی نہیں ہے اور کوئی جن یا شیطان نہیں ہے؟ اس سوال پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اس کے پانچ وجوہ ہماری سمجھ میں آتے ہیں:

ایک یہ کہ وہ خارجی حالات جن میں مشاہدہ ہوا تھا اس کی صحت کا یقین دلانے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ مشاہدہ اندھیرے میں یا مراقبے کی حالت میں یا خواب میں یا نیم بیداری کی حالت میں نہیں ہوا تھا بلکہ صبح روشن طلوع ہو چلی تھی آپ پوری طرح بیدار تھے کھلی فضا میں اور دن کی پوری روشنی میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر ٹھیک اسی طرح دیکھ رہے تھے جس طرح کوئی شخص دنیا کے دوسرے مناظر دیکھتا ہے اس میں اگر شک کی کوئی گنجائش ہو تو ہم دن کے وقت دریا، پہاڑ، آدمی، مکان، غرض جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وہ سب بھی پھر مشکوک اور محض نظر کا دھوکہ ہی ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آپ کی اپنی داخلی حالت بھی اس کی صحت کا یقین دلانے والی تھی آپ ﷺ پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں تھے پہلے سے آپ کے ذہن میں اس طرح کا سرے سے کوئی خیال نہ تھا کہ آپ کو کوئی مشاہدہ ہونا چاہیے یا ہونے والا ہے۔ ذہن اس فکر سے اور اس کی تلاش سے بالکل خالی تھا اور اس حالت میں اچانک آپ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آیا اس پر یہ شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ آنکھیں کسی حقیقی منظر کو نہیں دیکھ رہی ہیں بلکہ ایک خیالی ہیولی سامنے آ گیا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو ہستی ان حالات میں آپ کے سامنے آئی تھی وہ ایسی عظیم، ایسی شاندار، ایسی حسین اور اس قدر منور تھی کہ نہ آپ ﷺ کے وہم وخیال میں کبھی اس سے پہلے ایسی ہستی کا تصور آیا تھا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو یہ گمان ہوتا کہ وہ آپ ﷺ کے اپنے خیال کی آفریدہ ہے اور نہ کوئی جن یا شیطان اس شان کا ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے فرشتے کے سوا اور کچھ سمجھتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں نے جبریل کو اس صورت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو (٦٠٠) بازو تھے (مسند احمد) ایک دوسری روایت میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ مزید تشریح کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام کا ایک ایک بازو اتنا عظیم تھا کہ افق پر چھایا ہوا نظر آتا تھا (مسند احمد) اللہ تعالی نے خود ان کی شان شدید القوی، ذومرۃ کے الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

چوتھے یہ کہ جو تعلیم وہ ہستی دے رہی تھی وہ بھی اس مشاہدے کی صحت کا اطمینان دلانے والی تھی اس کے ذریعہ جسے اچانک جو علم اور تمام کائنات کے حقائق پر حاوی علم آپ کو ملا اس کا کوئی تصور پہلے سے آپ ﷺ کے ذہن میں نہ تھا کہ آپ اس پر یہ شبہ کرتے کہ یہ میرے اپنے ہی خیالات ہیں جو مرتب ہو کر میرے سامنے آ گئے ہیں اسی طرح اس علم پر یہ شک کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہ تھی کہ شیطان اس شکل میں آ کر آپ کو دھوکہ دے رہا ہے کیونکہ شیطان کا یہ کام آخر کب ہوسکتا ہے اور کب اس نے یہ کام کیا ہے کہ انسان کو شرک و

بت پرستی کے خلاف توحیدِ خالص کی تعلیم دے؟ آخرت کی باز پرس سے خبردار کرے؟ جاہلیت اور اس کے طور طریقوں سے بیزار کرے؟ فضائل واخلاق کی دعوت دے؟ اور ایک شخص سے یہ کہے کہ نہ صرف تو خود اس تعلیم کو قبول کر بلکہ ساری دنیا سے شرک اور ظلم اور فسق و فجور کو مٹانے اور ان برائیوں کی جگہ توحید اور عدل اور تقوی کی بھلائیاں قائم کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہو۔

پانچویں اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی جب کسی شخص کو اپنی نبوت کیلئے چن لیتا ہے تو اس کے دل کو شکوک وشبہات اور وسواس سے پاک کر کے یقین واذعان سے بھر دیتا ہے اس حالت میں اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اور اس کے کان جو کچھ سنتے ہیں اس کی صحت کے متعلق کوئی ادنی سا تردد بھی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا وہ پورے شرح صدر کے ساتھ ہر اس حقیقت کو قبول کر لیتا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر منکشف ہو جاتی ہے خواہ وہ کسی مشاہدے کی شکل میں ہو جو اسے آنکھوں میں دکھایا جائے یا الہامی علم کی شکل میں ہو جو اس کے دل میں ڈالا جائے یا پیغام وحی کی شکل میں ہو جو اس کو لفظ بلفظ سنایا جائے تمام صورتوں میں پیغمبر کو اس کا پورا شعور ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی شیطانی مداخلت سے قطعی محفوظ و مامون ہے اور جو کچھ بھی اس تک کسی شکل میں پہنچ رہا ہے وہ ٹھیک ٹھیک اس کے رب کی طرف سے ہے تمام خداداد احساسات کی طرح پیغمبر کا یہ شعور و احساس بھی ایک ایسی یقینی چیز ہے جس میں غلط فہمی کا کوئی امکان نہیں جس طرح مچھلی کو اپنے تیراک ہونے کا، پرندے کو اپنے پرندہ ہونے کا اور انسان کو اپنے انسان ہونے کا احساس بالکل خداداد ہوتا ہے اور اس میں غلط فہمی کا کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا اسی طرح پیغمبر کو اپنے پیغمبر ہونے کا احساس بھی خداداد ہوتا ہے اس کے دل میں کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی یہ وسوسہ نہیں آتا کہ شاید اسے پیغمبر ہونے کی غلط فہمی لاحق ہو گئی ہے۔

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾

اس میں جبریل علیہ السلام سے نبی کریم ﷺ کی دوسری ملاقات کا ذکر ہے جس میں وہ آپ کے سامنے اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے اس ملاقات کا مقام سدرۃ المنتھی بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کے قریب جنت الماوی واقع ہے۔

سدرۃ عربی زبان میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں اور منتھی کے معنی ہیں آخری سرا سدرۃ المنتھی کے لغوی معنی ہیں وہ بیری کا درخت جو آخری یا انتہائی سرے پر واقع ہے۔ ابن جریر نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ اس پر ہر عالم کا علم ختم ہو جاتا ہے آگے جو کچھ ہے اسے اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا ہمارے لیے جاننا مشکل ہے کہ اس عالم ماوی کی آخری سرحد پر وہ بیری کا درخت کیسا ہے اور اس کی حقیقی نوعیت و کیفیت کیا ہے۔ یہ کائناتِ خداوندی کے وہ اسرار ہیں جن تک ہمارے فہم کی رسائی نہیں بہر حال وہ کوئی ایسی ہی چیز ہے جس کیلئے انسانی زبان کے الفاظ میں سدرہ سے زیادہ موزون لفظ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور کوئی نہ تھا۔

﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی﴾

اس سدرۃ المنتھی کے پاس جب رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا اس وقت سدرۃ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا یعنی اس کی شان اور اسکی کیفیت بیان سے باہر ہے وہ ایسی تجلیات تھیں کہ نہ انسان ان کا تصور کر سکتا ہے اور نہ کوئی انسانی زبان اس کے وصف کی متحمل ہے۔

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی﴾

نگاہ نہ چوندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ ایک طرف رسول اللہ ﷺ کے کمال تحمل کا حال یہ تھا کہ ایسی زبردست تجلیات کے سامنے بھی آپ کی نگاہ میں کوئی چکا چوند پیدا نہ ہوئی اور آپ پورے سکون کے ساتھ ان کو دیکھتے رہے۔ دوسری طرف آپ کے ضبط اور یکسوئی کا کمال یہ تھا کہ جس مقصد کے لیے آپ کو بلایا گیا تھا اسی پر آپ اپنے ذہن اور اپنی نگاہ کو مرکوز کیے رہے اور جو حیرت انگیز مناظر وہاں تھے ان کو دیکھنے کے لئے آپ نے ایک تماشائی کی طرح ہر طرف نگاہیں دوڑانی نہ شروع کر دیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جب

کسی شخص کو کسی عظیم و جلیل بادشاہ کے دربار میں حاضری کا موقع ملتا ہے اور وہاں وہ کچھ شان وشوکت اس کے سامنے آتی ہے جو اس کی چشمِ تصور نے بھی نہ دیکھی تھی اب اگر وہ شخص کم ظرف ہو وہ وہاں پہنچ کر بھونچکارہ جائے گا اور اگر آدابِ حضوری سے ناآشنا ہو تو مقامِ شاہی سے ہی غافل ہو کر دربار کی سجاوٹ کا نظارہ کرنے کے لیے ہر طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگے گا لیکن ایک عالی ظرف، ادب آشنا اور فرض شناس آدمی نہ تو وہاں پہنچ کر مبہوت ہوگا اور نہ ہی دربار کا تماشاہ دیکھنے میں مشغول ہو جائے گا بلکہ پورے وقار کے ساتھ حاضر ہوگا اور اپنی ساری توجہ اس مقصد پر مرتکز رکھے گا جس کیلئے دربارِ شاہی میں اس کو طلب کیا گیا ہے رسول ﷺ کی یہی خوبی ہے جس کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے۔

﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی﴾

اور آپ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

یہ آیت اس امر کی تصریح کرتی ہے کہ رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا بلکہ اس کی عظیم الشان آیات کو دیکھا اور چونکہ سیاق وسباق کی رو سے یہ دوسری ملاقات بھی اسی ہستی سے ہوئی تھی جس سے پہلی ملاقات ہوئی اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ افق اعلی پر جس کو آپ نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ بھی اللہ تعالیٰ نہ تھے اور دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کو دیکھا وہ بھی اللہ عزوجل نہ تھے اگر آپ نے ان مواقع میں سے کسی موقع پر بھی اللہ جل شانہ کو دیکھا ہوتا تو یہ اتنی بڑی بات تھی کہ یہاں ضرور اس کی تصریح کر دی جاتی ہے۔

اگر موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی درخواست کی تھی اور انہیں جواب دیا گیا تھا لن ترانی تو مجھے نہیں دیکھ سکتا اب یہ ظاہر ہے اگر یہ شرف جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا نہیں کیا گیا تھا رسول اللہ ﷺ کو عطا کر دیا جاتا اس کی اہمیت خود ایسی تھی کہ اسے صاف الفاظ میں بیان کر دیا جاتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے رب تعالی کو دیکھا تھا بلکہ واقعہ معراج کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ بنی اسرائیل میں بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے اپنے

بندے کو اس لیے لے گئے تھے کہ اس کو اپنی نشانیاں دکھائیں (لنریه من ایتنا) اور یہاں سدرۃ المنتھی میں حاضری کے سلسلے میں بھی فرمایا گیا ہے کہ اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں (لقد رای من ایت ربه الکبری) ان وجوہ سے بظاہر اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں مواقع پر اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا یا جبریل علیہ السلام کو۔ آپ ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام کو اصلی شکل میں دو دفعہ دیکھا ہے اللہ جل شانہ کو آپ نے نہیں دیکھا۔ ❶

پہلی مرتبہ سورۃ اقراء کی ابتدائی آیتوں کی وحی لے کر آئے اس کے بعد وحی میں فترت یعنی وقفہ پیش آیا جس سے رسول اللہ ﷺ کو سخت غم اور تکلیف تھی بارہا یہ خیالات دل میں آئے کہ پہاڑ سے گر کر جان دے دیں مگر جب کبھی ایسی صورت ہوئی جبریل علیہ السلام غائبانہ ہوا سے آواز دیتے کہ اے محمد ﷺ آپ اللہ کے رسول ہیں برحق ہیں اور میں جبریل ہوں ان کی آواز سے آپ کا دل ٹھہر جاتا اور سکون ہو جاتا تھا۔ جب کبھی ایسا خیال آیا اسی وقت جبریل امین نے اس آواز کے ذریعہ تسلی دی مگر یہ تسلیاں غائبانہ تھیں یہاں تک کہ ایک روز جبریل امین بطحاء کے کھلے میدان میں اپنی اصلی صورت میں اس طرح ظاہر ہوئے۔ کہ ان کے چھ سو بازو تھے اور پورے افق کو گھیر رکھا تھا۔ ❷

دوسری مرتبہ معراج کی رات سدرۃ المنتہی کے پاس دیکھا۔ دونوں رؤیتوں میں تقریباً دس برس کا فاصلہ تھا۔ ❸

﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾

یہ انتہائی قرب واتصال کی تعبیر ہے حضرت جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے اتنے قریب ہو گئے کہ بس دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا مفسرین نے اس کی

---

❶ تفهيم القرآن

❷ ابن كثير

❸ احسن التفاسير

تشریح دو طرح سے کی ہے (۱) کمان کی لکڑی جہاں دستہ پکڑنے کا ہوتا ہے اور اس کے مقابل کمان کی ڈور (تانت) ہوتی ہے ان دونوں کے درمیانی فاصلہ کو قاب کہا جاتا ہے جس کا اندازہ تقریباً ایک ہاتھ سے کیا جاتا ہے عرب کی ایک خاص عادت تھی کہ دو آدمی اگر آپس میں معاہدہ صلح اور دوستی کا کرنا چاہتے تو اس کی ایک علامت ہاتھ پر ہاتھ مارنا معروف و مشہور تھا۔ اسی طرح دوسری علامت یہ تھی کہ دونوں شخص اپنی اپنی کمانوں کی لکڑی تو اپنی طرف کر لیتے اور کمان کی ڈور دوسرے کی طرف اس طرح جب دونوں کمانوں کی ڈوریں آپس میں مل جاتیں تو باہمی قرب و مودت کا اعلان سمجھا جاتا تھا اس قرب کے وقت ان دونوں شخصوں کے درمیان دونوں قوسوں کے قاب کا فاصلہ رہتا تھا یعنی تقریباً دو ہاتھ یا ایک گز۔ (۲) جب دو عرب آپس میں کوئی نہایت مضبوط عہد و پیمان کرنا چاہتے تو اپنی اپنی کمانوں کو نکال کر انہیں باہم ملاتے تھے یہاں تک کہ دونوں کے چلے مل جاتے پھر دونوں اس کو اکٹھا کھینچتے اور دونوں سے ایک ہی تیر چلاتے یہ گویا علامت تھی کہ من تو شدم تو من شدی ہو جانے کی رفتہ رفتہ زبان میں یہ محاورہ کمال قرب و انتہائی اتحاد و اتصال کے لئے استعمال ہونے لگا۔ ❶

فکان قاب قوسین او ادنی میں محققین کے نزدیک او شک کے لئے نہیں بلکہ اس قسم کی ترکیب پوری تاکید اور مبالغہ کے ساتھ زیادہ کی نفی کے لئے ہوتی ہے یعنی تعین کر کے یہ بتلانا مقصود نہیں کہ قوسین کا فاصلہ تھا یا اس سے بھی کم ہاں اتنا ظاہر کر دیتا ہے کہ کسی حال اور کسی طرح فاصلہ اس سے زائد نہ تھا۔ ❷

فاوحی الی عبدہ ما اوحی مضمون وحی یہاں مجمل رکھا گیا ہے اس سے تعظیم و تکریم مراد ہے تاکہ سننے والوں کو انتظار اور شوق رہے اور وہ اس ٹوہ میں رہیں کہ آخر وہ کونسی وحی تھی جس کا ذکر اللہ تعالی نے اس شانِ اہتمام کے ساتھ کیا ہے۔ ❸

❶ ماجدی

❷ بدائع التفاسیر ❸ ظلال القرآن

اذ یغشی السدرۃ ما یغشی صحیح مسلم میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس وقت سدرۃ المنتہی پر سونے کے بنے پروانے ہر طرف گر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روز سدرۃ المنتہی کو خاص طور پر سجایا گیا تھا جس میں آنے والے مہمان رسول اللہ ﷺ کا اعزاز تھا اس وقت درخت کی بہار اور رونق اور اس کا حسن و جمال ایسا تھا کہ کسی مخلوق کی طاقت نہیں کہ اسے لفظوں میں بیان کر سکے۔ بعض روایات کے مطابق یہ لپٹنے والی چیزیں فرشتے تھے جو بکثرت دیوانہ وار گر رہے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ انوار و تجلیات جمالِ مطلق تھے جو سدرۃ کو لپیٹے ہوئے تھے اور فرشتے انہی پر عاشقانہ گر رہے تھے۔

سورت نجم کی اس قسم میں مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مابین مناسبت بعض حضرات یوں بیان کرتے ہیں کہ جس طرح آسمان کے ستارے طلوع سے لیکر غروب تک ایک مقرر رفتار سے معین راستہ پر چلے جاتے ہیں کبھی ادھر ادھر ہٹنے کا نام نہیں لیتے آفتابِ نبوت بھی اللہ تعالی کے مقرر کیے ہوئے راستہ پر برابر چلا جاتا ہے ممکن نہیں ایک قدم ادھر یا ادھر ہو جائے ایسا ہو تو ان کی بعثت سے جو غرض متعلق ہے وہ حاصل نہ ہو انبیاء علیہم السلام آسمانِ نبوت کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور رفتار سے دنیا کی رہنمائی ہوتی ہے اور جس طرح تمام ستاروں کے غائب ہونے کے بعد آفتاب درخشاں طلوع ہوتا ہے ایسے ہی تمام انبیاء کی تشریف بری کے بعد آفتابِ محمدی مطلع عرب سے طلوع ہوا پس اگر قدرت نے ان ظاہری ستاروں کا نظام اس قدر محکم بنایا ہے کہ اس میں کسی طرح کے تزلزل اور اختلال کی گنجائش نہیں تو ظاہر ہے کہ ان باطنی ستاروں اور روحانی آفتاب و ماہتاب کا انتظام کس قدر مضبوط و محکم ہونا چاہیے جن سے ایک عالم کی ہدایت وسعادت وابستہ ہے۔ (1)

صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا اس کے چھ سو پر تھے۔ جامع ترمذی میں حدیث ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو اس کی اصل صورت میں صرف

(1) تفسیر عثمانی

دو دفعہ دیکھا ایک دفعہ سدرۃ المنتھی کے پاس اور ایک دفعہ مکہ کے محلہ جیاد میں اس کے چھ سو پر اس نے افق کو بھر رکھا تھا۔

صحیح بخاری کتاب التوحید میں معراج والی جو حدیث شریک بیان کرتے ہیں کہ:

((دنا الجبار رب العزۃ فتدلی حتی کان منہ قاب قو سین ا و ادنی))

کہ رب العزت آپ ﷺ کے نہایت قریب آئے امام مسلم اور ابن کثیر وغیرہما شریک کی اس روایت پر کلام کرتے ہیں۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ان آیات کو جبریل علیہ السلام کی رؤیت پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے۔ صحیح مسلم کتاب الایمان میں حدیث ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے نور دیکھا ہے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حق بات یہی ہے کہ آپ نے جبریل کو دیکھا ہے۔ (1)

(۲۰) سورت الواقعہ

﴿ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۝ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (۷۵ تا ۸۰)

”پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں ثبت جسے مطھرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔“

(1) تفسیر قاسمی

یہاں قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر قسم کھانے سے پہلے لفظ لا کا استعمال خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ لوگ اس کتاب پاک کے متعلق باتیں بنا رہے تھے جنکی تردید کرنیکے لیے یہ قسم کھائی جا رہی ہے۔ تاروں اور سیاروں کے مواقع سے مراد ان کے مقامات، ان کی منزلیں مراد ہیں اور قرآن کے بلند پایہ کتاب ہونے پر ان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ عالم بالا میں اجرامِ فلکی کا نظام جیسا محکم اور مضبوط ہے ویسا ہی مضبوط اور محکم یہ کلام بھی ہے جس اللہ تعالی نے وہ نظام بنایا ہے اسی نے یہ کلام بھی نازل کیا ہے کائنات کی بے شمار کہکشانوں اور ان کہکشانوں کے اندر بے حدوحساب تاروں اور سیاروں میں جو کمال درجہ کا ربط و نظم قائم ہے درآنحالیکہ بظاہر وہ بالکل بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب بھی ایک کمال درجہ کا مربوط و منظم ضابطہ حیات پیش کرتی ہے جس میں عقائد کی بنیاد پر اخلاق، عبادات، تہذیب وتمدن، معیشت و معاشرت، قانون وعدالت، صلح و جنگ غرض انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں اور ان میں کوئی چیز کسی دوسری چیز سے بے جوڑ نہیں ہے درآنحالیکہ یہ نظام متفرق آیات میں اور مختلف مواقع پر دیے ہوئے خطبوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر جس طرح اللہ تعالی کے باندھے ہوئے عالمِ بالا کا نظم اٹل ہے جس میں کبھی ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا اسی طرح اس کتاب میں بھی جو حقائق بیان کیے گئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں وہ بھی اٹل ہیں ان کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔

فی کتب مکنون : اس سے مراد لوح محفوظ ہے اس کے لیے کتاب مکنون کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ایسا نوشتہ جو چھپا کر رکھا گیا ہے یعنی جس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ اس محفوظ نوشتے میں قرآن ثبت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ پر نازل کیے جانے سے پہلے وہ اللہ تعالی کے ہاں اس نوشتہ تقدیر میں ثبت ہو چکا ہے جس کے اندر ردوبدل کا امکان نہیں ہے کیونکہ وہ ہر مخلوق کی دست برد سے بالاتر ہے۔

لا یمسه الا المطهرون: یہ تردید ہے کفار کے ان الزامات کی جو وہ قرآن پر لگایا

کرتے تھے وہ رسول اللہ ﷺ کو کاہن قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کلام اس پر جن اور شیاطین القا کرتے ہیں اس کا جواب قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دیا گیا ہے مثلاً سورت الشعراء میں ارشاد ہوا ہے۔

وماتنزلت به الشياطين O وما ينبغي لهم ومايستطيعون O انهم عن السمع لمعزو لون O ۔اس کو لے کر شیاطین نہیں اترے ہیں نہ یہ کلام ان کو سجتا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں۔اسی مضمون کو یہاں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔یعنی شیاطین کا اسے لانا یا اس کے نزدل کے وقت اس میں دخل انداز ہونا تو درکنار جس وقت یہ لوح محفوظ سے نبی ﷺ پر نازل کیا جاتا ہے اس وقت مطہرین یعنی پاک فرشتوں کے سوا کوئی قریب پھٹک بھی نہیں سکتا۔

فرشتوں کے لیے مطہرین کا لفظ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے ان کو ہر قسم کے ناپاک جذبات سے اور خواہشات سے پاک رکھا ہے۔یہاں قرآن مجید کے بارے میں کفارِ مکہ کے جھوٹے گمانوں کی تردید کی جارہی ہے اور مواقع النجوم کی قسم کھا کر یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے اللہ تعالی کے محفوظ نوشتے میں ثبت ہے جس میں کسی مخلوق کی وراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے اور نبی پر ایسے طریقے سے نازل ہوتی ہے کہ پاکیزہ فرشتوں کے سوا کوئی اسے چھو تک نہیں سکتا۔

یہاں (لا) فعل قسم سے متصل نہیں ہے بلکہ اس سے بالکل الگ ہے اثبات سے پہلے یہ نفی مخاطب کے زعمِ باطل کی تردید کے لئے آتی ہے۔اس طرح نفی کا لانا عربی زبان اور قرآن میں معروف ہے۔لا کے ذریعہ سے مخاطبوں کے اس زعم باطل کی تردید فرمائی کہ قرآن العیاذ باللہ کاہنوں کا مزخرف کلام یا کوئی شیطانی القاء ہے اس کے بعد قسم کھا کر قرآن کی عظمت و تقدیس اور اس کے وحی الہی ہونے کا ذکر فرمایا یہ اسلوبِ کلام ایک فطری اسلوبِ کلام ہے اس وجہ سے ہر زبان میں موجود ہے ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب

معروف ہے۔ جب آپ کہتے ہیں نہیں خدا کی قسم اصل حقیقت یوں ہے تو یہی اسلوب استعمال کرتے ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کے اثبات سے پہلے مخاطب یا معترض کے خیال یا اعتراض کی تردید کر دیں اس اسلوب کلام میں بلاغت یہ ہے کہ گویا معترض کا اعتراض اتنا لغو ہے کہ متکلم ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اتنا بھی توقف گوارا نہیں ہے کہ صحیح پہلو کی وضاحت کرنے کے بعد اس کی تردید کرے۔ ❶

وانه لقسم لو تعلمون عظيم : یہ قسم اور مقسم علیہ کے درمیان ایک برمحل جملہ معترضہ ہے قسمیں جتنی قرآن مجید میں ہیں بوجہ دلالت علی المطلوب کے سب عظیم ہیں لیکن کہیں کہیں مطلوب کے خاص اہتمام اور اس پر زیادہ متنبہ کرنے کے لئے عظیم ہونے کی تصریح بھی فرمادی ہے جیسا کہ اس سورت الواقعہ میں اور سورت الفجر میں ہے۔ ❷

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کلام میں دو معترضہ جملے آئے ہیں ان میں سے ایک وانه لقسم لو تعلمون عظيم ہے کیونکہ یہ قسم فلا اقسم بمواقع النجوم اور اس کے جواب انه لقرآن كريم کے درمیان آیا ہے اور پھر اس جملہ معترضہ کے اندر ایک اور جملہ معترضہ آیا ہے جو موصوف قسم اور اس کی صفت عظیم کے درمیان ہے اور وہ ہے اللہ تعالی کا فرمان لو تعلمون تو یہ دو جملے معترضہ ہیں قسم اور اس کے جواب کے درمیان اس کے درمیان لانے کا فائدہ سامع کے دل میں مقسم بہ کی شان کو بڑا اور عظیم بنانا مقصود ہے۔ ❸

ابن قیم علیہ الرحمۃ نے التبیان فی اقسام القرآن میں جملہ معترضہ لانے کے فوائد پر قرآنی امثلہ کے ذریعے اچھی بحث کی ہے۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت کی ایک صورت بعض نے یہ ذکر کی ہے کہ

❶ تدبر القرآن

❷ معارف القرآن

❸ بدائع التفاسیر بحوالہ الفوائد المشوقہ

اللہ عز وجل نے چاند سورج اور تمام ستاروں کا نہایت محکم اور عجیب وغریب نظام قائم کیا یہ ستارے عظمت و وحدانیت اور قاہرانہ تصرف واقتدار کا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہیں اور زبان حال سے شہادت دیتے ہیں کہ جس اعلیٰ و برتر ہستی اور سلطنت غیبیہ کے ہاتھ میں ہماری باگ ڈور ہے وہ ہی اکیلا بادل، پانی، آگ، ہوا، مٹی اور کائنات کے ذرے ذرے کا مالک وخالق ہوگا۔ کیا ایسے روشن آسمانی نشانات کو دیکھ کر ان مضامین کی صداقت میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے جو اس سے پہلے بیان ہوئے ہیں اور کیا ایک عاقل اس عظیم الشان نظامِ فلکی پر نظر ڈال کر اتنا نہیں سمجھ سکتا کہ ایک دوسرا باطنی نظامِ شمسی بھی جو قرآن کریم اور اس کی آیات یا تمام کتب وصحائف سماویہ سے عبارت ہے اسی پروردگار عالم کا قائم کیا ہوا ہے جس نے اپنی قدرت ورحمت کاملہ سے یہ ظاہری نظام قائم فرمایا وہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے جس نے روحانی ستاروں کے غروب ہونے کے بعد آفتاب قرآن کو چمکایا اور اپنی مخلوق کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا آج تک یہ آفتاب برابر چمک رہا ہے کس کی مجال ہے جو اس کو بدل سکے یا غائب کردے۔

لا یمسه الا المطهرون بعض نے اس آیت میں نفی کو بمعنی نہی کے لے کر یہ کہا ہے کہ قرآن کو بے وضو چھونا اور اس کی تلاوت کرنا جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس میں صرف ایک بات کی خبر دی جارہی ہے اس کو چھونے یا نہ چھونے کا حکم بیان نہیں کیا جارہا اور اس سلسلے میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں جن میں جنبی یا حائضہ اور نفاس والی عورت کے لئے قرآن مجید کی تلاوت کو ممنوع بتلایا گیا ہے وہ سنداً ضعیف ہیں کوئی صحیح اور صریح نص ایسی نہیں ہے جو ایسی عورتوں کو قرآن مجید کی تلاوت سے روکتی ہو۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، سعید بن مسیب اور اہلِ ظاہر اور امام بخاری اور طبری اور ابن المنذر اور علامہ شوکانی اور علامہ البانی رحمہم اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ جنبی کے لئے قرآن کی تلاوت جائز ہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ فقہاء نے قرآن مجید پڑھنے اور اس کو ہاتھ لگانے کے لئے جو شرائط بیان کی ہیں کوئی بھی قرآن وسنت سے ثابت نہیں

ہے۔جن فقہاء نے قرآن کی زبانی تلاوت یا اس کو ہاتھ لگانے کے لئے بھی طہارت کی وہ شرطیں عائد کی ہیں جو نماز کے لئے ضروری ہیں ان کے اقوال غلو پر مبنی ہیں قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس وجہ سے وہ ہر پہلو سے لائق تکریم ہے لیکن وہ ہمارے لئے ہر قدم پر حق و باطل اور خیر و شر کے جاننے کا ذریعہ، اخذ و استنباط کا حوالہ اور استدلال کا مرکز بھی ہے اگر اس کو ہاتھ لگانے یا اس کی کسی سورت یا آیت کی تلاوت کرنے یا حوالہ دینے کے لئے بھی آدمی کا طاہر و مطہر اور باوضو ہونا ضروری قرار پائے تو یہ ایک ایسی تکلیف مالا یطاق ہوگی جو دین فطرت کے مزاج کے خلاف ہے۔ ❶

حافظ عبدالمنان نور پوری حفظہ اللہ فرماتے ہیں جنبی مرد یا حائضہ عورت قرآن مجید زبانی پڑھ سکتے ہیں ہاتھ نہیں لگا سکتے نہ ہی چھو سکتے ہیں سنن دارمی (۸۴/۲) ''باب لا طلاق قبل نکاح ،، میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

﴿لَا يَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ﴾

ترجمہ: (نہ چھووے قرآن کو مگر پاک)

قرآن مجید کی آیت:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾

ترجمہ: (اور اگر تم ناپاک ہو تو پاکی حاصل کرو) سے ثابت ہورتا ہے جنبی طاہر نہیں ورنہ اسے فاطهروا کا حکم نہ ہوتا اور جو طاہر نہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے مندرجہ بالا فرمان کی رو سے قرآن مجید کو چھو نہیں سکتا تو پکڑ بھی نہیں سکتا اور معلوم ہے کہ حائضہ بھی طاہر نہیں کیونکہ اطہار و تطہر کا جنبی کی طرح اس کو بھی حکم ہے۔ ❷

---

❶ تدبر القرآن

❷ احکام و مسائل

(۲۱) سورت التغابن

﴿زَعَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ﴾ (آیت ۷)

''منکرین نے بڑے دعوے سے کہا ہے کہ مرنیکے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے ان سے کہو نہیں میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر ضرور تمھیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ کیا ہے اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے بہت آسان ہے۔''

ہر زمانے میں منکرینِ حق جس بنیادی گمراہی میں مبتلا رہے ہیں اور جو بالآخر ان کی تباہی کا موجب ہوئی وہ یہ تھی۔ اگر چہ کسی منکرِ آخرت کے پاس نہ پہلے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا، نہ آج ہے نہ کبھی ہوسکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے لیکن ان نادانوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ یہی دعویٰ کیا ہے حالانکہ قطعیت کے ساتھ آخرت کا انکار کردینے کے لئے نہ کوئی عقلی بنیاد موجود ہے نہ علمی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک منکرِ آخرت کیلئے آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اسے آخرت کے آنے کی خبر قسم کھا کر دیں یا قسم کھائے بغیر دیں وہ جب اس چیز کو نہیں مانتا تو محض اس بنا پر کیسے مان لے گا کہ آپ قسم کھا کر اس سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو رسول اللہ ﷺ کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی علم اور تجربے کی بنا پر یہ بات خوب جانتے تھے کہ اس شخص نے کبھی عمر بھر جھوٹ نہیں بولا ہے اس لئے چاہے زبان سے وہ آپ کے خلاف کیسے ہی بہتان گھڑتے رہے ہوں اپنے دلوں میں وہ یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ ایسا سچا انسان کبھی خدا کی قسم کھا کر وہ بات کہہ سکتا ہے جس

کے برحق ہونے کا اسے کامل یقین نہ ہو دوسرے یہ کہ آپ ﷺ محض آخرت کا عقیدہ ہی بیان نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے لئے نہایت معقول دلائل بھی پیش فرماتے تھے۔

ثم لتنبؤن بما عملتم: یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے بنی آدم کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اسی میں اس سوال کا جواب بھی ہے کہ ایسا کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے اس برحق کائنات میں جس مخلوق کو کفر و ایمان میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہو اور جسے اس کائنات میں بہت سی چیزوں پر تصرف کا اقتدار بھی عطا کیا گیا ہو اور جس نے کفر یا ایمان کی راہ اختیار کر کے بہت سی بھلائیاں یا بہت سی برائیاں خود اپنی ذمہ داری پر کی ہوں اس کے بارے میں یہ تصور کرنا انتہائی غیر معقول ہے کہ یہ سب کچھ جب وہ کر چکے تو آخر کار بھلے کی بھلائی اور برے کی برائی دونوں بے نتیجہ رہیں اور سرے سے کوئی وقت ایسا آئے ہی نہیں جب اس مخلوق کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو۔ جو شخص ایسی غیر معقول بات کہتا ہے وہ لامحالہ دو حماقتوں میں سے ایک حماقت کا ارتکاب کرتا ہے، یا تو وہ یہ سمجھتا کہ یہ کائنات ہے تو مبنی بر حکمت مگر یہاں انسان جیسی بااختیار مخلوق کو غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک الل ٹپ بنی ہوئی کائنات ہے جسے بنانے میں سرے سے کسی حکیم کی حکمت کارفرما نہیں ہے پہلی صورت میں وہ ایک متناقض بات کہتا ہے کیونکہ مبنی بر حکمت کائنات میں ایک بااختیار مخلوق کو غیر ذمہ دار ہونا صریحاً خلاف عدل و حکمت ہے اور دوسری صورت میں وہ اس بات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایک الل ٹپ بنی ہوئی بے حکمت کائنات میں انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا وجود میں آنا آخر ممکن کیسے ہوا اور اس کے ذہن میں عدل و انصاف کا تصور کہاں سے آ گیا؟ بے عقلی سے عقل کی پیدائش اور بے عدلی سے عدل کا تصور برآمد ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا قائل یا تو ایک ہٹ دھرم آدمی ہو سکتا ہے یا پھر وہ جو بہت زیادہ فلسفہ بگھارتے بگھارتے دماغی مریض ہو چکا ہے۔

وذلك على الله يسير: یہ آخرت کی دوسری دلیل ہے پہلی دلیل آخرت کے

ضروری ہونے کی تھی اور یہ دلیل اس کے ممکن ہونے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس اللہ تعالیٰ کے لئے کائنات کا اتنا بڑا انظام بنا دینا دشوار نہ تھا اور جس کے لئے اس دنیا میں انسانوں کو پیدا کرنا دشوار نہیں ہے اس کے لئے یہ بات آخر کیوں دشوار ہوگی کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اپنے سامنے حاضر کرے اور ان کا حساب لے۔

اسلامی عقیدے کی رو سے آخرت پر ایمان نہایت ضروری ہے اس کے بغیر توحید و رسالت کا عقیدہ بھی درست نہیں ہوتا اگر آخرت کا حساب و کتاب اور جزاء سزا برحق نہیں تو کوئی آخر توحید و سالت پر ایمان کیوں لائے؟ اس پر ایمان نہ لانے سے اس کے علم و عمل میں کیا تبدیلی واقع ہو جائے گی؟ یہی سبب ہے کہ قرآن نے بعث و نشور کے معاملے کو اس قدر اہمیت دی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اہمیت جتانے کا حکم دیا۔

اللہ تعالی منکرینِ بعث کے قول کو زعم کے لفظ سے ظاہر فرمایا ہے یعنی یہ ان کا فقط ایک زعم ہے جو جھوٹا ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قسم کھا کر کہنے کو کہا گیا ہے کہ ان منکروں کا قول بالکل غلط بعث و نشور اور حساب و کتاب برحق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسم کے بعد تاکید کا اور کونسا درجہ رہ جاتا ہے؟ اس عنوان سے اور عبارت کے اس طرح لانے سے جو تاکید شدید پیدا ہوئی ہے وہ کسی اور لفظ سے کسی اور عبارت سے اور کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا صدق دشمنوں کو بھی معلوم تھا کہ صادق القول ہیں شروع سے آپ ﷺ کا نام صادق الامین تھا عناد کی بات اور ہے ورنہ یقین کرنے والوں کیلئے اس سے زیادہ مؤکد طریقہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالی سے کچھ پوشیدہ نہیں قسم میں بعث کے اثبات کے علاوہ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ذرہ ذرہ تم پر واضح کیا جائے گا اور یہ بات اللہ تعالی پر نہایت آسان ہے ظاہر و باطن، زمان و مکان اور کائنات کے ہر ذرے کا اس کو علم ہے۔

جس زور و تاکید کے ساتھ یہ لوگ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا انکار کر رہے ہیں

اسی زور و تاکید کے ساتھ بقید قسم تم ان کو جواب دو کہ ہاں میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

اگر چہ اس فقرے میں دلیل کا پہلو نمایاں نہیں بلکہ دعویٰ کا جواب بظاہر دعویٰ ہی سے دیا گیا ہے اس لئے کہ یہ بات منکرین کے بے دلیل دعویٰ کے جواب میں کہلائی گئی ہے لیکن وربی کی قسم میں دلیل کا بھی ایک لطیف پہلو مضمر ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جس کی شانیں اس کائنات کے ہر گوشہ میں نمایاں ہیں اس بات کو واجب کرتی ہیں کہ وہ نیکوکار اور بدکار دونوں کے ساتھ ایک طرح کا معاملہ نہیں کرے گا بلکہ لازماً وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ دے گا اور بدوں کو ان کی بدی کی سزا۔ اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد لوگوں کو اٹھائے، ان کا حساب لے اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔

یہ عقیدہ کہ قیامت والے دن دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے یہ کافروں کا محض گمان ہے جس کی پشت پر دلیل کوئی نہیں۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے رب کی قسم کھا کر یہ اعلان کرے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ ضرور زندہ فرمائے گا ایک یہ مقام اور دوسرا سورۃ یونس آیت ۵۳، تیسرا سورۃ سبا آیت ۳۔

دنیا میں جزا سزا بالعموم مکمل شکل میں نہیں ملتی اگر قیامت والے دن بھی مکمل جزا سزا کا اہتمام نہ ہو تو دنیا ایک کھلنڈرے کا کھیل وفعلِ عبث قرار پائے گی جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی باتوں سے بہت بلند ہے اس کا تو کوئی فعل عبث نہیں۔ ❶

بلی و ربی کے ٹکڑے سے مقصود عربی اسلوب بیان کے مطابق تاکید کلام اور وقوعِ حشر میں قطعیت پیدا کرنا ہے۔ و ذلك علی الله یسیر حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت کا استحضار اگر ذہن میں رہے تو وقوع حشر میں کوئی استبعاد ذرا سا بھی نہ رہے۔

❶ احسن البیان

جولوگ حشر کے منکر ہیں قرآن شریف میں طرح طرح سے اللہ تعالی نے ان کو قائل کیا ہے کہیں فرمایا گیا کہ ایک دفعہ اللہ تعالی نے جو تمام جہان پیدا کیا ہے وہ تو ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہے اور یہ ہر انسان کا عقلی تجربہ ہے کہ جو کام ایک دفعہ ہو چکتا ہے دوسری دفعہ اس کا کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے پھر کون سی عقل سے یہ لوگ حشر کا انکار کرتے ہیں کہیں فرمایا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالی نے کچھ عقل دی ہے وہ جو کام کرتا ہے وہ کسی مصلحت اور فائدے کیلئے کرتا ہے وہ رب العالمین جس نے سب عقل مندوں کو پیدا کیا ہے اس کے کام کو یہ لوگ بے فائدہ اور عبث کیوں ٹھہراتے ہیں اتنا نہیں سمجھتے کہ جزا سزا کا ایک دن نہ ہو اور نیک اور بد کو ایک ہی حال پر چھوڑ دیا جائے تو جہان کا پیدا کرنا عبث اور بے فائدہ ٹھہرے گا۔ لیکن منکروں کے انکار کا جواب اپنے رسول کو قسم کھا کر یہ دینے کو فرمایا ہے کہ ضرور ایک دن حشر ہوگا اس طرح کا جواب اس لیے دیا گیا کہ انسان کی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ قسم کھا کر جو بات کہی جائے اس کا انسان کو اعتبار ہو جاتا ہے۔

اس قدر سمجھانے اور قسم کھانے کے بعد بھی جن لوگوں کو حشر کا انکار ہے یا جو لوگ زبان سے تو حشر کا اقرار کرتے ہیں مگر اپنے اس اقرار کے پابند ہو کر حشر کا سامان پورا نہیں کرتے ایسے لوگوں کا حال قابل افسوس ہے۔ [1]

وربی میں واؤ حرف قسم ربی مقسم بہ ہے اور لتبعثن ثم لتنبؤن بما عملتم و ذلك على الله يسير جوابِ قسم ہے۔

بلی حرف دو معنوں میں سے ایک کے لئے استعمال ہوتا ہے (۱) نفی کی تردید کے لئے جیسے سورۃ تغابن کی آیت نمبرے میں (۲) اس استفہام کے جواب کے لئے جو نفی کے ساتھ ملا ہوا ہو جیسے الست بربکم قالوا بلی ۔

❁ ❁ ❁

---

[1] احسن التفاسیر

(۲۲) سورت القلم

﴿ نٓ وَالْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْ نَ ○مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ○وَ اِنَّ لَکَ لَاَ جْرًا غَيْرَ مَمْنُوْ نٍ ○وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○﴾

''قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو اور یقیناً تمھارے لیے ایسا اجر ہے جسکا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔''

مخالفین کے اعتراض کا جواب قسم کے ساتھ دیا جارہا ہے۔ارشاد ہوا ہے کہ یہ کفار تم کو دیوانہ کہتے ہیں حالانکہ جو کتاب تم پیش کررہے ہو اور اخلاق کے جس اعلی مرتبے پر تم فائز ہو وہ خود انکے اس جھوٹ کی تردید کے لیے کافی ہے عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب سب ہی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون تھا اور فرضانہ کون؟

والقلم وما يسطرون: مقسم بہ ہے جس کی قسم اٹھائی جارہی ہے اور ما ا نت بنعمة ربك بمجنو ن وا نك لا جرا غير ممنو ن وان لك لعلى خلق عظيم: مقسم علیہ ہے یہ وہ باتیں ہیں جن پر قلم اور کتاب کی قسم کھائی گئی ہے قرآن میں قسمیں کسی دعوے پر شہادت کی لئے کھائی گئی ہیں یہاں دعوے کے طور پر تین باتیں مذکور ہیں جن کو ثابت کرنے کی لئے یہ قسم کھائی گئی ہے ❶

ایک یہ کہ مخالفین آپ ﷺ کو دیوانہ کہتے ہیں یہ انکی خرد باختگی ہے آپ دیوانے نہیں بلکہ اللہ تعالی کے فضل سے تمام فرضانوں سے بڑھکر فرضانے ہیں دوسری یہ کہ مخالفین

❶ تدبر القرآن

جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کی یہ ساری سرگرمیاں چندروزہ ہیں جو بہت جلد ہوا میں اڑ جائیں گی یہ بالکل غلط ہے آپ کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ تیسری جو کہ آپ اعلیٰ کردار کے مالک ہیں اس وجہ سے جولوگ آپکو شاعرُ کاہن یا دیوانہ سمجھ کرنظر انداز کررہے ہیں وہ اپنی شامت کودعوت دے رہے ہیں ان دعووں پرقرآن میں جگہ جگہ خودقرآن ہی کوشہادت میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ قرآن جو کاتبینِ وحی کے ہاتھوں سے ثبت ہورہا ہے بجائے خود کفار کے اس بہتان کی تردید کے لیے کافی ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ مجنون ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت سے پہلے آپ کو وہ اپنی قوم کا بہترین آدمی مانتے تھے اور آپکی دیانت وامانت اور عقل وفراست پراعتماد رکھتے تھے مگر جب آپ نے انکے سامنے قرآن پیش کرنا شروع کیا تو وہ آپ کو دیوانہ قرار دینے لگے اس کے معنی یہ تھے کہ قرآن ہی انکے نزدیک وہ سبب تھا کہ جس کی بنا پرانہوں نے آپ پر دیوانگی کی تہمت لگائی۔ اس لئے فرمایا گیا کہ قرآن ہی اس تہمت کی تردید کے لیے کافی ثبوت ہے یہ اعلیٰ درجے کا فصیح وبلیغ کلام جوایسے بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے اس کا پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کا خاص فضل ہوا ہے کجا کہ اسے اس امر کی دلیل بنایا جائے کہ آپ معاذ اللہ دیوانے ہوگئے ہیں۔ یہاں خطاب تو بظاہر نبی ﷺ سے ہے لیکن اصل مقصود کفار کوانکی تہمت کا جواب دینا ہے۔ مدعا کفار سے یہ کہنا ہے کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اس کے پیش کرنے والے کو مجنون کہہ رہے ہو وہی تمھارے اس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ ❶

کفارِ مکہ کے سامنے جب آپ قیامت اور حشر ونشر اور حساب وکتاب اور جزاء وسزا اور جنت وجہنم کی باتیں کرتے تھے اوران مضامین پر مشتمل قرآن مجید کی آیات اس دعوے کے ساتھ ان کو سناتے تھے کہ یہ خبریں اللہ عزوجل کی طرف سے میرے پاس آئی ہیں

---

❶ تفہیم القرآن

اور یہ اللہ عزوجل کا کلام ہے جو مجھ پر وحی کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے تو ان کے سردار اور مذہبی پیشوا اور اوباش لوگ آپکی ان باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ نہ خود غور کرتے تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ عوام انکی طرف توجہ کریں اس لئے وہ آپکے اوپر یہ فقرہ کستے تھے کہ آپ کاہن ہیں اور کبھی یہ کہ آپ مجنون ہیں اور کبھی یہ کہ آپ ﷺ خود اپنے دل سے یہ نرالی باتیں گھڑتے ہیں محض اپنا رنگ جمانے کے لئے انہیں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ وحی کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ انکا خیال یہ تھا کہ اس طرح کے فقرے کس کر وہ لوگوں کو آپ ﷺ کی طرف سے بدگمان کردیں گے اور آپکی ساری باتیں ہوا میں اڑ جائیں گی جیسے فرمایا فذکر فما انت بنعمة ربك بكاهن ولا مجنون (الطور ۲۹) کہ اے نبی آپ ان لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہ کرو اور بندگان خدا کو غفلت سے چونکانے اور حقیقت سے خبردار کرنیکا کام کرتے چلے جاؤ کیونکہ خدا کے فضل سے نہ تم کاہن ہو نہ مجنون۔ کفارِ مکہ آپ پر جنون کا الزام محض اپنے دل کی تسلی کے لیے لگاتے تھے جیسے موجودہ زمانے کے بعض بے شرم مغربی مصنفین اسلام کے خلاف اپنے بغض کی آگ ٹھنڈی کرنے کیلئے یہ دعوی کرتے ہیں کہ معاذ اللہ حضور ﷺ پر مرگی کے دورے پڑتے تھے اور انہی دوروں کی حالت میں جو کچھ آپ کی زبان سے نکلتا تھا اسے لوگ وحی سمجھتے تھے ایسے بے ہودہ الزامات کو کسی صاحب عقل آدمی نے نہ اس زمانے میں قابلِ اعتناء سمجھا تھا نہ آج کوئی شخص قرآن کو پڑھ کر اور رسول اللہ ﷺ کی قیادت اور رہنمائی کے حیرت انگیز کارنامے دیکھ کر یہ باور کرسکتا ہے کہ سب کچھ مرگی کے دوروں کا کرشمہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کو مجنوں کہنے کیوجہ یہ تھی کہ قریش کے لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آپ جس عذاب سے ان کو اس شدومد اور جزم ویقین کیساتھ ڈرا رہے ہیں کہ گویا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں آخر وہ کدھر سے آجائے گا ان کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ آپ ﷺ کے لب ولہجہ میں جو غیر معمولی جزم ویقین آپ کے اندازِ دعوت میں جو مافوق العادت بے چینی و بے قراری اور آپ کی تذکیر میں دلوں کو ہلا دینے

والی جودردمندی وشفقت ہے اس سے ان کے عوام متاثر ہورہے ہیں اس اثر کوزائل کرنے کیلئے انہوں نے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ اس شخص کی یہ ساری بے چینی و بے قراری اس وجہ سے نہیں ہے کہ فی الواقع کوئی عذاب آنے والا ہے۔ جس سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ تعالی نے اس کو بھیجا ہے۔ بلکہ بعض اشخاص کو جس طرح کسی چیز کا مالی خولیہ ہو جاتا ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے اسکی رٹ لگائے رکھتے ہیں اسی طرح اس شخص کو بھی عذاب کا مالی خولیہ ہو گیا ہے جو اس کو ہر طرف سے آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس بات کو تقویت دینے کے لیے اس پر وہ یہ اضافہ کر دیتے کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کے سبب سے اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی ہے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

اللہ تعالی نے قرآن پاک کو قسم کی شکل میں ان کے سامنے پیش کیا ہے جو آنحضرت ﷺ کی صداقت وامانت اور رسالت کی دلیل ہے کہ جو شخص ایسا اعلی اور برتر کلام پیش کر رہا ہے اسے یہ دیکھیں اور انصاف سے فیصلہ کریں کہ یہ کسی دیوانے یا کاہن یا شاعر کا کلام ہوسکتا ہے یا اللہ تعالی کا۔ اگر یہ مدعیانِ دانش اس جرم میں تمھیں دیوانہ کہہ رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو ما انت بنعمت ربك بمجنو ن: تم دیوانے نہیں بلکہ آپ ﷺ رب کے سب سے بڑے فضل سے بہرہ مند ہیں البتہ ان دانش فروشوں کی عقل ماری گئی ہے یہ دیوانے اور فرزانے میں امتیاز کرنے سے قاصر ہیں۔

سیرتِ رسول کو پڑھنے والا اس بات پر حیران رہ جاتا ہے کہ ایک طرف تو مشرکین مکہ آپ کو نہایت عاقل وفرزانہ، صادق وامین اور اعلی انسانی واخلاقی صفات کا مالک ٹھہراتے تھے مگر دوسری طرف آپ ﷺ پر جنون کا الزام لگاتے تھے آپ کے فیصلے کو عاقلانہ قرار دے کر سب آپ کے سامنے جھک گئے اور کشت وخون کا خطرہ یکسر ٹل گیا جیسا کہ تعمیرِ کعبہ کے وقت حجر اسود کو اس کی جگہ لگانے پر ہوا تھا۔ وہ آپ کو امین قرار دیکر ہجرت کی رات تک اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھتے رہے شب ہجرت میں آپ کے گھر میں ان دشمنوں کی امانتیں پڑی تھیں جو آپ کے خون کے پیاسے تھے یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آنحضور ﷺ نے

امانتیں واپس کرنے کے لئے علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑا تھا بعثت سے قبل تک وہ آپ پر ایک چھوٹا سا جھوٹ بھی نہیں لگا سکے۔ شاہِ روم کے دربار میں ابوسفیانؓ نے علانیہ آپ کے صدق وامانت اور عفاف کی شہادت دی حالانکہ ابوسفیان اس وقت آپ کے شدید دشمن تھے اور ہرقل نے کہا تھا کہ جب وہ لوگوں پر جھوٹ نہیں بولتا تو اللہ تعالی پر کیونکر جھوٹ بول سکتا ہے۔

آپ ﷺ کے خلاف دیوانگی، شاعر ہونے، کاہن ہونے کے الزامات اس شدید حسد وبغض اور عداوت کا نتیجہ تھا جو مشرکین کے دل میں آپ کے خلاف دعوتِ حق کے باعث پیدا ہوا تھا۔ حسد وبغض نے انہیں اندھا بہرا بنا دیا تھا۔ انسان کی ذاتی وگروہی اغراض اسے بے جھجک بہتان تراشنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ آپ پر یہ الزام دھرنے والے سب لوگوں سے زیادہ جانتے تھے کر وہ جھوٹے تھے دشمن تھے خودغرض تھے اللہ تعالی نے بڑی آہستگی مہربانی اور شفقت سے آپ پر سے یہ الزام اٹھایا اور آپ کی تکریم کی اور فرمایا تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کوئی دیوانہ نہیں۔ ❶

دوسری بات جس پر قسم کھائی گئی ہے اور جو اس قسم کا مقسم علیہ ہے وہ وان لك لا جرا غير ممنون یعنی اور تمھارے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں آپ کے لیے اس بات پر بے حساب اور لازوال اجر ہے کہ آپ خلقِ خدا کی ہدایت کیلیے جو کوشش کر رہے ہیں انکے جواب میں آپ کو ایسی ایسی اذیت ناک باتیں سننی پڑتی رہی ہیں پھر بھی آپ اپنے اس فرض کو انجام دے چلے جا رہے ہیں۔

مفسرین کا اس بارے اختلاف ہے کہ آپ کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر کس بنا پر آپکو حاصل ہوا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس طعن وتنقید اور قبیح بات کے برداشت کرنے پر آپ کو دائمی اور بہت بڑا اجر ملے گا۔ اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مخلوق کو اللہ تعالی کی طرف

---

❶ تفسير فی ظلا ل القرآن

دعوت دینے کے سلسلہ میں معجزات اور نبوت کے اظہار میں اور مخلوق کے لیے شریعت کے بیان کرنے میں خالص دائمی اجر ہے۔ کفار کا آپکو جنون کی طرف منسوب کرنا اس بڑے اہم کام کے ساتھ مشغولِ ہونے سے نہ روکے کیونکہ آپ کو اس کی وجہ سے اللہ تعالی کے ہاں بلند مقام ملے گا۔[1]

قلم اور قرآن آپ کے لیے نہ ختم ہونے والے اجر کی اس طرح شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں ولسوف یعطیك ربك فترضی: کہ عنقریب آپ کو آپکا پروردگار اتنا کچھ عنائت فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے اور سورۃ والتین میں اللہ تعالی فرماتے ہیں ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور آنجناب ﷺ میں ایمان اور عمل صالح علی وجہ الاتم موجود تھے۔ لہذا وہ لوگ احمق ہیں جو آپ کو دیوانہ سمجھ کر تمہارے لئے گردشِ روزگار کے منتظر ہیں جو ان کے خیال میں تمہیں تباہ کر دے گی۔ تباہی تمہارے لیے نہیں بلکہ ان کیلئے مقدر ہے تمہارے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور مغروروں کو جو دنیا ملی ہے اور جس پر یہ نازاں ہیں یہ سب عذاب کی زد میں ہیں اور بہت جلد یہ اس کا انجام دیکھ لیں گے۔۔ لیکن تمہیں تمہاری حق پرستی کا جو صلہ ملنے والا ہے وہ ابدی ہے جس کیلئے کوئی زوال نہیں قلم اور قرآن اس پر شہادت دے رہے ہیں۔

تیسری چیز جس پر قلم اور قرآن کی قسم اٹھائی جا رہی ہے وہ انك لعلی خلق عظیم ہے اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہو۔ قلم اور قرآن اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ آپ ﷺ بڑے بلند مرتبے پر فائز ہیں قرآن نے جو اعلی اخلاق ذکر فرمائے ہیں آپ ان کے ساتھ متصف ہیں اور جن بری عادات سے قرآن نے منع کیا ہے آپ ﷺ ان کے قریب بھی نہ جاتے تھے۔ رسول کریم ﷺ کے اخلاق کی بہترین تعریف

---

[1] التفسیر الکبیر للرازی

خود حضرت عائشہ نے اپنے اس قول میں فرمائی ہے کہ کان خلقه القرآن قرآن آپکا اخلاق تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول ﷺ نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ اس کا مجسم نمونہ بن کر دکھا دیا تھا۔ جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا آپ نے سب سے بڑھ کر اس پر عمل کیا۔ جس چیز سے آپ کو روکا گیا آپنے خود سب سے زیادہ اس سے اجتناب فرمایا۔ جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا آپ سب سے زیادہ بڑھ کر اس سے متصف تھے اور جن صفات کو اسمیں ناپسندیدہ ٹھرایا گیا سب سے زیادہ آپ ان سے پاک تھے۔

ایک روایت میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول ﷺ نے کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ کبھی آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا، اپنی ذات کیلئے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپکو پہنچائی گئی ہو الا یہ اللہ کی حرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپ نے اللہ تعالی کی خاطر اسکا بدلہ لیا ہو اور آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب دو کاموں میں سے ایک کا آپ کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ آسان تر کام کو پسند کرتے مگر یہ کہ وہ گناہ ہو اور اگر کوئی گناہ کا کام ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے۔ ❶

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی ہے آپ نے کبھی میری کسی بات پر اف تک نہ کی، کبھی میرے کام پر یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کیوں کیا اور کبھی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کیوں نہ کیا۔ ❷

آپ ﷺ کا بلند اور ارفع اخلاق وہ حقیقت ہے کہ اسکی شہادت اللہ تعالی نے خود دی ہے کہ بلاشبہ آپ خلق عظیم پر ہیں۔ آپکی یہ بے مثال ثناء کائنات کے گوشوں میں گونج

---

❶ مسند احمد

❷ بخاری ومسلم

رہی ہے۔ وجود کا ہر ذرہ اسکا گواہ ہے رب کائنات کی شہادت کا یہ کلمہ اس قدر وزنی اور اتنا قیمتی ہے کہ قلم' تصور اور احساس اس کے بیان اور گہرائی کے اظہار سے عاجز ہیں۔ یہ ربِ کائنات کی شہادت اپنے اصلی اور بے مثال بندے کے حق میں ہے۔ دوست و دشمن آپ کے خلق عظیم کے معترف ہیں غیر مسلم بھی اس کے گواہ ہیں۔ آپکے قریب ترین، رازدانِ نبوت اور مزاج شناسانِ رسالت کی زبانی آپکے خلق عظیم کی بے شمار روایات' حدیث و سیرت اور تاریخ میں وارد ہوئی ہیں آپکی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس شہادت کی بین دلیل ہے۔ لیکن اللہ تعالی کا قلم اور قرآن کی قسم اٹھا کر یہ شہادت دینا سب سے بڑی اور واضح دلیل ہے۔ یہ خدائی گواہی ہے جو اللہ تعالی کے سب سے بڑے رسول ﷺ نے اللہ تعالی کی طرف سے حاصل کی اور اس کے بعد مضبوط و ثابت قدم اور مطمئن رہے بندوں پر فخر و تکبر نہ کیا' اظہارِ کبر نہ کیا حالانکہ وہ اللہ تعالی سے اتنی بڑی بات حاصل کر چکے تھے جو کسی نے کبھی نہ کی تھی یہ بھی خلق عظیم کا ایک حصہ تھا۔

اللہ تعالی کو معلوم تھا کہ یہ رسول مہبطِ وحی اور مصدرِ خلق عظیم ہونے اور اپنی ذاتی صفات میں اعلی ترین مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود مغرور نہ ہوگا۔ وہ اس خلق عظیم کا واقعی عملاً بھی حقدار ہونگے اس آخری رسالت کی حامل وہی شخصیت ہوسکتی تھی جس کی رسالت میں جمال، کمال عظمت و رفعت' صداقت و حقانیت اتنی عظیم ہو کہ وہ خلق عظیم کی صفت کا مالک ہو اس کا بار برداشت کر سکے اور جب یہ مقام اس کو مل جائے تو اپنے توازن و اعتدال اور اطمینان پر حسبِ سابق قائم رہے اس کا حوصلہ اتنا بلند ہو' شخصیت اتنی بڑی ہو کہ مقام رفیع کو پاکر' اس ثناء کو سن کر بطر و ریا کا شکار نہ ہو سکے وہ اس عظیم تعریف کا تحمل بھی اس طرح کرے جس طرح اللہ تعالی کی طرف سے بعض تربیتی عتابات کا کرے۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ کے خلقِ عظیم کو قلم اور قرآن کی قسم اٹھا کر اتنا

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن

کیوں سراہا ہے غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ دراصل حقیقتِ اسلام میں اخلاق کی وہی قدر و قیمت ہے جو حقیقتِ محمد یہ میں ہے ﷺ۔ جس شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور اسلامی عقیدے کو غور سے دیکھا ہے وہ یہ جاننے میں زیادہ مشکل محسوس نہ کرے گا کہ اسلامی عقیدے، قانونی وتہذیبی اصول اخلاق کی بنیاد پر قائم ہیں اسلام طہارت، نظافت، صدق و امانت، عدل ورحمت، بر وصلہ، وعدہ وفائی، قول وفعل کی مطابقت اور ان دونوں کی قلب وضمیر کی مطابقت کا داعی ہے۔ وہ ظلم وجور، مکر فریب، لوگوں کے مال کو باطل طریقے سے کھانے، حرمتِ عزت پر دست درازی، بے حیائی کو پھیلانے سے منع کرتا ہے۔

قانونی حد بندیاں اسی غرض کیلئے ہیں کہ یہ بنیادیں قائم رہیں۔ اخلاقی عنصر شعور و عمل میں محفوظ رہے ضمیر کی گہرائی سے لیکر معاشرے کی عملی حالت تک ہر شے اس اخلاق پر استوار ہو۔ نفرادی واجتماعی، ملکی وبین الاقوامی تعلقات کی بنیاد یہی اخلاق ہو یہی حقیقت ہے جسے رسول اکرم ﷺ نے یوں بیان فرمایا کہ مجھے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے۔ آپ کی رسالت میں اس اعلی وصف کا ایک خاص مقام ہے اچھے اخلاق کی بلندی کو بیان کرنے کیلئے بیشمار احادیث وارد ہیں آپکی ذاتی شخصیت اخلاق کریمانہ کا ایک اعلی، واضح اور صحیح نمونہ ہے۔ واقعی آپ اس مقام کے حقدار تھے کہ اللہ تعالی اپنی کتاب پاک میں والقلم وما يسطرون کی قسم اٹھا کر وانك لعلى خلق عظيم فرماتے۔ اس ارشاد میں جہاں آپ کی ذات اقدس کی بڑھائی بیان ہوئی ہے وہاں ساتھ ہی اسلام کی نظر میں اخلاقی عنصر کی بڑھائی اور قدر و قیمت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ ❶

کتاب وسنت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی اخلاقی کا منبع ماحول، وطن، قوم اور معاشرہ نہیں ہے یہ کسی زمینی اعتبار پر قائم نہیں عرف، مصلحت کے کسی اعتبار پر اس کی بنیاد نہیں اس کی بنیاد دو اعتماد آسمانی تعلیم پر ہے جو تعلیم زمین کو آسمان سے واصل کرتی ہے۔ ان

---

❶ تفسير فی ظلال القرآن

اخلاقیات کا منبع صفاتِ خداوندی ہیں تا کہ انسان اپنی طاقت کی حد تک انکا پرتو اپنے اندر پیدا کرے تا کہ وہ واقعی خلیفہ بن جائے خدائی تکریم کا حقدار بن جائے اور آخرت کی بلند ترین زندگی کا اہل کہلا سکے۔ یہی سبب ہے کہ اخلاقیات کسی زمینی حد بندی کی پابند نہیں ہیں بلکہ وہ انسان کو انتہائی بلندیوں پر فائز کرتی ہیں۔

پھر یہ اخلاق صرف انفرادی فضائل نہیں کہ لوگوں میں صدق' امانت' عدل و رحمت اور نیکی ہونی چاہیے۔ نہیں بلکہ یہ ایک مربوط اور کامل نظام کے اجزاء ہیں اس نظام میں تنظیمی، قانونی اور تربیتی تہذیب دونوں مل کر کام کرتے ہیں اور ایک ایسا مجموعہ بناتے ہیں جس پر انسان کی مجموعی زندگی استوار ہوتی ہے اسلامی اخلاق کا کامل' حسین' متوازن' مستقیم اور مضبوط و متحرک نمونہ محمد ﷺ کی ذات اقدس ہے جو وانك لعلى خلق عظيم ایسی ثناء کے لائق ٹھہرے تھے۔

وانك لعلى خلق عظيم فقرہ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اخلاق بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں اسی وجہ سے آپ ہدایتِ خلق کے کام میں یہ اذیتیں (تکلیفیں) برداشت کر رہے ہیں ورنہ ایک کمزور اخلاق کا انسان یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآن کے علاوہ آپ ﷺ کے بلند اخلاق بھی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپ ﷺ پر دیوانگی کی جو تہمت رکھ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹی ہے کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو۔ اس کے برعکس آدمی کے بلند اخلاق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت ہے اور اسکا ذہن اور مزاج نہایت درجہ متوازن ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے اخلاق اس جیسے تھے کہ اہلِ مکہ ان سے ناواقف نہ تھے اس لیے اان کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی اس بات کیلئے کافی تھا کہ مکہ کا ہر ایک آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کے وہ لوگ کس قدر بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنوں کہہ رہے

ہیں ان کی بیہودگی رسول اکرم ﷺ کیلئے نہیں بلکہ خود ان کیلئے نقصان دہ تھی کیونکہ مخالفت کے جوش میں وہ پاگل ہو کر ایسی باتیں کہہ رہے تھے جسے کوئی ذی فہم آدمی قابل تصور نہ مان سکتا تھا۔ ❶

امام ابن جریر وانك لعلى خلق عظيم کے متعلق فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرما رہے ہیں کہ اے محمد ﷺ یقیناً آپ ﷺ بہت بڑے آداب پر ہیں اور وہ قرآنی ادب ہے جس کے ذریعے اللہ پاک نے آپ ﷺ کو ادب سکھلایا۔ ادبِ قرآن اسلام اور اس کے شرعی احکام ہیں حضرت ابن عباسؓ خلق عظیم کی تفسیر دین عظیم اسلام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ❷

اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے بارے وعلمك ما لم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما میں آپ ﷺ کا ایسا وصف بیان فرمایا ہے جو قوت نظریہ کے بڑے ہونے کی طرف راجع ہیں اور وانك لعلى خلق عظيم میں قوتِ عملیہ کے بڑے ہونے کی۔ اسکے بعد کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ ❸

ن سے بعض مفسرین وہ مچھلی مراد لیتے ہیں جس پر زمینیں رکھی گئی ہیں اور بعض کے نزدیک ن الرحمٰن کے حروف میں سے ایک حرف ہے یعنی یہ الرحمٰن کا مخفف ہے اور بعض نے ن سے مراد دوات کو لیا ہے اور بعض نے نور کی ایک تختی مراد لی ہے اور کچھ مفسرین ن کو قسم مانتے ہیں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے۔ ❹

لیکن ان تمام وجوہ کو امام رازی نے واعلم ان هذه الوجو ه ضعيفه کہہ کر ضعیف و کمزور ٹھہرایا ہے اور بعض مفسرین سورۃ کا نام کہتے ہیں اور بعض ن کو حرف تہجی ٹھہراتے

---

❶ تفهيم القرآن

❷ تفسير الطبرى

❸ تفسير الكبير للرازى

❹ الطبرى

ہیں کہ اس سے اللہ تعالی نے چیلنج کیا ہے لیکن راجع یہ ہے کہ اس کا معنی اللہ عزوجل کو ہی معلوم ہے۔

والقلم سے بعض کے نزدیک قلمِ تقدیر مراد ہے جس کو اللہ تعالی نے سب سے پہلے پیدا کرنے کے بعد قیامت تک ہونے والی چیزوں کے لکھنے کا حکم دیا جامع ترمذی کتاب التفسیر میں حضرت عبادہ بن الصامت سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ سب سے پہلے اللہ تعالی نے قلم کو پیدا فرمایا تو اس کو کہا لکھ قلم نے عرض کی اے میرے رب کیا لکھوں اللہ تعالی نے فرمایا قیامت تک آنے والی ہر چیز کی تقدیریں لکھ دے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

اس بارے علماء کا اختلاف ہے کہ کیا قلم سب سے پہلے پیدا کی گئی یا عرش ابن قیم علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ عرش قلم سے پہلے بنایا گیا ہے۔[1]

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ قلم عرش سے پہلے پیدا ہوئی ہے۔[2]

ابن قیم علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ سورۃ قلم میں اللہ تعالی نے قلم اور کتابت کی قسم اس بات پر کھائی ہے کہ اپنے نبی اور رسول کو اس چیز سے منزہ ٹھہرادیں جو آپ کے دشمن آپ کے بارے کہتے تھے اور وہ ہے ما انت بنعمت ربك بمجنو ن یہاں اس قسم اور مقسم علیہ کے درمیان جب مطابقت کرو گے تو یہ قسم بہت واضح اور نمایاں طور پر اس پر دلالت کرے گی کہ قلم کے ذریعہ جتنے بھی علوم کاتبوں نے لکھے جنہیں انسان ایک دوسرے سے حاصل کرتے ہیں یہ علوم کسی دیوانے سے صادر نہیں ہوئے۔ کامل عقل ہی علوم کا مصدر ہے وہ عظیم الشان کتاب جو آپ ﷺ لے کر آئے وہ مجنون انسان کی کیسے ہوسکتی ہے جو علوم

---

1. التبیان فی اقسام القرآن
2. حاشیہ شرح عقیدہ طحاویہ صفحہ ۲۹۵

کے اعلیٰ درجے میں ہے بلکہ اس کے اندر وہ علوم ہیں جو انسان کی طاقت میں نہیں ہیں خاص طور پر امی جس نے کوئی کتاب نہ پڑی ہو اور لکھنا بھی نہ جانتا ہو اس کے ساتھ ساتھ وہ کتاب فصاحت کے اعلیٰ معیار پر ہو۔ تناقض اور اختلاف سے بری ہو۔ سارے عقل مند جمع ہو جائیں اس جیسی کتاب لانا ان کو محال ہو تو ایسی کتاب کوئی مجنون اور بے عقل انسان کیسے بنا سکتا ہے۔ یہ قبیح بہتان ہے اور واضح جھوٹ ہے غور کریں کہ اس مقسم بہ کی مقسم علیہ پر کیسی عالی شان شہادت ہے اور کامل ترین دلالت ہے۔ ❶

یہ قلم وہی ہے جس سے تمام خلق کی تقدیریں لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہیں وما یسطرون کے فاعل کاتبِ اعمال فرشتے یا کاتبانِ لوح محفوظ ہیں۔ کاتبِ قدرت کے لئے قلم اور روشنائی اور خود کتبات لوح گواہ ہیں آپ ﷺ کے کمال دانائی کی شہادت تو سارے ہی صحائف تکوینی پیش کریں گے کسی معاصر و جاہل کی تکذیب و تعریض سے کیا ہوتا ہے؟

آپ کی سیرت زندگی کے ہر شعبہ میں نظیر اور نمونہ کا کام دے گی اور وہ بھی کسی ایک قوم۔ کسی ایک زمانہ کے لئے نہیں ہر ملک ہر قوم ہر زمانہ کے لئے ایسی عدیم النظیر سیرت والے کی جانب جنون کی نسبت دینا خود اپنے پاگل پن کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔

❶ التبیان فی اقسام القرآن

(۲۳) سورت الحاقة

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّه‘ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝﴾

(۳۸ تا ۴۳)

''پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے۔ کسی شاعر کا قول نہیں تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔''

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝

مقسم بہ ہے اور باقی آیات رب العالمین تک مقسم علیہ ہیں یہاں قرآن کے منزل من اللہ اور محمد ﷺ کے رسول برحق ہونے پر قسم کھائی گئی ہے حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ تمھیں نظر آتا ہے اور جو کچھ تم کو نظر نہیں آتا اس سب کی قسم میں اس بات پر کھاتا ہوں کہ یہ قرآن کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے جو ایک ایسے رسول کی زبان سے ادا ہو رہا ہے جو کریم و نہایت معزز اور شریف ہے اب دیکھیے یہ قسم کس معنی میں کھائی گئی ہے جو کچھ لوگوں کو نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ (ا) اس کلام کو ایک ایسا شخص پیش کر رہا تھا جس کا شریف النفس ہونا مکہ کے معاشرے میں کسی سے چھپا ہوا نہ تھا سب جانتے تھے کہ اخلاقی حیثیت سے یہ ان کی قوم کا بہترین آدمی ہے ایسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جا

سکتی کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ لے کر اٹھ کھڑا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھے اور اپنے دل سے ایک بات گھڑ کر اسے رب العالمین کی طرف منسوب کر دے۔

(۲) وہ یہ بھی علانیہ دیکھ رہے تھے کہ اس کلام کو پیش کرنے میں اپنا کوئی مفاد اس شخص کے پیش نظر نہیں ہے بلکہ یہ کام کر کے تو اس نے اپنے مفاد کو قربان کر دیا ہے، اپنی تجارت کو برباد کیا، اپنے عیش و آرام کو تج دیا۔ جس معاشرے میں اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا اسی میں گالیاں کھانے لگا اور نہ صرف خود بلکہ اپنے بال بچوں تک کو ہر قسم کے مصائب میں مبتلا کر لیا ذاتی مفاد کا خواہشمند ان کانٹوں میں اپنے آپ کو کیوں گھسیٹتا۔

(۳) ان کی آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ انہی کے معاشرے میں سے جو لوگ اس شخص پر ایمان لا رہے تھے ان کی زندگی میں یک لخت ایک انقلاب برپا ہو جاتا تھا کسی شاعر یا کاہن کے کلام میں یہ تاثیر آخر کب دیکھی گئی ہے کہ وہ لوگوں میں ایسی زبردست اخلاقی تبدیلی پیدا کر دے اور اس کے ماننے والے اس کی خاطر ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں؟

(۴) ان سے یہ بات بھی چھپی ہوئی نہ تھی کہ شعر کی زبان کیا ہوتی ہے اور کاہنوں کا کلام کیسا ہوتا ہے ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کون یہ کہہ سکتا تھا کہ قرآن کی زبان شاعری یا کہانت کی زبان ہے۔

(۵) یہ بات بھی ان کی نگاہوں کے سامنے تھی کہ پورے عرب میں کوئی شخص ایسا فصیح و بلیغ نہ تھا جس کا کلام قرآن کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو اس کے برابر تو درکنار اسکے قریب تک کسی کی فصاحت و بلاغت نہیں پہنچتی تھی۔

(٦) ان سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ خود محمد ﷺ کی زبان بھی اپنی ادبی شان کے لحاظ سے قرآن کی ادبی شان سے بہت مختلف تھی کوئی اہلِ زبان حضور ﷺ کی اپنی تقریر اور قرآن کو سن کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہیں۔

(۷) قرآن جن مضامین اور علوم پر مشتمل تھا دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی مکہ

کے لوگوں نے کبھی وہ باتیں محمد ﷺ کی زبان سے نہ سنی تھیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان معلومات کے حصول کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس نہیں ہے اسی وجہ سے آپ کے مخالفین اگر یہ الزامات لگاتے بھی تھے کہ آپ کہیں سے خفیہ طریقے پر یہ معلومات حاصل کرتے ہیں تو مکہ میں کوئی شخص ان کو باور کرنے کیلئے تیار نہ ہوتا تھا۔

(۸) زمین سے لیکر آسمان تک اس عظیم الشان کارخانہء ہستی کو بھی وہ اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا دیکھ رہے تھے جس میں ایک زبردست حکیمانہ قانون اور ہمہ گیر نظم وضبط کارفرما نظر آ رہا تھا اس کے اندر کہیں اس شرک اور انکارِ آخرت کے لیے کوئی شہادت نہیں پائی جاتی تھی جس کے اہلِ عرب معتقد تھے بلکہ ہر طرف توحید اور آخرت ہی کی صداقت کے شواہد ملتے تھے جسے قرآن پیش کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ تو وہ دیکھ رہے تھے اور جو کچھ وہ نہیں دیکھ رہے تھے وہ یہ تھا کہ فی الواقع اللہ تعالی ہی اس کائنات کا خالق و مالک اور فرمانروا ہے۔ کائنات میں سب بندے ہی بندے ہیں اللہ تعالی کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔ قیامت ضرور برپا ہونے والی ہے۔ محمد ﷺ کو واقعی اللہ تعالی نے اپنا رسول مقرر کیا ہے اور ان پر اللہ تعالی کی طرف سے یہ قرآن نازل ہو رہا ہے ان دونوں قسموں کے حقائق کی قسم کھا کر وہ بات کہی گئی ہے جو اوپر کی آیات میں ارشاد ہوتی ہے۔

انہ لقول رسول کریم ۔ یہاں رسول کریم سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں اور سورۃ التکویر میں اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں قرآن کو رسول کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ کفارِ مکہ جبریل علیہ السلام کو نہیں بلکہ محمد ﷺ کو شاعر اور کاہن کہتے تھے بخلاف اس کے سورۃ التکویر میں قرآن کو رسول کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول بڑی قوت والا ہے، صاحبِ عرش کے ہاں بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے اور محمد ﷺ نے اس کو روشن افق پر دیکھا ہے قریب قریب یہی مضمون سورۃ النجم میں جبریل علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کو محمد ﷺ اور جبریل علیہ السلام کا قول کس معنی میں کہا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس کو حضور ﷺ کی زبان سے اور حضور ﷺ اسے جبریل علیہ السلام کی زبان سے سن رہے تھے اس لیے ایک لحاظ سے یہ حضور ﷺ کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے جبریل علیہ السلام کا قول لیکن آگے چل کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ یہ فی الاصل رب العالمین کا نازل کردہ ہے جو محمد ﷺ کے سامنے جبریل علیہ السلام کی زبان سے اور لوگوں کے سامنے محمد ﷺ کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ خود رسول کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان دونوں کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ پیغامبر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس کو پیغام بھیجنے والے کی طرف سے پیش کیا ہے۔

نبی ﷺ کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکہ کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپ کے مقابلے میں پروپیگنڈا کی ایک مہم شروع کی جائے اور ہر اس شخص کو جو مکہ میں زیارت کیلئے آئے آپ کے خلاف پہلے ہی سے اسے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ آپ کی بات سننے کیلئے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم تو ویسے بارہ مہینے جاری رہتی تھی مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیے جاتے تھے جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے اس سے ہوشیار رہنا۔ ان کی گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں کبھی کہا جاتا کہ اجی وہ کلام کیا ہے دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پلندہ ہے کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ تخیلات اور تک بندیاں ہیں جن کا نام اس نے کلامِ الٰہی رکھا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادوگر ہے کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے۔ صداقت کا قوم کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا کہ جم کر کوئی ایک قطعی اور جچی تلی رائے ظاہر کرتے لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام انہوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا

آپ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں نہ ہوسکتی تھی وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدت ہی کے اندر ہوگئی ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو وہ کون ایسا آدمی ہے جس کے خلاف طوفان برپا ہے اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے ہم کوئی بچے تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دل چسپ مثال طفیل بن عمرو دوسی کا قصہ ہے جسے ابن اسحاق نے خود ان کی روایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلہ دوس کا ایک شاعر تھا کسی کام سے مکہ گیا وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبی ﷺ کے خلاف خوب میرے کان بھرے یہاں تک کہ میں آپ سے سخت بدگمان ہوا اور میں نے طے کر لیا کہ آپ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں حاضری دی تو آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو کوئی بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں شاعر ہوں، جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں، کوئی بچہ نہیں ہوں کہ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کرسکوں آخر کیوں نہ اس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کیا کہتا ہے چنانچہ جب نبی ﷺ نماز سے فارغ ہو کر واپس چلے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے ہولیا اور آپ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپکی قوم نے آپ کے متعلق مجھ سے یہ یہ کچھ کہا تھا اور میں آپ سے اس قدر بدگمان ہوگیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی تاکہ آپکی آواز نہ سننے پاؤں لیکن ابھی جو چند کلمے میں نے آپکی زبان سے سنے ہیں وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوئے آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے آپ کیا کہتے ہیں نبی ﷺ نے جواب میں مجھ کو قرآن کا ایک حصہ سنایا اور میں اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت ایمان لے آیا پھر واپس جا کر میں نے اپنے باپ اور بیوی کو مسلمان کیا اس کے بعد اپنے قبیلے میں مسلسل اشاعت اسلام کرتا رہا یہاں تک کہ غزوہ خندق کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے میرے قبیلے کے ستر اسّی گھرانے مسلمان ہوئے۔ ایک اور

روایت جو ابن اسحاق نے نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردارانِ قریش اپنی محفلوں میں خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جو باتیں وہ نبی ﷺ کے خلاف بناتے ہیں وہ محض جھوٹ ہیں وہ کہتا ہے کہ ایک مجلس میں نضر بن حارث نے تقریر کی کہ تم لوگ محمد ﷺ کا مقابلہ جس طرح کررہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمہارے درمیان نوعمر، جوان تھا تو تمہارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا اب کہ اس کے بال سفید ہونے کو آ گئے تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے بخدا وہ ساحر نہیں ہے ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھاڑ پھونک سے ہم واقف ہیں بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کرتے ہیں ان کا ہمیں علم ہے بخدا وہ شاعر بھی نہیں ہے شعر کی تمام اصناف سے ہم واقف ہیں اور اس کا کلام ان میں سے کسی صنف میں نہیں آتا۔ بخدا وہ مجنون بھی نہیں ہے مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور جیسی بے تکی بڑ وہ ہانکتا ہے کیا اس سے ہم بے خبر ہیں؟

اے سردارانِ قریش! کچھ اور بات سوچو جس چیز کا مقابلہ تمہیں درپیش ہے وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے رستم واسفندیار کے قصے لا کر پھیلائے جائیں تا کہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انہیں قرآن سے زیادہ عجیب معلوم ہوں چنانچہ کچھ دنوں اس پر عمل کیا گیا خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔ ❶

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ﴾

شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اخلاق عادات و خصائل اور افتادِ مزاج میں ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد ﷺ کے ساتھ تمہیں نظر آتے ہیں۔

---

❶ تفہیم القرآن

دونوں گروہوں کا فرق ایسا کھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راست بازی اور خداترسی ہے بات بات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے اور زبان جب کھلتی ہے خیر ہی کے لئے کھلتی ہے شر کا کلمہ کبھی اس سے ادا نہیں ہوتا سب سے زیادہ یہ کہ ان کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دھن میں یہ رات دن لگے ہوئے ہیں اور انکی ساری زندگی ایک مقصد عظیم کے لیے وقف ہے۔

دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اچھل اچھل کران پر داد دے رہے ہیں کہیں کسی زنِ بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حسن موضوعِ سخن ہے اور سننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں، کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے، کہیں ہزل بکا جا رہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں، کہیں کسی کی ہجو اڑائی جا رہی ہے اور لوگ اس سے لطف لے رہے ہیں، کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں اور کہیں کسی کے خلاف نفرت عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگی جاتی ہے۔

ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگتے ہیں اور بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر رہ نہیں سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات وخواہشات کی سرور میں بہنے والے اور لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو بھی نہیں سکتا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد و نصب العین بھی ہو سکتا ہے ان دونوں گروہوں کا کھلا کھلا فرقِ امتیاز اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے اور اگر سب کچھ دیکھ

کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھلانے کے لیے ایماں نگل کر یہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ اور ان کے گرد جمع ہونے والے لوگ اسی قبیل کے جیسے شعراء اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔

شعراء کی کوئی ایک متعین راہ نہیں ہوتی جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوت گویائی صرف کرتے ہوں بلکہ ان کا تو فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات یا خواشات واغراض کی ہرنئی رو ان کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے۔ جس کے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صدق بھی ہے۔ کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت وموعظت کی باتیں ہونے لگیں اور کبھی دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشح شروع ہو گیا کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اسے آسمان پر چڑھا دیا اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثر ی میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بز دل کو رستم واسفندیار پر فضیلت دینے میں انہیں ذرا تامل نہیں ہوتا۔ اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو تو اس کی ستائش۔ اس کے برعکس اگر کسی سے رنج پہنچ جائے تو اس کی پاک زندگی پر دھبہ لگانے اور اس کی عزت پر خاک پھینکنے میں بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔

خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حسنِ اخلاق اور بد اخلاقی، پاکیز گی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائیں گے شعراء کی ان معروف خصوصیات سے جو شخص واقف ہو اس کے دماغ میں آخر یہ بے تکی بات کیسے اتر سکتی ہے کہ اس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی تقریر جچی تلی، جس کی بات دوٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور متعین ہے اور جس نے حق اور بھلائی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر نبی ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ وما علمنه الشعر وما

ينبغي له (یس) ہم نے اسکو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے اور یہ ایک ایسی بات تھی کہ جو لوگ بھی نبی ﷺ سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ سب اسے جانتے تھے معتبر روایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر حضور ﷺ کو پورا یاد نہ تھا۔ دوران گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبان مبارک پر آتا بھی تو غیر موزون پڑھ جاتے یا اس میں الفاظ کا الٹ پھیر ہو جاتا تھا۔

عرب کی شاعری جس قسم کے مضامین سے لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے یا شراب نوشی کے یا قبائلی منافرت اور جنگ وجدل کے یا نسلی فخر وغرور کے، نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت کم پائی جاتی تھیں پھر جھوٹ مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبتیاں اور مشرکانہ خرافات۔ اسی شاعری کے متعلق آپ ﷺ کا یہ فرمان تھا کہ لان يمتلئي جوف احد كم قيحا خير له من ان يمتلئي شعرا۔ تم میں سے کسی شخص کا پیٹ پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے۔ تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی آپ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپ کا ارشاد تھا کہ ان من الشعر لحكمة بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں۔ اور امیہ بن صلت کا کلام سن کر آپ نے فرمایا امن شعره و كفر قلبه اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے ایک مرتبہ ایک صحابی نے ایک سو (۱۰۰) کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپ کو سنائے اور آپ فرماتے گئے کہ اور سناؤ۔

شاعروں کی ایک خصوصیت جو نبی ﷺ کے طرز عمل کی عین ضد تھی۔ حضور کے متعلق آپ کا ہر جاننے والا جانتا تھا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں آپ کے قول اور فعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپ کے گرد وپیش کے معاشرے میں کوئی انکار نہ کر سکتا تھا اس کے برعکس شعراء کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں کہنے کی باتیں اور ہیں اور کرنے کی اور۔ سخاوت کا مضمون اس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے کہ شاید ان سے بڑھکر دریا دل کوئی نہ ہوگا مگر عمل میں کوئی دیکھے تو

معلوم ہوگا کہ سخت بخیل ہیں، بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے، بے نیازی اور قناعت وخودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص وطمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے، دوسروں کی ادنی کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔

وَلاَ بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلاً مَا تَذَكَّرُوْنَ ٥

ہٹ دھرم کفار مکہ جب توحید، قیامت، حشر ونشر اور حساب وکتاب اور جزاء سزا، جنت وجہنم پر مشتمل قرآن مجید کی آیات سنتے تو لوگوں کو آپ کی طرف سے بدگمان کرنے کے لیے آپ کو کاہن اور مجنون کہتے تو اللہ تعالی نے فرمایا اے نبی واقعی حقیقت سے خبر دار کرنے کا کام کرتے چلو کیونکہ اللہ تعالی کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔ کاہن عربی زبان میں جو کسی غیب کو بتائے اور سیانے کے معنی میں بولا جاتا تھا زمانہ جاہلیت میں یہ ایک مستقل پیشہ تھا کاہنوں کا دعوی تھا اور ان کے بارے میں ضعیف الاعتقاد لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ وہ ستارہ شناس ہیں یا ارواح اور شیاطین اور جنوں سے ان کا خاص تعلق ہے جس کی بدولت وہ غیب کی خبریں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز کھوئی جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں پڑی ہے۔ کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ چور کون ہے۔ کوئی اپنی قسمت پوچھے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ اسکی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ انہی اغراض کے لیے لوگ ان کے کے پاس جاتے تھے اور وہ کچھ نذر ونیاز لے کر انہیں غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی بسا اوقات بستیوں میں آواز لگاتے پھرتے تھے تاکہ لوگ ان کی طرف رجوع کریں۔ ان کی ایک خاص وضع قطع ہوتی تھی جس سے وہ الگ پہچانے جاتے تھے ان کی زبان بھی عام بول چال سے مختلف ہوتی تھی وہ مقفع اور مسجع فقرے خاص لہجے میں ذرا ترنم کے ساتھ بولتے تھے اور بالعموم گول مول فقرے استعمال کرتے تھے جن سے ہر شخص اپنے مطلب کی بات نکال لے۔

قریش کے سرداروں نے عوام کو فریب دینے کے لیے رسول اللہ ﷺ پر کاہن ہونیکا

الزام صرف اس بنا پر لگا دیا کہ آپ ان حقائق کی خبر دے رہے تھے جو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں اور آپ کا دعوی یہ کہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک فرشتہ آ کر آپ پر وحی نازل کرتا ہے اور اللہ تعالی کا جو کلام آپ پیش کر رہے تھے وہ بھی مقفی تھا لیکن عرب میں کوئی شخص بھی ان کے اس الزام سے دھوکہ نہ کھا سکتا تھا اس لیے کہ کاہنوں کے پیشے اور ان کی وضع قطع اور ان کی زبان اور ان کے کاروبار سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا سب جانتے تھے کہ وہ کیا کام کرتے ہیں کس مقصد کے لیے لوگ ان کے پاس جاتے ہیں۔ کیا باتیں وہ ان کو بتاتے ہیں ان کے مسجع فقرے کیسے ہوتے ہیں اور کن مضامین پر وہ مشتمل ہوتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی کاہن کا سرے سے یہ کام ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ قوم کے رائج الوقت عقائد کے خلاف ایک عقیدہ لے کر اٹھتا اور شب و روز اسکی تبلیغ میں اپنی جان کھپاتا اور اسکی خاطر ساری قوم کی دشمنی مول لیتا اس لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کہانت کا الزام برائے نام بھی کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا کہ یہ پھبتی آپ پر چسپاں ہو سکتی اور عرب کا کوئی کند ذھن سے کند ذھن آدمی بھی اس سے دھوکہ کھا جاتا۔

قرآن مجید محمد ﷺ کا کلام نہیں بلکہ یہ سرے سے انسانی کلام نہیں ہے اور یہ بات انسانی قدرت سے باہر ہے کہ ایسا کلام تصنیف کر سکے۔ اگر تم اسے انسانی کلام کہتے ہو تو اس کے پائے کا کوئی کلام لا کر دکھاؤ جسے کسی انسان نے تصنیف کیا ہو یہ چیلنج نہ صرف قریش کو بلکہ تمام دنیا کے منکرین کو سورت الطور کی آیت:

﴿ ام یقولون تقوله بل لا یومنون ٥ فلیاتوا بحدیث مثله ان کانوا صادقین ٥﴾

میں دیا گیا تھا اس کے بعد تین مرتبہ مکہ معظمہ میں اور پھر آخری بار مدینہ منورہ میں اسے دہرایا گیا مگر کوئی اس کا جواب دینے کی نہ اس وقت ہمت کر سکا۔ نہ اس کے بعد آج تک کسی کی یہ جرأت ہوئی کہ قرآن کے مقابلہ میں کسی انسانی تصنیف کو لے آئے۔

بعض لوگ اس چیلنج کی حقیقی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک قرآن ہی کیا کسی شخص کے اسٹائل میں بھی دوسرا کوئی شخص نثر یا نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔

قرآن کے چیلنج کا یہ جواب دینے والے دراصل اس غلط فہمی میں ہیں کہ فلیاتوا بحدیث مثله کا مطلب قرآن کے اسٹائل میں اس جیسی کوئی کتاب لکھ دینا ہے حالانکہ اس سے مراد اسٹائل میں مماثلت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس پائے اور اس شان اور اس مرتبے کی کوئی کتاب لے آؤ جو صرف عربی ہی میں نہیں دنیا کی کسی زبان میں ان خصوصیات کے لحاظ سے قرآن کی مدمقابل قرار پاسکے جنکی بنا پر قرآن ایک معجزہ ہے۔

مختصرا چند بڑی بڑی خصوصیات حسب ذیل ہیں جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے۔

(۱) جس زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمل ترین نمونہ ہے پوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی معیار سے گرا ہوا نہیں ہے اور مناسب ترین انداز بیان میں ادا کیا گیا ہے ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا ہے اور ہر مرتبہ پیرائیہ بیان نیا ہے۔ جس سے تکرار کی بدنمائی کہیں پیدا نہیں ہوتی اول سے آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشت ایسی ہے جیسے نگینے تراش تراش کر جوڑے گئے ہوں۔ کلام اتنا مؤثر ہے کہ کوئی زبان دان آدمی اسے سن کر سر دھنے بغیر نہیں رہ سکتا حتی کہ منکر اور اس کے مخالف کی روح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب اپنی زبان کا سب سے اعلی نمونہ ہے جس کے برابر تو درکنار جس کے قریب بھی عربی زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں نہیں پہنچتی۔

یہی نہیں بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے چودہ صدیاں گزر جانے پر بھی اس زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا حالانکہ اتنی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں دنیا کی کوئی زبان نہیں جو استعمال الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت ہے جس نے

عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔اس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہوا ہے اس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں فصیح زبان ہی مانی جاتی ہے جو چودہ سو برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اس شان کی ہے؟

(۲) دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار اخلاق اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت، اتنی گہرائی کا اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے کہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا اور پھر اس قوم نے اٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا۔کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی نہیں رہ گئی بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے چودہ (۱۴۰۰) سو برس سے اس کے ان اثرت کا سلسلہ جاری ہے اور روز بروز اس کے یہ اثرت پھیلتے چلے جارہے ہیں۔

(۳) جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز وانجام اور اس کے نظم وآئین پر کلام کرتی ہے وہ بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور ناظم ومدبر کون ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ اس کے اختیارات کیا ہیں؟ اور وہ حقیقت نفس الامری کیا ہے جس پر اس نے یہ پورا نظام عالم قائم کیا ہے۔ وہ اس جہان میں انسان کی حقیقت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک مشخص کر کے بتاتی ہے کہ اس مقام اور اس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لیے فکر وعمل کا صحیح راستہ کیا ہے۔ جو حقیقت سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کیا ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین وآسمان کی ایک ایک چیز سے نظمِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے انسان کے اپنے نفس اور اس کے وجود کے اور انسان کی اپنی تاریخ سے

بے شمار دلائل پیش کرتی ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے' اور صحیح راستہ' جو ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا' کس ذریعہ سے اس کو معلوم ہوسکتا ہے اور کس طرح ہر زمانے میں اس کو بتایا جاتا رہا ہے۔

وہ صحیح راستے کی طرف نشان دہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اس راستے پر چلنے کے لیے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں عقائد' اخلاق' تزکیہء نفس' عبادات' معاشرت' تہذیب' تمدن' معیشت' سیاست' عدالت' قانون' غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور ان غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اس دنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رونما ہونے والے ہیں۔

وہ اس دنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہایت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے' اس تغیر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے' دوسرے عالم کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے' اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا' کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا' کن امور کی اس سے باز پرس ہوگی' کیسی ناقابل انکار صورت میں اس کا پورا نامہء اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا' کیسی زبردست شہادتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی' جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے' جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔

اس وسیع مضمون پر جو کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس حیثیت سے نہیں کہ اس کا مصنف کچھ صغریٰ کبریٰ جوڑ کر چند قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے' بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنف حقیقت کا براہ راست علم رکھتا ہے' اس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب

کچھ دیکھ رہی ہے‘ تمام حقائق اس پر عیاں ہیں‘ کائنات پوری کی پوری اس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے‘ نوعِ انسانی کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک ہی نہیں بلکہ خاتمہ کے بعد اسکی دوسری زندگی تک بھی وہ اس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے۔ قیاس وگمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقائق کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی آج تک غلط ثابت نہیں کیا جاسکا ہے۔

جو تصورِ کائنات وانسان وہ پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبہ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ وسائنس اور علومِ عمران کے تمام آخری مسائل کے جوابات اس کے کلام میں موجود ہیں اور ان سب کے درمیان ایسا منطقی ربط ہے کہ ان سے ایک مکمل‘ مربوط اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے وہ صرف انتہائی معقول اور انتہائی پاکیزہ ہی نہیں ہے بلکہ چودہ سو سال سے روئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے اس کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے یا کبھی موجود رہی ہے جسے اس کتاب کے مقابلے میں لایا جاسکتا ہو؟

(۴) یہ کتاب پوری کی پوری بیک وقت لکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دی گئی تھی بلکہ چند ابتدائی ہدایات کے ساتھ ایک تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا گیا تھا اور اس کے بعد تئیس (۲۳) سال تک وہ تحریک جن جن مرحلوں سے گزرتی رہی ان کے حالات اور ان کی ضروریات کے مطابق اس کے اجزاء اس تحریک کے رہنما کی زبان سے کبھی طویل خطبوں اور کبھی مختصر جملوں کی شکل میں ادا ہوتے رہے۔ پھر اس مشن کی تکمیل پر مختلف اوقات میں صادر ہونے والے یہ اجزاء اس مکمل کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر دنیا کے سامنے رکھ دیے گئے جسے قرآن کے نام سے موسوم کیا گیا ہے تحریک کے رہنما کا بیان ہے کہ یہ خطبے اور جملے اس کے طبعزاد نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے اس پر نازل ہوئے ہیں اگر کوئی شخص

انہیں خود اس رہنما کے طبعزاد قرار دیتا ہے تو وہ دنیا کی پوری تاریخ سے کوئی نظیر ایسی پیش کرے کہ کسی انسان نے سالہا سال تک مسلسل ایک زبردست اجتماعی تحریک کی بطورِ خود رہنمائی کرتے ہوئے کبھی ایک واعظ اور معلمِ اخلاق کی حیثیت سے، کبھی ایک مظلوم جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے، کبھی ایک مملکت کے فرمانروا کی حیثیت سے، کبھی ایک برسرِ جنگ فوج کے قائد کی حیثیت سے، کبھی ایک فاتح کی حیثیت سے، کبھی ایک شارع اور مقنن کی حیثیت سے، غرض بکثرت مختلف حالات اور اوقات میں بہت سی مختلف حیثیتوں سے جو مختلف تقریریں کی ہوں یا باتیں کہی ہوں وہ جمع ہو کر ایک مکمل مربوط اور جامع نظامِ فکر و عمل بنا دیں ان میں کہیں کوئی تناقض اور تضاد نہ پایا جائے۔ ان میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی مرکزی تخیل اور سلسلہ فکر کارفرما نظر آئے اس نے اول روز سے اپنی دعوت کی جو بنیاد بیان کی ہو آخری دن تک اسی بنیاد پر وہ عقائد و ایمان کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بناتا چلا جائے جس کا ہر جز دوسرے اجزاء سے کامل مطابقت رکھتا ہو اور اس مجموعہ کو پڑھنے والا کوئی صاحبِ بصیرت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ تحریک کا آغاز کرتے وقت اس کے محرک کے سامنے آخری مرحلے تک کا پورا نقشہ موجود تھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بیچ کے کسی مقام پر اس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہو جو پہلے اس پر منکشف نہ تھا یا جسے بعد میں اس کو بدلنا پڑا۔ اس شان کا کوئی انسان اگر کبھی گزرا ہو جس نے اپنے ذہن کی خلاقی کا یہ کمال دکھایا ہو تو اس کی نشان دہی کی جائے۔

(۵) جس رہنما کی زبان پر یہ خطبے اور جملے جاری ہوئے تھے وہ یکایک کسی گوشے سے نکل کر صرف ان کو سنانے کے لئے نہیں آجاتا تھا اور انہیں سنانے کے بعد کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ اس تحریک کے آغاز سے پہلے بھی انسانی معاشرے میں زندگی بسر کر چکا تھا اور اس کے بعد بھی وہ زندگی کی آخری ساعت تک ہر وقت اسی معاشرے میں رہتا تھا۔ اس کی گفتگو اور تقریروں کی زبان اور طرزِ بیان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ احادیث میں ان کا ایک بڑا حصہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی دان لوگ پڑھ کر خود بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اس

رہنما کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا۔ اس کے ہم زبان لوگ اس وقت بھی صاف محسوس کرتے تھے اور آج بھی عربی زبان کے جاننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب کی زبان اور اس کا اسٹائل اس رہنما کی زبان اور اس کے اسٹائل سے بہت مختلف ہے حتی کہ جہاں اس کے کسی خطبے کے بیچ میں اس کتاب کی کوئی عبارت آ جاتی ہے وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کبھی اس بات پر قادر ہوا ہے یا ہوسکتا ہے کہ سالہا سال تک دو قطعی مختلف اسٹائلوں میں کلام کرنے کا تکلف نباہتا چلا جائے اور کسی پر یہ راز فاش نہ ہوسکے کہ یہ دو الگ اسٹائل دراصل ایک ہی شخص کے ہیں؟ عارضی اور وقتی طور پر اس قسم کے تصنع میں کامیاب ہو جانا تو ممکن ہے۔ لیکن مسلسل ۲۳ سال تک ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص جب اللہ تعالی کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر کلام کرے تو اس کی زبان اور اسٹائل کچھ ہو۔ اور جب خود اپنی طرف سے گفتگو یا تقریر کرے تو اس کی زبان اور اس کا اسٹائل بالکل ہی کچھ اور ہو۔

(٦) وہ رہنما اس تحریک کی قیادت کے دوران میں مختلف حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ کبھی برسوں وہ اپنے ہم وطنوں اور اپنے قبیلے والوں کی تضحیک و توہین اور سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا، کبھی اس کے ساتھیوں پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئے، کبھی دشمنوں نے اس کے قتل کی سازشیں کیں، کبھی خود اسے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی، کبھی اس کو انتہائی عسرت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنی پڑی، کبھی اسے پیہم لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا جن میں شکست اور فتح دونوں ہی ہوتی رہیں، کبھی وہ دشمنوں پر غالب آیا اور کبھی دشمن اس پر غالب آیا اور وہی دشمن جنہوں نے اس پر ظلم توڑے تھے اس کے سامنے سرنگوں نظر آئے، کبھی اسے وہ اقتدار نصیب ہوا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے ان تمام حالات میں ایک انسان کے جذبات ظاہر ہے کہ یکساں نہیں رہ سکتے مختلف مواقع پر انسان کے دل میں مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالی کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر بھی کوئی بڑے سے بڑا نقاد انگلی رکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں انسانی جذبات

کارفرما نظر آتے ہیں۔

(۷) جو وسیع اور جامع علم اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اس زمانے کے اہل عرب اور اہل روم و یونان و ایران تو درکنار اس بیسویں صدی کے اکابرِ اہل علم میں سے بھی کسی کے پاس نہیں ہے آج حالت یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کی کسی ایک شاخ کے مطالعہ میں اپنی عمر کھپا دینے کے بعد آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اس شعبہ علم کے آخری مسائل کیا ہیں اور پھر جب وہ غائر نگاہ سے قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ان مسائل کا ایک واضح جواب موجود ہے یہ معاملہ کسی ایک علم تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام علوم کے باب میں صحیح ہے جو کائنات اور انسان سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ چودہ سو برس پہلے ریگستان عرب میں ایک امی کو علم کے ہر گوشے پر اتنی وسیع نظر حاصل تھی اور اس نے ہر بنیادی مسئلے پر غور و خوض کر کے اس کا ایک صاف اور قطعی جواب سوچ لیا تھا؟

اعجازِ قرآن کے اگرچہ اور بھی متعدد وجوہ ہیں لیکن صرف ان چند وجوہ ہی پر اگر آدمی غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا معجزہ ہونا جتنا نزولِ قرآن کے زمانہ میں واضح تھا اس سے بدرجہا زیادہ آج واضح ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک یہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا۔ (۱)

اللہ تعالیٰ یہ کہہ کر کہ میں قسم کھاتا ہوں اس کی جو تم دیکھتے ہو اور جو نہیں دیکھتے ہو اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جو تم دیکھتے ہو تمہارے حساب سے بڑا عظیم ہے مگر جو نہیں دیکھتے ہو وہ اس سے عظیم تر ہے ان الفاظ سے پتہ چل گیا کہ انسان جہان کی بہت سی چیزوں کو دیکھتا ہے مگر کئی جہان ایسے ہیں، کئی اسرار ایسے ہیں، کئی پوشیدہ عالم ایسے ہیں جو انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں ان الفاظ نے انسانی ذہن میں وسعت اور گہرائی پیدا کی کہ میں بہت کچھ نہیں بھی دیکھتا ہوں جس تک میرے حواس کی رسائی نہیں ہے اس سے انسان اپنی آنکھوں اور اپنے حواس کا قیدی نہیں رہتا۔ اس کی سوچ کے افق وسیع ہو جاتے ہیں وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ

(۱) تفہیم القرآن

ں جہان میں میری رسائی صرف ان چیزوں تک ہے جو خلافت فی الارض کے لئے ضروری
ں حقیقت اس سے کہیں بڑی ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔

جو لوگ صرف آنکھ کے دیکھے کا یقین کرتے ہیں اور صرف کان کے سنے کو مانتے وہ بیچارے محسوسات کے قیدی ہیں اسی ظاہری جہاں کی تنگنائیوں میں گھر کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ حواس سے ماوراء ہے وہ محسوسات عظیم تر ہے انسانی تاریخ کے وقفوں میں کچھ لوگ ہمیشہ محسوسات کی قید میں رہے ہیں۔ وہ حاضر و موجود پر قناعت کرتے ہیں مگر روشنی اور معرفت کی کھڑکیاں اپنے اوپر بند کر دیتے ہیں کہ جو کچھ ہم نہیں دیکھ سکتے دوسرے کیوں دیکھیں؟ [1]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں سب سے عام قسم یہ ہے کیونکہ یہ قسم عالم بالا کی تمام اشیاء اور زمین کی تمام اشیاء کو عام ہے اس کے عموم میں دنیا اور آخرت اور نظر آنے والی اور نہ نظر آنے والی تمام چیزیں آتی ہیں ملائکہ اور جن اور انسان اور عرش اور کرسی اور تمام مخلوق داخل ہے یہ تمام چیزیں اللہ تعالی کی قدرت اور ربوبیت کی نشانیاں ہیں اللہ سبحانہ وتعالی جس طرح آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں اسی طرح قسمیں بھی مختلف پیرایوں میں لاتے ہیں۔ اس قسم کے ضمن میں یہ بات ہے کہ تمام نظر آنے والی اور نہ نظر آنے والی چیزیں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی دلیل اور نشانی ہیں اور نیز اس بات کی کہ آپ جو کلام لے کر آئے ہیں وہ اللہ تعالی کی طرف سے ہے وہ کسی شاعر اور مجنون اور کاہن کا کلام نہیں گویا اللہ سبحانہ وتعالی فرما رہے ہیں کہ قرآن حق ہے جیسے کہ نظر آنے والی اور نہ نظر آنے والی مخلوق حق ہے اور موجود ہے بلکہ اگر تم ماتبصرون اور مالا تبصرون میں غور وفکر کرو تو یہ ضرور تمہاری اس بات پر رہنمائی کرے گا کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔ [2]

---

1. فی ظلال القرآن
2. التبیان فی اقسام القرآن

(۲۴) سورت المعارج

﴿ فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ إِنَّا لَقَادِرُوْنَ ٥ عَلٰٓى أَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ٥﴾ (۴۰۔۴۱)

''پس نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا کہ سال کے دوران سورج ہر روز ایک نئے زاویے پر طلوع اور نئے زاویے پر غروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان اعتبارات سے مشرق و مغرب ایک نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جہت مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب ہے اس بنا پر سورۃ الشعراء آیت نمبر ۲۸ اور سورۃ المزمل آیت نمبر ۲۹ میں'' رب المشرق والمغرب '' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ایک اور لحاظ سے زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کرّے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے حصے پر طلوع ہوتا ہے اسی بنا پر سورۃ الرحمٰن آیت نمبر ۱۷ میں'' رب المشرقین والمغربین'' کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ [1]

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم تمام مشرق و مغرب کے خداوند ہونے کی حیثیت سے کھا کر اپنی اس غیر محدود قدرت کا اثبات فرمایا ہے کہ جب وہ چاہے گا لوگوں کو

[1] تفہم القرآن

ان کے مرکھپ جانے کے بعد از سرِ نو زندہ کر دے گا اور کوئی مشکل بھی اس کے ارادے میں آڑے نہیں آئے گی۔ اس قسم میں شہادت کا پہلو بالکل واضح ہے اس کائنات میں ہم روزیہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ سورج چاند اور کروڑوں اربوں کواکب و نجوم کائنات کے مالک کے حکم سے طلوع اور غروب ہوتے ہیں تو کیا جس اللہ قادر و قیوم کے اختیار میں ان کو روز غائب کر دینے کے بعد پھر نمودار کر دینا بھی ہے اس کے لئے لوگوں کو ان کے مرکھپ جانے کے بعد از سرنو زندہ کر دینا مشکل ہو جائے گا؟ پہلا کام زیادہ مشکل ہے یا دوسرا؟

جو پہلے پر قادر ہوا تو وہ دوسرے سے کیوں قاصر رہ جائے گا؟ سورۃ النازعات میں پہلی دلیل زیادہ جامع اسلوب کے ساتھ بیان ہوئی ہے کیا تمہارا دوبارہ پیدا کیا جانا زیادہ کٹھن ہے یا آسمان کا؟ اس نے بنایا، اسکی چھت کو بلند کیا اور اس کو ہموار کیا اور اس کی رات کو ڈھانک دیا اور اس کے دن کو بے نقاب کیا اور زمین کو اس کے بعد بچھایا اور اس سے اس کا پانی اور چارہ برآمد کیا اور پہاڑوں کو گاڑ دیا۔ (النازعات آیات ۲۷ تا ۳۳)

اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہے علی کل شیء قدیر ہے وہ اگر چاہے تو تم جیسے بے وزن اور بے قیمت انسانوں (یعنی کفار) کو ختم کر کے تم سے بہتر انسان پیدا کر دے ارشاد ہے۔ پس میں مشارق و مغارب کے رب کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکتا۔

جمع کا صیغہ شاہی خطاب کے طور پر ہے۔ یہ شاہانہ طرز ادا ہے جو اس قسم کے مواقع پر قرآن مجید اختیار کرتا ہے جس مضمون پر قسم کھائی ہے وہ قسم کا محتاج نہیں لیکن رب المشارق والمغارب کی تصریح اس لئے ہے کہ خالق کائنات کی عظمت جتائی جائے۔ مشارق و مغارب سے مراد کائنات کے بے شمار نجوم کواکب کے طلوع و غروب کے مقامات ہو سکتے ہیں اور یہ بھی مطلب لینا ممکن ہے کہ ہر روز کا مشرق و مغرب الگ الگ ہوتا ہے اور کائنات کے چکر میں ہر لحظہ ایک مشرق ظاہر ہوتا اور ایک مغرب رہتا ہے اس حساب سے مشرق و مغرب بے حد و حساب ہیں اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی جدید علم ہیئت نے کھلی تائید کی

ہے کچھ بھی ہو اس لفظ سے کائنات کے وجود کی بڑائی اور خالق وجود کی عظمت ظاہر ہو رہی ہے اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو ان سے بہتر لوگ پیدا کر دے اس سے کوئی سبقت نہیں لے جاسکتا اسے کوئی تھکا نہیں سکتا۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر جگہ مشرق اور مغرب مناسب انداز پہ آئے ہیں سورۃ الرحمن میں تثنیہ کے صیغہ رب المشرقین ورب المغربین آیا ہے کیونکہ اس سورۃ میں جفت اشیاء کا ذکر ہوا ہے سورج، چاند، آسمان، زمین، جن، انس، جنت اور جہنم تو مناسبت مکمل یہ تھی کہ المشرقین اور المغربین ذکر کیا جائے سورۃ المعارج میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی قدرت کے عموم اور کمال پر قسم کھائی ہے اور انسان کے عدم کے بعد اس کے دوبارہ لوٹانے پر مشارق اور مغارب جمع کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا کیونکہ یہ مقسم علیہ پر زیادہ دلالت کرتی ہے کیونکہ ستاروں یا سورج کے مشرقوں اور مغربوں میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ان تکذیب کرنے والوں کو تبدیل کرنے پر قادر ہے اور انہیں ایک دوسری مخلوق اور بناوٹ میں لاسکتا ہے جس کا انہیں علم نہیں۔ جیسے روزانہ سورج کو ایک مشرق سے لاتا ہے اور ایک مغرب میں غروب کر دیتا ہے سورۃ المزمل میں مشرق مغرب مفرد لفظ لائے ہیں کیونکہ اس سورۃ میں مقصود اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کا ذکر کرنا ہے کہ جس طرح وہ مشرق ومغرب کی ربوبیت کے ساتھ اکیلا ہے ایسے ہی ضروری ہے کہ وہ ربوبیت کے ساتھ متفرد ہو اور صرف اسی پر توکل کیا جائے۔ ❶

"اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ"

یہ ہے وہ بات جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رب المشارق والمغارب ہونے کی قسم کھائی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم چونکہ مشرقوں اور مغربوں کے مالک ہیں اسی لیے پوری زمین ہمارے قبضہ قدرت میں ہے اور ہماری گرفت سے بچ نکلنا تمہارے بس میں نہیں ہے ہم

❶ التنیان فی اقسام القرآن

جب چاہیں تمہیں ہلاک کر سکتے ہیں اور تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اٹھا سکتے ہیں جو تم سے بہتر ہو۔ ❶

(۲۵) سورت المدثر

﴿ كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ ۝ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۝ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۝ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ۝﴾

(۳۲تا۳۷)

''ہر گز نہیں۔ قسم ہے چاند کی اور رات کی جب وہ پلٹتی ہے اور صبح کی جب کہ وہ روشن ہوتی ہے یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے انسان کیلئے ڈراوا۔''

یہ آفاق کی چند نشانیوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس قیامت اور دوزخ سے لوگوں کو آ کیا جا رہا ہے وہ اس کائنات کے عظیم حوادث میں سے ہے اور اس کا ظہور قطعی ہے لیکن ا تعالیٰ کے ہر کام میں تدریج و ترتیب ہے جب اس کا وقت آ جائے گا تو وہ ظاہر ہو جائے اپنے وقت سے پہلے ظاہر نہیں ہوگی اس کے ظہور میں تاخیر سے یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ ظا ہی نہیں حماقت ہے رات میں اگر کوئی صبح کے لیے جلدی کرے تو اس کی جلد بازی کے سے صبح اپنے وقت سے پہلے نہیں آئے گی یہی حال قیامت کا ہے اس کا بھی ایک وقت مق ہے ٹھیک اسی وقت ظاہر ہوگی۔

کلّا کے ذریعہ سے مخاطب کے زعمِ باطل کی پوری شدت سے تردید فرمادی ہے متکلم مخاطب کے خیال کی تردید میں اتنا توقف بھی نہیں کرنا چاہتا کہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ شدتِ نفرت کے اظہار کے لیے اس کی تردید ہی سے کلام کا آغاز کرتا ہے اور پھر بقید قسم اپنی دلیل بیان کرتا ہے بیان کے مخاطب مکذبین قیامت ہیں اور ان

❶ تفہیم القرآن

کا جوشبہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ قیامت آنی ہے تو کیوں نہیں آ جاتی ۔ان کے سامنے چاند کومثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس طرح وہ درجہ بدرجہ ہلال سے بدر کے مقام تک پہنچتا ہے اسی طرف تم بھی مختلف اطوار و مراحل سے گزرتے ہوئے بالاخر ایک دن اس مقام تک پہنچو گے جہاں پہنچنے کی تمھیں خبر دی جا رہی ہے اور اپنے رب کے عدلِ کامل کے ظہور کا مشاہدہ کرو گے۔ جس طرح چاند کے سفر کے لیے منزلیں مقرر ہیں ان کو طے کیے بغیر اس کا ظہورِ کامل نہیں ہوتا خواہ اس کے لیے کوئی کتنی ہی جلدی بازی کرے۔ اسی طرح اس روز جزاء وسزا کے لیے بھی منزلیں مقرر ہیں جن سے گزرے بغیر اس کا ظہور نہیں ہوگا۔ کائنات کے نظام میں ہر تغیر اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اسکیم کے مطابق ہوتا ہے دوسروں کی طلب وتمنا اوران کی عجلت یا تاخیر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے یہ دن آئے گا ضرور۔ اسکے آئے بغیر اس دنیا کی تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہوگا لیکن یہ اس وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ کی تقویم میں اس کا مقررہ وقت منٹ اور سیکنڈ کے فرق کے بغیر پورا ہو جائے گا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی نے چاند کے طلوع وغروب اور اس کے عروج ومحاق سے دین کے مختلف حقائق پر استشہاد کیا ہے۔ یہاں اس کے تدریجی ارتقاء کا پہلو پیش نظر ہے اور مقصود قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی کے ظہور کے لیے ایک معین پروگرام ہے جسکی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہی جانتا ہے جو چیز اس کے عدل کا بدیہی مقتضی ہے اس کا ظہور تو لازماً ہوگا لیکن اپنے وقت مقررہ پر سورہ الانشقاق میں بھی چاند کی قسم اسی پہلو کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے۔

چاند کے بعد رات کی قسم کھائی کہ جس طرح رات کی تاریکی میں صبح کا کوئی نام ونشان نہیں ہوتا لیکن وقت آتا ہے کہ صبح نمودار ہو جاتی ہے وہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہوگا۔ یہ دنیا رات کے مانند ہے جسکی تاریکی صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے لیکن وقت آئے گا کہ یہ تاریکی کافور ہوگی اور قیامت اچانک نمودار ہو جائے گی اللہ تعالیٰ جو ہر روز رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی دکھاتا ہے اور کسی کو بھی اس کائنات کے اس عظیم انقلاب پر تعجب

نہیں ہوتا وہ جب چاہے گا قیامت کو بھی اسی طرح نمودار کر دے گا اور اس وقت سب دیکھ لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا اس طرح سے بنائی ہے کہ اس کے ہر گوشہ میں کسی نہ کسی شکل میں قیامت کا ریہرسل برابر ہوتا رہتا ہے تا کہ انسان کو اس کے باب میں جو شبہ بھی لاحق ہو اس کو دور کرنے کیلئے اسے اپنے گرد و پیش ہی سے کوئی ایسی مثال مل جائے جو اس کے دل کو مطمئن کر دے بشرطیکہ اس کے اندر سلامت روی اور حق کی طلب ہو۔

اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ○ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ○

یہ مذکورہ بالا قسموں کا مقسم علیہ ہے یعنی قرآن کی یہ آیات جو دوزخ کے ہول سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں ہنسی مذاق کی چیز نہیں ہیں بلکہ اس کائنات کے عظیم احوال و حوادث میں سے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ان سے سبق حاصل کرنے کی بجائے ان کو اپنے مذاق کا موضوع بنائیں۔ ❶

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں جاہل لوگوں کو یہ جو غرور ہے کہ آپ ﷺ اس وقت تک راضی نہیں ہونگے جب تک آپکی امت کا ایک ایک فرد جنت میں نہ چلا جائے اور آپ کا کوئی امتی جہنم میں داخل نہ ہو یہ شیطانی دھوکہ ہے اور ان کے ساتھ شیطانی کھیل ہے آپ ﷺ اس چیز کے ساتھ راضی ہو جائیں گے جس کے ساتھ آپ کا رب تبارک و تعالی راضی ہو گا اور اللہ تعالی ان کافروں اور نافرمانوں کو جہنم میں داخل کرے گا جو اس کے حقدار ہوں گے۔ پھر اللہ تعالی اپنے رسول کیلئے حد مقرر کریگا آپ انکے متعلق سفارش کریں گے اور اللہ کا رسول اس بات کو خوب پہچانتا ہے اور اس کے حق کو بھی پہچانتا ہے کہ وہ یوں فرمائے کہ میں تو اس وقت تک راضی نہیں کہ میرا کوئی امتی جہنم میں بلکہ اس کا رب آپ کو اجازت دے گا۔ آپ ان کے بارے سفارش فرمائیں گے جن کے بارے اللہ تعالیٰ شفاعت کو چاہے گا اور آپ اللہ تعالی کے اذن اور رضا کے بغیر شفاعت نہیں کریں گے۔ ❷

---

❶ تدبر القرآن ❷ التبیان فی اقسام القرآن صفحہ ٤٨

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے اللہ تعالی کا فرمان رب انهن اضللن كثيرا من الناس فمن تبعني فانه مني ومن عصاني فانك انت الغفور الرحيم کی تلاوت فرمائی اور حضرت عیسی علیہ السلام کا قول:

((اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ))

کو پڑھا پھر آپ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا اے اللہ میری امت کو معاف فرما دو اور آپ روئے تو اللہ تعالی نے فرمایا اے جبریل! محمد ﷺ کی طرف جا اور اس سے پوچھ کہ تم کیوں رو رہے ہو حالانکہ آپ کا رب خوب جانتا ہے تو جبریل علیہ السلام آپکے پاس آئے اور پوچھا تو رسول اللہ ﷺ نے جو بات کہی اس کی خبر دی وہ خوب جانتے ہیں تو اللہ تعالی نے فرمایا اے جبریل محمد ﷺ کے پاس جا اور اسے کہہ کہ بے شک ہم تجھے تیری امت کے بارے میں راضی کریں گے اور تیرے سے بدسلوکی نہیں ہوگی۔ یعنی تجھے پریشان نہیں رہنے دیں گے اور نہ غمگین۔ ❶

امام نووی صاحب التحریر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آپ کو راضی کرنا بعض امتیوں کے حق میں یوں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا اور بعض کو اللہ تعالیٰ آپ کی شفاعت کی وجہ سے نجات دے دے گا۔ علامہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کا رونا اور اپنی امت کے لیے دعا کرنا ان دونوں آیتوں کی تلاوت کے وقت اس بنا پر تھا کہ آپ کو یاد آیا کہ حضرت ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام کو اپنی اپنی امتوں پر کتنی شفقت تھی تو آپ کو اپنی امت پر شفقت کے جذبے نے اثر کر دیا اور آپ نے امت کے لیے دعا فرمائی اور روئے۔ ❷

﴿ كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝ وَاللَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ ۝ ﴾

میں کلا حرف ردع ہے اور والقمر سے لیکر اسفر تک مقسم بہ ہے اور انها لاحدى الكبر مقسم علیہ ہے انها میں ضمیر کا مرجع سقر یعنی جہنم ہے یا اس کا مرجع رب کے لشکر ہیں یا جہنم کی ناظم فرشتے ہیں۔

❶ صحيح مسلم جلد اول صفحه ۷۱۳ ❷ شرح مسلم نووی جلد نمبر ۱ صفحه ۳۱۷

سید قطب مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مابین مناسبت یوں ظاہر کرتے ہیں۔

کہ جہنم، خدائی لشکر، آخرت ان میں سے ہر ایک عظیم امر نظر آئے گا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ چاند، رات، صبح جو خود امور عظام ہیں یہ اس بات پر گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کائنات بڑے بڑے امور سے بھری پڑی ہے پھر اگر کسی کو اب ظاہری دلائل کائنات پر تعجب نہیں تو ان مخفی جنود الٰہی پر کیوں حیرت ہے؟ یہ دلالت ظواہرِ کائنات کی مخفی مظاہرِ الٰہی پر ہے یہ ظواہر اللہ تعالی کے خلق وتدبیر اور قدرت حکمت کے نشانات میں سے ہیں۔ یہ کائناتی نظارے خود انسان کے دل سے بہت کچھ کہتے ہیں۔ اس کے کانوں کو قدرت وحکمت سے آشنا کرتے ہیں۔ چاند کا طلوع وغروب اور اس کی رفتار ایک بہت بڑی دلیلِ قدرت ہے تاہم ان سرگوشیوں کو قلب بیدار ہی سن سکتا ہے اسی طرح رات کا پشت پھیرنا، صبح صادق کا سہانا وقت ہمارے سامنے کائنات کا یہ ہر روز برپا ہونے والا انقلاب ہم سے بہت کچھ کہتا ہے مگر اس سرگوشی کو بھی وہی سنے گا جس کا دل غفلت کا شکار نہیں بلکہ ہوش وخرد سے بیدار ہو پھر صبح کی روشنی کا ظہور قبل از طلوع آفتاب کا نظارہ ہمارے قلب میں ہدایت کا نور پیدا کرسکتا ہے بشرطیکہ ہم اس کی نصیحت کو بگوش ہوش سن سکیں ان کے قلب کا خالق جانتا ہے کہ اس کی قابلیتیں عجیب وغریب ہیں اگر وہ ہدایت کیلئے کھل جائیں تو ایک ذرے سے اسے قدرت وحکمت خداوندی کی صدا سنائی دے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کائناتی مظاہر اور قدرتی حقائق کی قسم کھائی ہے تاکہ غافل تنبیہ پائیں اور خواب غفلت کے متوالے جاگ اٹھیں اور وہ فرماتا ہے کہ یہ سب قدرتی نشانات تمہاری خبرداری کے لیے کافی ہیں۔ ❶

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے چاند اور رات کی جب رخصت ہو رہی ہو اور صبح جب روشن ہو رہی ہو ان تینوں کی قسم معاد یعنی دوبارہ اٹھنے پر کھائی ہے کیونکہ یہ تینوں چیزیں مقسم علیہ کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔ ❷

---

❶ فی ظلال القرآن ❷ التبیان فی اقسام القرآن

(۲٦) سورت القیامۃ

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝﴾

(القیامۃ ۱ . ۲)

''نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی' اور نہیں ۔میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔''

یہاں لا قسم کی نفی کیلئے نہیں بلکہ مخاطب کے خیال کی نفی کیلئے آیا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہے آپ جب کسی شخص کی بات کی فوری تردید کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی قسم اصل حقیقت یوں ہے۔اس اسلوب قسم سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کی بات اتنی لغو ہے کہ وہ اس کی تردید میں اتنے توقف کا بھی روادار نہیں کہ قسم کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ اس سے پہلے ہی اس کی تردید کر دیتا ہے بلکہ اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت فرمایا ہے اور اس کی سعادت و شقاوت کی لیے ضابطہ یہ ٹھہرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہوگا۔اپنی تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشات سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے نفس کے اس رجحان کو قرآن مجید میں نفسِ امارہ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ نفس نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے۔اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے کو بھی اگر اس سے کوئی برائی صادر ہو جاتی ہے ملامت کرتا ہے اور دوسرں کی برائیوں کو

دیکھ کر بھی کڑھتا ہے اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے نفس کے اس پہلو کو یہاں نفسِ لوامہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب تعالیٰ اور جزاء وسزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اس کی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپر انداز ہو جائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفسِ لوامہ اس کو فوراً ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ وانابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس نفس کو نفسِ مطمئنۃ سے تعبیر کیا ہے تربیتِ نفس کا سب سے اونچا مرتبہ یہی ہی جس کو حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعہ جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اس نفس کو آخرت میں راضیۃ مرضیۃ کا مرتبہ حاصل ہو گا جو نفس کی معراج ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالی نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی ہے اسے بیان نہیں کیا ہے کیونکہ بعد کا فقرہ خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالی انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر ان دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے؟

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے اس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے پوری کائنات کا نظام اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ اس کی نوعیت ہی خود یہ بتارہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اس گمانِ بے اصل کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پائی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے لیکن جتنا جتنا اس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس ہنگامہ نیست ونابود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد

یہ نہ رہے گا اس بنا پر اللہ تعالی نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی قسم کھائی ہے۔

روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد پھر انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا برا نتیجہ دیکھے گا تو اس کے لیے دوسری قسم نفس لوامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس ضمیر میں لازماً بھلائی اور برائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو اس کا ضمیر اسے برائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے قطع نظر اس سے کہ اس نے بھلائی اور برائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے اس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور برائی کی تمیز پائی جاتی ہے وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور برے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور جس برائی کا ارتکاب اس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے تو اس کے برعکس صورت میں جبکہ اس برائی کا ارتکاب دوسرے نے اس کے ساتھ کیا ہو اس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔

اب اگر انسان کے وجود میں اس طرح کے ایک نفسِ لوامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ لوامہ زندگی بعد موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے یا برے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے ان کی جزا یا سزا اس کو ضرور ملنی چاہیے زندگی بعد موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہو سکتا کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم رہ جائے گا اور اس کی بہت سی برائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اس

بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظام کائنات میں پیدا ہو گیا ہے اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔ اس وقت تک وہ حیات بعد موت کا انکار نہیں کر سکتا۔

دو دلیلیں جو قسم کی صورت میں بیان کی گئی ہیں دو باتیں ثابت کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کا خاتمہ ایک یقینی امر ہے۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد دوسری زندگی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کے منطقی اور فطری تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ اور یہ امر ضرور واقع ہونے والا ہے کیونکہ انسان کے اندر ضمیر کی موجودگی اس پر گواہی دے رہی ہے۔ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے سرزد ہو جانے والی برائیوں پر ٹوکتا رہتا ہے تو اس کے لیے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شتر بے مہار ہے۔ جس طرح زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگرانی کی مخالفت کرے۔ لیکن کوئی اس سے باز پرس کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ اگر انسان شتر بے مہار ہے تو یہ نفسِ لوامہ اس کے اندر کہاں سے آ گھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کے لیے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ جب اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے عالم کے لیے وہ ایک ایسی عدالت کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمال خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟

ان سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا وہ ان کا یہی جواب دے گا کہ بے شک انسان کا اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر و شر کے شعور کے ساتھ پیدا ہوا ہے وہ شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کے لیے لازماً ایک پرسش کا دن آنے والا ہے جس میں اس کو بدیوں کی سزا اور نیکیوں کا صلہ ملے گا۔ اسی دن کی یاد دہانی کے لیے خالق نے اس کا ایک

چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تاکہ انسان اس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک کر اس کی تصویر دیکھ لے۔

یہاں مقسم علیہ اتنا واضح ہے کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے گویا قسم خود اپنے مقسم علیہ پر دلیل ہے جس طرح سورت ق اور سورت ص میں قسمیں مقسم علیہ کے بغیر آئی ہیں۔ اس طرح کی قسموں سے مقصود مخاطب پر یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی تردید یا تکذیب کر رہا ہے وہ خود اپنی صداقت پر ایسی شاہد عدل ہے کہ اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ امام زمخشری فرماتے ہیں کہ یہاں جواب قسم لتبعثن محذوف ہے جس پر ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامه دلالت کرتا ہے۔ لا اقسم کے لا کے بارے اور بھی کئی اقوال ہیں۔

(۲۷) سورت المرسلٰت

﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا o فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا o وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا o فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًاo فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًاo عُذْرًا اَوْ نُذْرًاo اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌo﴾ (المرسلٰت ۱ تا ۷)

”قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں' پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں' پھر ان کو پھاڑ کو جدا کرتی ہیں' پھر دلوں میں خدا کی یاد ڈالتی ہیں عذر کے طور پر یا ڈرانے کے طور پر جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔“

والمرسلٰت عرفا سے لیکر عذرا او نذرا تک مقسم بہ ہے اور انما تو عدون لواقع مقسم علیہ ہے۔

یہاں قیامت کے ضرور واقع ہونے پر پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ایک المرسلات

عرفا پے در پے بھیجی جانے والیاں۔ دوسری فالعصفت عصفا پھر طوفانی رفتار سے چلنے والیاں۔ تیسری والنشرت نشرا اور بادلوں کو اٹھا کر پھیلانے والیاں۔ چوتھے الفارقات فرقا الگ الگ کرنے والیاں۔ پانچویں فالملقیات ذکرا یاد کا القا کرنے والیاں۔

چونکہ ان الفاظ میں صرف صفات بیان کی گئی ہیں یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ کن چیزوں کی صفات ہیں مفسرین کے درمیان ان کے تعین میں اختلاف ہے راجح یہ ہے کہ پانچوں صفات ہوا کی ہیں قرآن مجید میں جہاں بھی شک یا انکار کرنے والوں کو کسی حقیقتِ غیر محسوس کا یقین دلانے کیلئے کئی چیزوں یا بعض کی قسم کھائی گئی ہے وہاں قسم دراصل استدلال کی ہم معنی ہوتی ہے یعنی اس قسم سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ چیزیں اس کے صحیح و برحق ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس غرض کیلئے ظاہر ہے کہ ایک غیر محسوس شے کے حق میں کسی دوسری غیر محسوس شے کو بطور استدلال پیش کرنا درست نہیں ہوسکتا۔ بلکہ غیر محسوس پر محسوس سے دلیل لانا ہی موزون اور مناسب ہوسکتا ہے اس لئے راجح یہ ہی کہ ان قسموں سے مراد ہوائیں ہیں۔

قیامت کے وقوع پر ہواؤں کی یہ کیفیات اس طرح دلالت کرتی ہیں کہ زمیں پر جن اسباب سے حیوانی اور نباتی زندگی ممکن ہوئی ہے ان میں سے ایک نہایت اہم سبب ہوا ہے۔ نوعِ زندگی سے اس کی صفات کا جو تعلق ہے وہ بجائے خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی قادرِ مطلق اور صانع حکیم ہے جس نے اس کرہ خاکی پر زندگی وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور اس غرض کیلئے یہاں ایسی چیز پیدا کی جس کی صفات زندہ مخلوقات کے وجود کی ضروریات کے ساتھ ٹھیک مطابقت رکھتی ہیں پھر اس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ زمین کو ہوا کا ایک لبادہ اڑھا کر چھوڑ دیا ہو بلکہ اپنی قدرت اور حکمت سے اس ہوا میں اس نے بے شمار مختلف کیفیات پیدا کی ہیں جن کا انتظام لاکھوں کروڑوں برس سے اس طرح ہو رہا ہے کہ انہی کی بدولت موسم پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی حبس ہوتا ہے اور کبھی بادِ نسیم چلتی ہے اور کبھی گرمی آتی ہے اور کبھی سردی، بادل آتے ہیں اور کبھی آئے ہوئے اڑ جاتے ہیں کبھی

نہایت خوش گوار جھونکے چلتے ہیں اور کبھی انتہائی تباہ کن طوفان آ جاتے ہیں۔
کبھی نہایت نفع بخش بارش ہوتی ہے اور کبھی کال پڑ جاتا ہے۔غرض ایک ہوا نہیں بلکہ طرح طرح کی ہوائیں ہیں جو اپنے اپنے وقت پر چلتی ہیں اور ہر ہوا کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرتی ہے۔یہ انتظام ایک غالب قدرت کا ثبوت ہے جس کے لیے نہ زندگی کو وجود میں لانا خارج از مکان ہوسکتا ہے نہ اسے مٹا دینا اور نہ مٹا کر دوبارہ وجود میں لے آنا۔اس طرح یہ انتظام کمال درجہ حکمت و دانائی کا ثبوت بھی ہے جس سے صرف ایک نادان آدمی ہی یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ یہ سارا کاروبار محض کھیل کے طور پر کیا جارہا ہے اور اس کا عظیم مقصد نہیں ہے۔
اس حیرت انگیز انتظام کے مقابلے میں انسان اتنا بے بس ہے کہ کبھی وہ نہ اپنے لیے مفید طلب ہوا چلا سکتا ہے نہ اپنے اوپر ہلاکت خیز ہوا کا طوفان آنے کو روک سکتا ہے۔وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی اور بے شعوری اور ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے کبھی کبھی یہی ہوا اس کو یاد دلاتی ہے کہ اوپر کوئی زبردست اقتدار کارفرما ہے جو زندگی کے اس سب سے بڑے ذریعے کو جب چاہے اس کے لیے رحمت اور جب چاہے ہلاکت کا سبب بنا سکتا ہے اور انسان اس کے کسی فیصلے کو بھی روک دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔

سورۃ المرسلٰت کی پہلی سات آیتوں میں ہواؤں کے انتظام کو اس حقیقت پر گواہ قرار دیا گیا ہے کہ قرآن مجید اور محمد ﷺ جس قیامت کے آنے کی خبر دے رہے ہیں وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی۔ان میں استدلال یہ ہے کہ جس قادرِ مطلق نے زمین پر یہ حیرت انگیز انتظام قائم کیا ہے اس کی قدرت قیامت برپا کرنے سے عاجز نہیں ہوسکتی؟اور جو صریح حکمت اس انتظام میں کارفرما نظر آ رہی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے' کیونکہ حکیم کا کوئی فعل عبث اور بے مقصد نہیں ہوسکتا اور آخرت نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہے کہ یہ سارا کارخانۂ ہستی سراسر فضول ہے۔

اہلِ مکہ بار بار کہتے تھے کہ جس قیامت سے تم ہم کو ڈرا رہے ہو اسے لا کر دکھاؤ تب ہم اسے مانیں گے۔اس کا جواب اس صورت میں یہ دیا گیا ہے کہ وہ کوئی کھیل یا تماشا تو نہیں

ہے کہ جب کوئی مسخرا اسے دکھانے کا مطالبہ کرے اسی وقت وہ فوراً دکھا دیا جائے۔ وہ تمام نوع انسانی اور اس کے تمام افراد کے مقدمے کے فیصلے کا دن ہے۔ اس کیلئے اللہ تعالی نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے اسی وقت پر وہ آئے گا اور جب آئے گا تو ایسی ہولناک شکل میں آئے گا کہ آج جو لوگ مذاق کے طور پر اس کا مطالبہ کر رہے ہیں اس وقت ان کے حواس باختہ ہو جائیں گے۔ اسی وقت انہیں رسولوں کی شہادت پر ان کے مقدموں کا فیصلہ ہو گا جن کی دی ہوئی خبر کو یہ منکرین آج بڑی بے باکی سے جھٹلا رہے ہیں، پھر انہیں خود پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے کس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کیا ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد میں سے عقیدہ آخرت بھی ہے جو دوسرے اصولی اسلامی عقائد کیلئے لازم ملزوم ہے۔ مشرکوں کیلیے اس کے وقوع کا تصور مشکل تھا قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اس کی بہت تاکید کی ہے۔ یہ عقیدہ ان کے ذہن نشین کرنا اور ان کے دلوں میں اس کی حقیقت کو بٹھانا ضروری تھا کیونکہ اس کے بغیر اسلامی عقائد ذہن نشین نہیں ہو سکتے۔ زندگی کی اقدار بھی اس کے بغیر صحیح نہیں ہو سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ آسمانی عقیدے میں قیامت پر ایمان ایک بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔

جس طرح سورۃ الذاریات میں ہواؤں کی قسم عذاب اور جزاء سزا کے حق ہونے پر کھائی گئی ہے اسی طرح یہ قسم بھی وعدہ عذاب و قیامت کے واقع ہونے پر کھائی گئی ہے۔ المرسلت کے معنی چھوڑی ہوئی ہواؤں کے ہیں عرفا پے در پے یہ مرسلت سے حال بننے کی وجہ سے منصوب ہے۔

فالعصفت عصفا اندھا دھند چلنے والی ہوائیں والنشرت نشرا ابر رحمت کو پھیلانے والی ہوائیں فالفرقت فرقا فرق و امتیاز کرنے والی ہوائیں کبھی بادلوں کو ہانک کر لاتی ہیں کبھی ان کو اڑا کر لے جاتی ہیں ایک علاقہ کو جل تھل کر دیتی ہیں دوسرے کو تشنہ چھوڑ جاتی ہیں۔

عصفا اور نشرا اور فرقا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

فالملقیٰت ذکرا بارش کے ساتھ ساتھ ہوائیں لوگوں کو یاد دہانی بھی کراتی ہیں۔ یاد دہانی کے چند پہلو یہ ہیں: (۱) یہ آسمان وزمین میں توافق کے پہلو سے توحید اور اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کی یاددہانی کراتی ہیں۔ (۲) اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی جوشان ہے وہ اللہ تعالیٰ کے آگے مسئولیت کی یاددہانی کراتی ہے (۳) مردہ زمین کو زندہ کر کے یہ بعث اور حشر ونشر کی یاددہانی کراتی ہیں (۴) کسی کے لئے رحمت اور کسی کیلئے عذاب بن کر یہ اللہ تعالیٰ کے اختیارِ مطلق اور اس کے عذاب وثواب کی یاددہانی کراتی ہیں۔

ذکرا منصوب مفعول بہ ہونے کی بناء پر ہے۔ عذرا او نذراً ہواؤں کے تصرفات جو ہر انسان کے مشاہدے میں آتے ہیں کچھ لوگوں کیلئے اتمام حجت جو غفلت کی سرمستی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں۔

﴿وَالْمُرسَلٰتِ عُرُفًاo فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًاo﴾

میں طوفانی ہواؤں کی قسم کھائی گئی ہے اسی لئے العصفت کا فا کے ذریعہ مرسلٰت پر عطف ڈالا گیا ہے تاکہ تدریجی ترقی کو واضح کریں۔ اور والنشرٰت نشرا میں واؤ کے ذریعے عطف ڈالا گیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سابق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مستقل ہوا کا وصف ہے۔ عذرا اور نذرا منصوب یا تو ملقیٰت کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے ہے یا ذکرا اسے بدل ہونے کی بناء پر۔

(۲۸) سورت النّٰزعٰت

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا o وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا o وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا o فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًاo فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا o﴾ (۱۔تا۵)

”قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں اور (ان فرشتوں کی جو کائنات میں) تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں پھر

(حکم بجالانے میں) سبقت کرتے ہیں پھر (احکام الٰہی کے مطابق) معاملات کا انتظام چلاتے ہیں۔''

اس مقام میں مقسم بہ فرشتے ہیں جن کی پانچ صفات ذکر کی گئی ہیں النازعات غرقا سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کافروں کی موت کے وقت سختی سے جان نکالتے ہیں جو کافر انسان کے جسم کی گہرائیوں میں اتر کر اور اس کی رگ رگ سے کھینچ کر نکالتے ہیں جو نکلنا نہیں چاہتی زبردستی سے اسے کھینچ کر نکالتے ہیں اس سختی کو واضح کرنے کیلئے غرقا النازعات کا مفعول مطلق لائے کیونکہ معنی گہرائی تک جانا اور النشطت نشطا سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مسلمان کی جان آہستگی سے نکالتے ہیں جیسے کہ بند کھول دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرمانبردار لوگوں کی روح نکالنے کے وقت فرشتے اچھی شکل میں آتے ہیں اور کہتے ہیں اے نیک روح ہم تجھے اللہ تعالی کی رضا مندی اور مغفرت کی خبر دیتے ہیں جلدی سے جسم کو چھوڑ دے یہ خوشخبری سن کر وہ نیک روح جسم کو چھوڑ کر اس طرح آسانی سے نکل جاتی ہے جیسے مشک کا منہ کھول دینے سے مشک کا پانی نکل آتا ہے اور نافرمان لوگوں کی روح نکالتے وقت فرشتے خوفناک صورت میں آتے ہیں اور کہتے ہیں اے بری روح جسم سے نکل اللہ تعالی کے غضب سے تیرا سامنا ہونے والا ہے۔ یہ خوفناک خبر سن کر وہ روح برے آدمی کے جسم میں جگہ جگہ چھپتی پھرتی ہے اور فرشتے اس کو گھسیٹتے ہیں آخر بڑی دشواری سے جسم کو چھوڑتی ہے۔ [1]

اور السبحت سبحا سے مراد وہ فرشتے ہیں جو احکام الٰہی کی تعمیل میں اس طرح تیزی سے رواں دواں رہتے ہیں جیسے کہ وہ فضا میں تیر رہے ہوں۔ اور فالسبقت سبقا سے مراد یہ ہے کہ حکم الٰہی کا ارشاد پاتے ہی ان میں ہر ایک اس کی تعمیل کیلئے دوڑ پڑتا ہے انبیاء علیہم السلام تک وحی کی پہنچانے میں سبقت اور چستی سے کام لیتے ہیں۔ اور

---

[1] سنن ابی داؤد باب المسئلة فی القبر وعذاب القبر و مسند احمد کتاب السنة جلد ۲

فالمدبرات امرا سے مراد وہ فرشتے ہیں جو معاملات کا انتظام کرنے والے ہیں یعنی سلطنت کائنات کے وہ کارکن جن کے ہاتھوں دنیا کا سارا نظام اللہ تعالی کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔

اللہ تعالی نے فرشتوں کی یہ قسمیں کس چیز کیلئے کھائی ہیں اس کی یہاں وضاحت نہیں کی گئی یعنی مقسم علیہ یہاں ذکر نہیں کیا گیا لیکن بعد کی آیات کا مضمون اس امر پر خود دلالت کرتا ہے کہ یہ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور تمام مرے ہوئے انسان ضرور از سرنو زندہ کر کے اٹھائے جائینگے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت کیا ہے یعنی وقوع قیامت اور حیات بعد الموت پر ان فرشتوں کی قسم کس لئے کھائی گئی ہے جبکہ یہ خود بھی اسی طرح غیر محسوس ہے جس طرح وہ چیز غیر محسوس ہے جس کے واقع ہونے پر ان کو بطورِ شہادت اور بطورِ استدلال پیش کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے۔ واللہ اعلم۔ کفار مکہ فرشتوں کی ہستی کے منکر نہ تھے وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ موت کے وقت انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتوں کی حرکت انتہائی تیز ہے زمین سے آسمان تک آناً فاناً وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں اور ہر کام جس کا انہیں حکم دیا جائے بلا تاخیر انجام دیتے ہیں۔

وہ یہ بھی مانتے تھے کہ فرشتے حکمِ الٰہی کے تابع ہیں اور کائنات کا نظام اللہ تعالی ہی کے حکم سے چلاتے ہیں خود مختار اور اپنی مرضی کی مالک نہیں ہیں۔ جہالت کی بناء پر وہ ان کو اللہ تعالی کی بیٹیاں ضرور کہتے تھے اور ان کو معبود بھی بنائے ہوئے تھے۔ لیکن ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اصل اختیارات انہیں کے ہاتھ میں ہیں اس لیے یہاں وقوع قیامت اور حیات بعد الموت پر ان کے مذکورہ بالا اوصاف سے استدلال اس بناء پر کیا گیا ہے کہ جس اللہ عزوجل کے حکم سے فرشتے تمہاری جان نکالتے ہیں اسی کے حکم سے وہ دوبارہ جان بھی ڈال سکتے ہیں اور جس رب العالمین کے حکم سے وہ کائنات کا نظام چلا رہے ہیں اسی کے حکم سے جب بھی اس کا حکم ہوا اس کائنات کو درہم برہم بھی کر سکتے ہیں اور ایک

دوسری دنیا بھی بنا سکتے ہیں اس کے حکم کی تعمیل میں ان کی طرف سے ذرہ بھر سستی یا لحہ بھر کی تاخیر بھی نہیں ہو سکتی۔ ❶

نواب صدیق حسن فرماتے ہیں النزعت ،النشطت، السبحت، السبقت ، المدبرت، ان سے مراد ملائکہ ہیں اوران کے مابین حرف عطف تغایر وصفی کو تغایر ذاتی کے مرتبہ میں رکھنے کی وجہ سے لائے ہیں اوران قسموں کو مؤنث لفظوں سے لانے کی وجہ یہ ہے کہ مقسم بہ سے طوائف الملائکہ مراد ہیں ۔ جو طائفہ کی جمع ہے اور یہ مؤنث ہے۔ فالسبقت میں فاء لانے کی وجہ یہ ہے کہ السبحت اس کا سبب ہے جیسے قام فذھب میں قیام ذھب کا سبب ہے اور فالمدبرت میں فاء کے ساتھ عطف سبقت کے ساتھ مطابقت کیلئے لائے ہیں۔ ❷

امام زمخشری کہتے ہیں کہ ان آیات میں مقسم علیہ یعنی جس چیز پر قسم اٹھائی گئی ہے لتبعثن ہے جسے اس بناء پر حذف کر دیا گیا ہے کہ بعد میں آنیوالی آیات میں جو قیامت کا تذکرہ ہے وہ اس پر دلالت کرتی ہیں اور یوم ترجف الراجفة بھی اسی محذوف لتبعثن فعل کی وجہ سے منصوب ہے یعنی یہ محذوف لتبعثن کا مفعول فیہ ہونیکی وجہ سے منصوب ہے۔ ❸

جمہور اہل علم نے مقسم علیہ لتبعثن کو محذوف مانا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں مقسم علیہ محذوف نہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے کیونکہ یہاں قسم کا ایسا مقام ہے اور کلام کا یوں انداز ہے کہ جواب قسم کی ضرورت ہی نہیں ۔امام طبری اس سورۃ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں:۔

((والصواب من القول فی ذلك عندنا ان جواب القسم فی هذا الموضع مما استغنی عنه بدلالة الكلام فترك ذكره۔)) ❹

سورت النازعات میں اللہ تعالیٰ نے قیامت اور زندگی بعد الموت کے اثبات کے

---

❶ تفہیم القرآن ❷ فتح البیان فی مقاصد القرآن ❸ کشاف

❹ جامع البیان عن تاویل القرآن جلد ۱۵۔صفحہ ۲۳

لیے آغاز کلام میں موت کے وقت جان نکالنے والے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلا تاخیر بجالانے والے اور حکم الٰہی کے مطابق ساری کائنات کا انتظام کرنے والے فرشتوں کی قسم کھا کر یہ یقین دلایا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی اور موت کے بعد دوسری زندگی ضرور پیش آ کر رہے گی۔ کیونکہ جن فرشتوں کے ہاتھوں آج جان نکالی جاتی ہے انہی کے ہاتھوں دوبارہ جان ڈالی جاسکتی ہے اور جو فرشتے آج اللہ عزوجل کے حکم کی تعمیل بلا تاخیر بجالاتے ہیں اور کائنات کا انتظام چلاتے ہیں وہی فرشتے کل اسی رب العزت کے حکم سے کائنات کا یہ نظام درہم برہم کر سکتے ہیں اور ایک دوسرا نظام قائم بھی کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام جسے تم بالکل ناممکن سمجھتے ہو اللہ تعالیٰ کے لیے سرے سے کوئی دشوار کام نہیں ہے جس کے لیے کسی بڑی تیاری کی ضرورت ہو بس ایک جھٹکا دنیا کے اس انتظام کو درہم برہم کر دے گا اور ایک دوسرا جھٹکا اس کے لیے بالکل کافی ہوگا کہ دوسری دنیا میں یکا یک تم اپنے آپ کو زندہ موجود پاؤ گے اس وقت وہی لوگ جو اس کا انکار کر رہے ہیں خوف سے کانپ رہے ہوں گے اور سہمی ہوئی نگاہوں سے وہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہے ہوں گے جس کو وہ اپنے نزدیک ناممکن سمجھتے تھے۔

(۲۹) سورت التکویر

﴿ فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ○ الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ ○ وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ○ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ○ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ○ ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ ○ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ ○ وَمَا صَاحِبُكُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ○ وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِيۡنِ ○ وَمَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ ○ وَمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ ○﴾ (۱۵ تا ۲۵)

’’پس نہیں ۔ میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے والے، چلنے والے، چھپ جانے والے

تاروں کی اور رات کی جب وہ رخصت ہو اور صبح کی جب وہ سانس لے یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر کا قول ہے جو بڑی توانائی رکھتا ہے عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے وہ با اعتماد ہے اور (اے اہل مکہ) تمہارا رفیق مجنون نہیں ہے اس نے اس پیغمبر کو روشن افق پر دیکھا ہے اور وہ غیب کے معاملہ میں بخیل نہیں ہے اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔

ان آیات میں فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس اور والیل اذا عسعس اور والصبح اذا تنفس مقسم بہ ہیں اور انه لقول رسول کریم سے لے کر وما هو بقول شیطن رجیم تک مقسم علیہ ہے ان آیات میں قرآن مجید کے کلام اللہ اور آپ ﷺ کے سچے رسول ہونے پر قسم اٹھائی گئی ہے۔

فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس میں لا قسم سے پہلے قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس زعم کی نفی کیلیے آیا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہے۔ الخنس خانس کی جمع ہے خنس کا معنی چھپنا، منقبض ہونا اسی بنا پر شیطان کو خناس کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بھی چھپ جاتا ہے جس وقت بندہ اپنے رب کا ذکر کرتا ہے۔ اور الکنس کانس کی جمع ہے کانس کہتے ہیں جو اپنے گھر میں داخل ہو جائے۔ اور الجوار جاریۃ کی جمع ہے چلنے والے ستارے۔ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی تین حالتوں میں قسم اٹھائی ہے ان کے طلوع اور چلنے اور غروب ہونے میں۔ راجح قول یہی ہے کہ الخنس، الکنس اور الجوار سے مراد ستارے ہیں۔ بعض مفسرین نے ستاروں کے علاوہ ان تینوں کی اور بھی تفسیر کی ہے۔ لیکن ابن قیم رحمہ اللہ نے التبیان میں ستاروں کے مقسم بہ ہونے کو ترجیح دی ہے۔ بعض مفسرین نے اس قسم کو خاص ستاروں کے ساتھ مخصوص کیا ہے لیکن ستاروں کی جو صفات یہاں ذکر ہوئی ہیں وہ تمام ستاروں پر منطبق ہوتی ہیں خواہ وہ ثوابت ہوں یا سیارے۔ راجح یہی ہے کہ تمام ستارے مراد ہیں۔

والیل اذا عسعس۔ عسعس کے معنی میں اختلاف ہے اکثر نے اس کا معنی جانا کیا

ہے حسن بصری وغیرہ نے اس کا معنی آنا کیا ہے یعنی جب رات چھا جائے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رات کے آنے اور دن کے آنے کی قسم اٹھائی ہے۔ والصبح اذا تنفس یہ والیل اذا عسعس کے مقابل ہے اور اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر رات کے آنے اور دن کے روشن ہونے کی قسم اٹھائی ہے۔ والیل اذا یغشی والنھار اذا تجلی اور جو کہتے ہیں کہ عسعس کا معنی رات کا جانا ہے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ مدثر میں رات کے جانے کی قسم اٹھائی ہے کلا والقمر واللیل اذا ادبر والصبحُ اذا اسفر۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے عسعس کا معنی جانا اسے راجح قرار دیا ہے عسعس اضداد میں سے ہے اس کا معنی آنا اور جانا دونوں ہیں۔

لا اقسم میں بعض مفسرین لا کو زائدہ برائے تاکید قرار دیتے ہیں۔

قرآن مجید میں نفی کے انداز میں قسم لانے کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں قرآن مجید میں سات سورتوں میں آٹھ مرتبہ لا اقسم کے ساتھ قسمیں آئی ہیں بعض جگہ پہلے حرف عطف آیا ہے اور بعض جگہ نہیں۔ عبدالرحمٰن حسن الحسنبکہ المیدانی نے ایک اور انداز اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مجید کا نیا بیانی اسلوب ہے جو اس سے پہلے کسی نے اختیار نہیں کیا مخاطبین کی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے موضوع کے دو متعارض تقاضے ہیں ایک تقاضا اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ مقسم علیہ خبر کے لیے مؤکد قسم لائی جائے اور دوسرے کا تقاضا ہے کہ ایسا بیان ہو جس میں قسم نہ ہو۔ قرآنی اسلوبوں میں یہ ایک نیا حل ہے کہ ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں قسم کے لفظ کو اور مقسم بہ کو ذکر کیا اس سے پہلے اداۃ نفی لا کو لائے اس پر آگاہ کرنے کے لیے جو وجہ قسم کا تقاضا کرتی ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے قسم اور مقسم بہ کو ذکر کیا جس سے اس بات پر آگاہ کیا کہ مقسم بہ میں جو تاکید یا دلیل ہے جو رہنمائی کرتی ہے کہ وہ موضوع جس کی تاکید کا ارادہ ہے وہ متحقق الوقوع ہے اور وہ وجہ جو قسم کی ضرورت نہ ہونے کا تقاضا کرتی ہے اس کی حالت کا لحاظ رکھا گیا کہ حرف نفی لا کے ساتھ قسم کی نفی کر دی۔

قرآن مجید میں سور کی ترتیبِ نزول میں ایسی قسم سب سے پہلے سورۃ التکویر میں آئی جو ترتیبِ نزول سے ساتویں اور ترتیبِ تلاوت کے لحاظ سے اکیسویں سورۃ ہے اس سورت میں ستاروں اور رات اور دن کی ایک غیبی خبر پر قسم اٹھائی گئی ہے کہ بلاشبہ قرآن مجید جبریل علیہ السلام نے محمد ﷺ تک پہنچایا ہے اور آپ نے جیسے حاصل کیا ویسے ہی امت تک پہنچایا اللہ تعالیٰ کی یہ تکوینی چیزیں اس بات کی حقدار ہیں کہ ایک خبر کے مضمون کو پکا کرنے کے لیے ان کی قسم اٹھائی جائے اور مخاطبین کی توجہ ان مظاہرِ تکوینیہ پر علمی انداز سے بحث کرنے کی توجہ دلائی اس امید پر اللہ تعالیٰ کی خلق کی جو عجائبات ہیں ان کو کھولا جائے اور اس کی محکم تدبیر کو واضح کیا جائے تاکہ اس کی قدرت اور وسیع علم اور عظیم حکمت پر استدلال کیا جائے پھر اس قسم کے ذریعے مخاطبین کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اس خبر کو تسلیم کر لیں۔ اس لحاظ سے اس کا تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ قسم اٹھائی جائے لیکن جب ان آیات میں مخاطب نزول قرآن کو وقت وہ لوگ تھے جو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے منکر تھے اور وہ مظاہرِ تکوینیہ کے بارے میں آج کی طرح وسیع علم نہ رکھتے تھے اور نہ ان کے بس میں تھا کہ آج کی سائنسی معلومات حاصل کر سکیں تو مظاہرِ تکوینیہ کی ان کے سامنے قسم اٹھانا کوئی مفید نہ تھا کیونکہ مخاطبین کو یہ چیز کوئی فائدہ نہ دیتی تھی اس بات کا تقاضا تھا کہ قسم نہ اٹھائی جائے۔ مختلف حالات کے تقاضے ایجابی اور سلبی ہیں تو قرآن میں نہایت اعلیٰ بیانی حل یہ اختیار کیا گیا کہ مظاہرِ تکوینیہ کے ساتھ قسم اٹھائی گئی اور قسم کا لفظ ذکر کیا گیا اور حرف نفی لا کے ساتھ قسم کی نفی کی گئی یہ ایک نیا اعلیٰ بیانی اسلوب ہے۔

دوسری اس انداز کی قسم سورۃ القیامۃ میں اور تیسری سورۃ البلد میں اور چوتھی قسم سورہ الواقعۃ میں اور پانچویں سورہ الحاقۃ میں اور چھٹی سورہ المعارج میں اور ساتویں قسم اس انداز کی سورۃ الانشقاق میں ہے۔[1]

[1] قواعد التدبر

مقسم علیہ کی تفصیل

﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ ﴾

کفارِ مکہ نے جب دیکھا کہ لوگ آپ کی دعوت سے متاثر ہو رہے ہیں اور عذاب و قیامت کا ڈراوا ایک حقیقت بنتا جا رہا ہے اور بہت سے لوگ اس دعوت کے حامی بنتے جا رہے ہیں تو انہوں نے لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے کیلیے یہ مشغلہ ایجاد کیا کہ یہ قرآن نہ تو اللہ عز وجل کی وحی ہے اور نہ اس کے پیش کرنے والے اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں بلکہ یہ ہمارے کاہنوں کی طرح ایک کاہن ہے جس طرح کاہنوں کا تعلق جنات سے ہوتا ہے جو انہیں غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں اور محمد اس کو خدائی وحی کے نام سے پیش کرتا ہے اور دعوٰی کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے اور اللہ عز وجل نے اسے اس لئے بھیجا ہے کہ ہم اس کی اطاعت کریں۔ اگر ہم نے اس کی بات نہ مانی تو اس دنیا میں بھی ہم پر عذاب آ جائے گا اور اس کے بعد آخرت میں ہمارے لئے جہنم تیار ہے۔ قرآنِ مجید نے ان کے اس پروپیگنڈے کی جگہ جگہ تردید کی ہے سورۃ الشعراء اور سورہ النجم میں اس کی تردید بالوضاحت ہوئی ہے سورۃ التکویر میں اس پروپیگنڈے کی تردید ایک نئے پہلو سے کی گئی ہے جسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے عربوں میں مروج کہانت کی اصل بنیاد کو جان لینا ضروری ہے عربوں میں علمِ کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ ایک علمِ نجوم پر وہ ستاروں کے مصرّف بالذات ہونے کے معتقد اور بعض سعد اور بعض کے نحس ہونے کے مدعی تھے۔ اس طرح ستاروں کے طلوع وغروب، گرنے، چڑھنے، چلنے اور چھپنے کے متعلق مختلف قسم کے اوہام

انہوں نے ایجاد کر رکھے تھے جن کی بنیاد پر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے مختلف قسم کی مبارک یا منحوس پیشین گوئیاں کرتے اور اپنی غیب دانی کی دھونس جماتے مثلاً بسا اوقات یہ افواہ پھیلا دیتے کہ فلاں ستارے کی الٹی گردش سے ایک بڑا خطرہ ظہور میں آنے والا ہے اس سے بچنے کی تدابیر معلوم کرنے کے لیے لوگ ان سے رجوع کریں۔ پھر جو بے وقوف ان کے دام میں آ جاتے ان کو وہ اچھی طرح بے وقوف بناتے۔

دوسری یہ کہ وہ جنات سے رابطہ رکھتے اور ان کے ذریعہ سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کے مدعی تھے جب کوئی شخص ان سے کسی معاملہ میں غیبی رہنمائی کا طالب ہوتا تو وہ اس مقصد کے لیے مراقبہ کی نمائش کرتے اور ایک مقفی اور مسجع کلام کی صورت میں اکثر بے معنی یا ذو معانی کلام ہوتا ہے اپنی مزعومہ وحی پیش کر کے اس کے کچھ الٹے سیدھے معنی بیان کرتے اور دعوی کرتے کہ یہ وحی ان پر عالم غیب کی اسرار سے واقف ایک جن نے کی ہے۔ مشرکینِ مکہ کبھی کہتے تھے کہ اسے کوئی انسان سکھاتا ہے کبھی کہتے اس رسول ﷺ نے خود بنایا ہے اور کبھی کہتے یہ مجنون ہے اور کبھی آپ ﷺ کو شاعر اور کاہن کہتے تو اللہ تعالیٰ نے تاکید کے طور پر قسمیں کھا کر فرمایا کہ قرآن مجید اللہ تعالی کا کلام ہے جسے جبریل امین لائے ہیں جو صاحبِ قوت، معتبر، امانت دار فرشتہ ہے اس نے یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ کو پہنچایا ہے اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کی پانچ صفتیں ذکر فرمائی ہیں (۱) کریم (۲) قوی (۳) مکین عندرب العالمین (۴) مطاع فی السموت (۵) امین

پہلی صفت کہ محمد ﷺ کی طرف آنیوالا رسول کریم ہے ایسے نہیں جیسے آپکے دشمن کہتے ہیں کہ اسے لانے والا شیطان ہے شیطان تو خبیث، خباثت پھیلانے والا، کمینہ، بدشکل، بھلائی کا دشمن، جس کا باطن ظاہر سے زیادہ قبیح ہے جس کے اندر اور آس پاس بھلائی نام کی کوئی چیز نہیں کرم و شرافت سے بہت دور اور جو رسول محمد ﷺ کے پاس قرآن لائے وہ کریم، نہایت پاکیزہ، پاکیزہ لوگوں کے معلم، زمین میں ہر قسم کی خیر خواہ ہدایت ہو یا علم یا معرفت اور ایمان و نیکی سب اس کے ہاتھوں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہنچائی ہے صوری اور

معنوی طور پر انتہائی کریم۔

دوسری صفت ذو قوة بیان فرمائی جیسے سورۃ النجم میں علمه شدید القوی فرمائی اس میں اس وصف کے ذکر کرنے میں کئی چیزوں پر تنبیہ فرمائی (۱) کہ جبریل علیہ السلام اپنی قوت کے ذریعے شیاطین کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا اور نہ اس سے کوئی چیز لے سکتے ہیں نہ اس میں کوئی کمی اور اضافہ کر سکتے ہیں بلکہ شیطان جبریل علیہ السلام کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے قریب نہیں آتا (۲) کہ جبریل علیہ السلام کو جو آرڈر ملے وہ اپنی طاقت کی بنا پر اس کی تنفیذ پر قادر ہے اس سے عاجز نہیں اور قرآن جیسی عظیم اور اہم چیز کے رسول اللہ ﷺ تک پہنچانے پر اسے پاور اور طاقت ہے۔

تیسری صفت عند ذی العرش مکین وصف ذکر کر کے اشارہ کیا کہ جبریل علیہ السلام کی شان بہت بلند ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نہایت قریب ہے کسی اور فرشتے کو اتنا قرب حاصل نہیں۔ اور چوتھی صفت مطاع ثم میں اشارہ ہے کہ جبریل علیہ السلام بلاتے ہیں تو فرشتے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور پانچویں صفت امین ذکر کر کے اشارہ فرمایا کہ جبریل علیہ السلام کے ذمے جو امانت لگائی گئی ہے وہ بغیر کسی کمی بیشی کے انہوں نے ادا فرمائی ان مذکورہ صفات والے فرشتے کی معرفت جو اللہ تعالیٰ کا پیغام اللہ عزوجل کے نبی کو پہنچتا ہے وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ایسا عالی شان کلام شیطان مردود کیسے لا سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے سورہ الشعرآء میں فرمایا۔

وما تنزلت به شياطين وما ينبغى لهم وما يستطيعون انهم عن السمع لمعزولون۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قسمیں اٹھا کر اس بات کی تردید فرمائی ہے کہ قرآن مجید ملعون شیطان کا قول نہیں ہے شیطان رجیم کے بس میں نہیں کہ وہ قرآن کو اٹھا سکے اور نہ اس کے یہ لائق ہے۔

جبریل علیہ السلام کی صفات اس لئے بیان کی گئیں کہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کس محفوظ اور مامون اور پاکیزہ ذریعہ سے اترا ہوا کلام ہے اور کاہن جس ذریعہ سے

اپنا مزعومہ علم حاصل کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے فرمایا یہ باعزت رسول، زور قوت والا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی اعلیٰ اور محکم صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ دوسری شیطانی قوتیں اس کو مرعوب یا مغلوب یا متاثر نہیں کرسکتیں کہ وہ اس کے فرائضِ مفوضہ میں وہ مزاحم ہوسکیں یا اس سے کوئی چیز اچک سکیں یا رسول کو دھوکہ دیں سکیں وہ صاحبِ عرش کے احکام پورے اختیار اور اور اقتدار کے ساتھ نافذ کرتا ہے اس لئے کہ وہ اس کی بارگاہ میں نہایت تقرب اور رسوخ رکھنے والا ہے اس کو صاحب عرش تک براہِ راست رسائی حاصل ہے کوئی دوسرا اس کے اور صاحب عرش کے درمیان حائل نہیں۔ جو ارواح اور ملائکۃ اس کی ماتحتی میں ہیں وہ سب بے چون چرا اس کے مطیع ہیں مجال نہیں کہ سرِ مواس کی احکام سے انحراف کرسکیں یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں یا اس کے دیئے ہوئے احکام میں کوئی تحریف یا ترمیم یا شیاطین کے ساتھ کوئی ساز باز کرسکیں۔

فائدہ: ثم امین۔ کلامِ عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ثَمَّ اور ثُمَّ کے مواقع استعمال میں بڑا فرق ہے ثَمَّ کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارے کیلئے بھی آتا ہے اور کسی صفت سے پہلے اس پر خاص اہتمام سے زور دینے کیلئے بھی صفت سے پہلے جب آتا ہے تو اس کی عظمت اور اہمیت کو نمایاں کرتا ہے یہاں صفت امین سے پہلے ثم کے لانے سے مقصود جبریل علیہ السلام کی اس صفت کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ ان کی خاص اہمیت رکھنے والی لائق صفت یہ بھی ہے کہ وہ نہایت امانت دار ہے اس صفت کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہی صفت اسی امر کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول کے پاس جو کچھ بھی لاتے ہیں نہ اس میں کچھ ملاوٹ کا شائبہ نہ کمی بیشی کا اندیشہ۔ اس کے برعکس کاہنوں کے علم کا حال یہ ہے کہ وہ جن شیاطین سے علم حاصل کرتے ہیں وہ اچکے اور چور ہوتے ہیں اول تو وہ ملأ اعلیٰ تک پہنچتے نہیں۔ اگر کوئی بات اچکنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ یکسر جھوٹ ہوتی ہے جس میں مزید جھوٹ ملا کر اپنے کاہنوں کی طرف القا کرتے ہیں اور کاہن ان سے بھی جھوٹے ہوتے ہیں جو اپنی دوکانداری کو

فروغ دینے کیلئے رائی کو پربت بناتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس ناپاک جو ہر کو اس چشمہ صافی سے کیا نسبت جس سے اللہ تعالیٰ کا رسول فیضیاب ہوتا ہے۔

مطاع ثم امین : میں ثم کے ساتھ ظرف مذکورہ یعنی عند ذی العرش کی طرف اشارہ کیا ہے اور جمہور نے اسے ثم ث کے فتح کے ساتھ اور ابوجعفر ہشیم وغیرہ نے اسے ثم ث کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ عاطفہ ہے جمہور کے قول کے مطابق ثم ظرف مکان للبعید ہے اور اس میں عامل مطاع یا اس کے بعد امین ہے۔ ❶

جبریل علیہ السلام کی زبردست قوتوں اور ان کی عظیم توانائی کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بیان میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے دو مرتبہ جبریل علیہ السلام کو اس کی اصل صورت میں دیکھا ہے انکی عظیم ہستی زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی نیز صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو اس شان میں دیکھا کہ ان کے چھ سو (۶۰۰) پر تھے ان احادیث سے جبریل علیہ السلام کی زبردست طاقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کو پیغام بر کا قول کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اس فرشتے کا اپنا کلام ہے بلکہ قول پیغام بر کے الفاظ خود ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ اس ہستی کا کلام ہے جس نے اسے پیغام بر بنا کر بھیجا ہے سورۃ الحاقۃ آیت نمبر (۴۰) میں اسی طرح قرآن کو محمد ﷺ کا قول کہا گیا ہے وہاں بھی مراد یہ نہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا تصنیف کردہ ہے بلکہ اسے رسول کریم کا قول کہہ کر وضاحت کر دی کہ اس چیز کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں نہ کہ محمد بن عبداللہ کی حیثیت سے۔ دونوں جگہ قول کو فرشتے اور محمد ﷺ کی طرف منسوب اس بنا پر کیا گیا ہے کہ اللہ کا پیغام محمد ﷺ کے سامنے پیغام لانیوالے فرشتے کی زبان سے اور لوگوں کے سامنے محمد ﷺ کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔

---

❶ فتح القدیر

اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ نے تاریکی میں کوئی خواب نہیں دیکھا بلکہ جب تارے چھپ گئے رات رخصت ہوگئی اور صبح روشن نمودار ہوئی اس وقت کھلے آسمان پر انہوں نے رب العزت کے فرشتے کو دیکھا تھا اس لئے وہ جو کچھ بیان کررہے ہیں وہ ان کی آنکھوں دیکھے مشاہدے اور پورے ہوش کے ساتھ دن کی روشنی میں پیش آنے والے تجربے پر مبنی ہے تم لوگوں کا یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن میں قیامت کے احوال اور دیگر چیزیں بیان کی جارہی ہیں وہ کسی دیوانے کی بڑ ہے یا شیطانی وسوسہ ہے۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس مقام پر جبریل علیہ السلام کے آپ ﷺ سے افضل ہونے کا ذکر کیا ہے یہ معتزلہ کا مذہب ہے کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں اور اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام افضل ہیں اس مقام میں جبریل علیہ السلام کے اوصاف زیادہ اور آپ ﷺ کے اوصاف کم اس لیے ذکر کئے ہیں کہ جبریل علیہ السلام مخاطبین کے لئے مجہول تھے لیکن محمد ﷺ ان کے ساتھ رہنے والے تھے اس لیے صرف اس بہتان کی نفی کی جو انہوں نے آپ پر لگایا کہ یہ مجنون ہے۔

وما صاحبكم بمجنون

رفیق سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں آپ ﷺ کو اہلِ مکہ کا رفیق کہہ کر دراصل انہیں اس بات کا احساس دلایا گیا کہ آپ ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ انہی کے ہم قوم اور ہم قبیلہ ہیں انہی کے درمیان آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی اور ان کے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ آپ ﷺ کس قدر دانا اور ہوشمند انسان ہیں ایسے شخص کو جانتے بوجھتے مجنون کہتے ہوئے کچھ تو شرم آنی چاہیے۔ اس مقام پر آپکا نام لینے یا ہمارا رسول کہنے کی بجائے تمہارا صاحب کہہ کر آپکا ذکر کرنے میں بڑی گہری معنویت ہے اس سے قریش کے لوگوں کو احساس دلانا مقصود ہے کہ جس شخص کا تم سے ذکر کیا جارہا ہے وہ تمہارے ہاں باہر سے آیا کوئی اجنبی آدمی نہیں ہے کہ اس سے تمہاری پہلے کی کوئی جان پہچان نہ ہو۔ تمہاری اپنی قوم کا آدمی ہے تمہارے ہی ساتھ رہتا بستا ہے تمہارا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ کون ہے، کیا ہے، کس

سیرت و کردار کا انسان ہے، کیسے اس کے معاملات ہیں، کیسی اس کی عادات و خصائل ہیں اور آج تک تمہارے درمیان اس کی زندگی کیسی رہی اس کے بارے میں منہ پھاڑ کر کوئی کچھ کہہ دے تو تمہارے اندر ہزاروں آدمی اس کے جاننے والے موجود ہیں جو خود دیکھ سکتے ہیں کہ یہ شخص مجنون نہیں۔

ملائکہ اور رسل میں کون افضل ہیں اس بارے میں اختلاف ہے ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے نزدیک رسول افضل ہیں اور معتزلہ کے نزدیک فرشتے افضل ہیں لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ کسی ایک کو فضیلت دیتے ہوئے دوسرے کی تنقیص جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں جبریل علیہ السلام کے جو اوصاف بیان کئے ہیں سورۃ الحاقۃ کے آخر میں ان میں سے بعض رسول اللہ ﷺ کے اوصاف ذکر کئے ہیں۔ ❶

ولقد راہ با لافق المبین

کہ آپ ﷺ نے جبریل امین کو روشن افق پر دیکھا ہے سورۃ النجم میں فرمایا وھو بالا فق الا علی کہ جبریل امین آپ ﷺ کے سامنے بالائی افق پر ظاہر ہوا۔ افق سے مراد آسمان کا مشرقی کنارہ ہے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے اور دن کی روشنی پھیلتی ہے یہ دونوں آیات صراحت کرتی ہیں کہ پہلی مرتبہ جبریل علیہ السلام جب نظر آئے اس وقت وہ آسمان کے مشرقی کنارے سے نمودار ہوئے تھے۔ متعدد معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ اپنی اصلی صورت میں تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا۔ مسند امام احمد میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جبریل کو اس صورت میں دیکھا کہ اس کے چھ سو بازو تھے۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ جبریل کا ایک بازو اتنا عظیم تھا کہ افق پر چھایا ہوا نظر آتا تھا کہ آپ ﷺ نے جبریل کا یہ مشاہدہ دن کی روشنی میں اور پوری بیداری کی حالت میں کھلی آنکھوں سے کیا یہ نظر کا کوئی دھوکہ نہیں تھا یا کوئی جن یا شیطان نہیں تھا جو انہیں نظر آیا۔

---

❶ الا نتصاف

جبریل کے دیکھنے کا یہ منظر سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ ❶

اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ نے تاریکی میں کوئی خواب نہیں دیکھا بلکہ جب تارے چھپ گئے رات رخصت ہوگئی اور صبح روشن نمودار ہوئی اس وقت کھلے آسمان پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرشتے کو دیکھا تھا اس لئے وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ ان کی آنکھوں دیکھے مشاہدے اور پورے ہوش کے ساتھ پیش آنے والے تجربے پر مبنی ہے تم لوگوں کا یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن میں قیامت کے احوال اور دیگر چیزیں بیان کی جارہی ہیں وہ کسی دیوانے کی بڑ ہے یا شیطانی وسوسہ ہے۔

جبریل علیہ السلام کی زبردست قوتوں اور انکی عظیم توانائی کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بیان میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا میں نے دو مرتبہ جبریل کو اس کی اصلی صورت میں دیکھا ہے انکی عظیم ہستی زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی نیز صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جبریل کو اس شان میں دیکھا کہ ان کے چھ سو (۶۰۰) پر تھے ان احادیث سے جبریل کی زبردست قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ کے بارے میں جو یہ خبر دی ہے کہ آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل علیہ السلام خارج میں موجود فرشتہ ہے جس کی شخصیت دیکھی جاسکتی ہے نگاہ اس کا ادراک کرسکتی ہے فلسفی اور ان کے پیروکاروں کا یہ کہنا درست نہیں کہ جبریل علیہ السلام سے مراد عقلِ فعال ہے جس کا نگاہ سے ادراک نہیں کیا جا سکتا بس وہ ایک ذہنی خیال ہے اس کی ذات موجود نہیں یہ بات تمام رسولوں اور ان کے پیروکاروں کے خلاف ہے۔

نبی ﷺ کا جبریل امین کو دیکھنے کا اثبات اہم ہے آپ کے اللہ تبارک وتعالیٰ کو دیکھنے

---

❶ تفہیم القرآن

سے کیونکہ آپ کا جبریل علیہ السلام کو دیکھنا اصل ایمان ہے جس کے بغیر ایمان مکمل نہیں اور اس کا منکر کافر ہے۔ اور آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا یہ اختلافی مسئلہ ہے اس کے منکر کو بالاتفاق کافر نہیں کہا جا سکتا۔ صحابہ کی ایک جماعت نے یہ بات بالکل واضح کہی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا اور امام دارمی رحمہ اللہ نے اس بات پر صحابہ کا اتفاق نقل کیا ہے ہمارے لئے اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ ثابت کیا جائے کہ آپ ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا ہے۔ اگر چہ رؤیت باری تعالیٰ رؤیت جبریل علیہ السلام سے بہت بڑی ہے لیکن نبوت کا ثبوت رؤیت باری تعالیٰ پر موقوف نہیں۔ ❶

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ میں دو قراتیں ہیں (۱) ضنین ضاد کے ساتھ جس کا معنی ہے بخیل (۲) ظنین ظاد کے ساتھ جس کا معنی ہی متہم۔ یعنی یہ رسول اکرم ﷺ قرآن مجید کے بارے میں متہم نہیں بلکہ امین ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتا۔ ابن جریر نے ضنین ضاد والی قرات کو ترجیح دی ہے اور ابن قیم نے ظنین ظاد والی قرات کو راجح قرار دیا ہے رسول ملکی اور رسول بشری کے اوصاف ذکر کر کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قرآن کی سندِ روایت صاف ستھری ہے۔ محمد ﷺ نے اسے جبریل سے سنا ہے اور جبریل نے رب العالمین سے۔ ❷

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ

تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی شیطان آ کر محمد ﷺ کے کان میں یہ باتیں پھونک دیتا ہے شیطان کا یہ آخر کب کام ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو شرک اور بت پرستی اور دہریت والحاد سے ہٹا کر خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دے۔ انسان کو شتر بے مہار بن کر رہنے کی بجائے رب العالمین کے حضور ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس دلایا جائے۔ جاہلانہ رسم ظلم اور بد اخلاقی اور بد کرداری سے منع کر کے پاکیزہ زندگی، عدل وتقوی اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے۔

---

❶ التبیان فی علوم القرآن ❷ معارف القرآن

اس سورت میں مقسم بہ اور مقسم علیہ کے مابین مذکورہ مناسبت کے علاوہ دیگر مفسرین نے مناسبت کی بعض اور صورتیں ذکر کیں ہیں۔

پہلی صورت:

یہ قسمیں مطلوب مقام کے نہایت مناسب ہیں چنانچہ ستاروں کا سیدھا چلنا اور لوٹنا اور چھپ جانا مشابہ ہے فرشتے کے آنے اور واپس جانے اور عالمِ ملکوت میں جا چھپنے کے اور رات کا گزرنا اور صبح کا آنا مشابہ ہے قرآن کی سبب ظلمتِ کفر کے رفع ہو جانے اور نورِ ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے۔ ❶

دوسری صورت:

قرآن کا نزول تو اسی خالق کی طرف سے ہے جس نے اس خوبصورت کائنات کو بنایا ہے ستاروں کو پیدا کیا اور انکی رفتار مقرر فرمائی، دن، رات بنائے اور ان میں علیحدہ علیحدہ حسن و جمال اور کمال رکھا وہی خالق اس کائنات کا مصنف ہے وہی مصنف اس کتاب ہدایت کا مصنف ہے اگر کتاب کائنات پر تمہیں حیرت و استعجاب کے باوجود تکذیب کی جرات نہیں تو رسول پر نازل شدہ کتاب کی تکذیب کی جرات کیسے ہوئی۔

تیسری صورت:

ان قسموں کی مناسبت مقسم علیہ سے یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا ٹھہرنا 'لوٹنا اور چھپ جانا ایک نمونہ ہے اگلے انبیاء پر بار بار وحی آنے اور ایک مدت دراز تک اس کے نشان باقی رہنے پھر منقطع ہو کر چھپ جانے اور غائب ہو جانے کا اور رات کا آنا پھر اس کا تاریک ہونا مشابہ ہے اس دور کا جو خاتم المرسلین ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے دنیا پر ظلمت تھی کہ کسی شخص کو حق باطل کی تمیز نہ رہی اور وحی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے اس کے بعد صبح صادق کا دم بھرنا حضور ﷺ کا اس جہاں میں تشریف لانا اور قرآن کا اترنا ہے کہ ہر چیز کو

❶ ظلال القرآن

ہدایت کی نور سے دن کی طرح روشن کردیا گویا اگلے انبیاء کا نور ستاروں کی طرح تھا اور اس نورِ اعظم کو آفتابِ درخشاں کہنا چاہیے۔ ❶

(۳۰) سورت الانشقاق

﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ٥ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ٥ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ٥ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴾٥(۱٦ تا ۱۹)

''پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ ماہِ کامل ہو جاتا ہے تم کو ضرور ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے۔

ان آیات میں الشفق اور اللیل وما وسق اور القمر اذا اتسق مقسم بہ اور لترکبن طبقا عن طبق مقسم علیہ ہیں۔

تمہیں ایک حالت پر نہیں رہنا بلکہ جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت اور برزخ اور برزخ سے دوبارہ زندگی' دوبارہ زندگی سے میدانِ حشر' پھر حساب و کتاب اور پھر جزا اور سزا کی بے شمار منزلوں سے لازماً تم کو گزرنا ہوگا اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے سورج ڈوبنے کے بعد شفق یعنی سرخی کی 'دن کے بعد رات کی تاریکی اور اس میں بہت سے انسانوں اور حیوانات کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین پر پھیلتے رہتے ہیں اور چاند کا ہلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدرِ کامل بننا یہ گویا چند وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی علانیہ شہادت دے رہی ہیں کہ جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے اندر کہیں ٹھہراؤ نہیں ایک مسلسل تغیر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہر طرف پائی جاتی ہے۔لہذا کفار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ

❶ تفسیر عثمانی

موت کی آخری ہچکی کے ساتھ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ❶

ان آیات میں حق تعالیٰ نے ان چیزوں کی قسم کے ساتھ مؤکد کر کے انسان کو پھر اس چیز کی طرف متوجہ کیا ہے جس کا ذکر پہلے انك كادح الى ربك كدحا اسی سورت میں آ چکا ہے۔

یہ چیزیں جن کی قسم کھائی ہے۔ اگر غور کرو تو اس مضمون کی شاہد ہیں جو جوابِ قسم میں آنے والا ہے۔ یعنی انسان کو ایک حال پر قرار نہیں۔ اس کے حالات اور درجات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ لتركبن طبقا عن طبق اے بنی نوع انسان تم ہمیشہ ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ پر سوار ہوتے اور چڑھتے چلے جاؤ گے۔ یعنی انسان اپنی تخلیق کے ابتداء سے انتہا تک کسی وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے وجود پر تدریجی انقلابات آتے رہتے ہیں۔ نطفہ سے منجمد خون بنا پھر اس سے ایک مضغۂ گوشت بنا۔ پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوئیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور اعضاء کی تکمیل ہوئی۔ پھر اس میں روح ڈالی گئی اور وہ ایک زندہ انسان بنا۔ جسکی غذا بطنِ مادر کے اندر رحم کا خون تھا۔ نو مہینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے دنیا میں آنے کا راستہ آسان کر دیا اور خون کی جگہ ماں کا دودھ ملنے لگا دنیا کی وسیع فضا اور ہوا دیکھی، بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگا، دو برس کے اندر چلنے پھرنے اور بولنے کی قوت بھی حرکت میں آئی۔

ماں کا دودھ چھوٹ کر اس سے زیادہ لذیذ اور طرح طرح کی غذائیں ملیں۔ کھیل کود اور لہو ولعب اس کے دن رات کا مشغلہ بنا، کچھ ہوش وشعور بڑھا تو تعلیم وتربیت کے شکنجے میں کسا گیا، جوان ہوا تو پچھلے سب کام متروک ہو کر جوانی کی خواہشات نے ان کی جگہ لے لی اور ایک نیا عالم شروع ہوا نکاح شادی اولاد اور خانہ داری کے مشاغل دن رات کا مشغلہ بن گئے۔ آخر یہ دور بھی ختم ہونے لگا قویٰ میں اضمحلال اور ضعف پیدا ہوا۔ بیماریاں آئے دن رہنے لگیں، بڑھاپا آ گیا اور اس جہان کی آخری منزل یعنی قبر تک پہنچنے کے سامان ہونے

---

❶ تفهيم القرآن

لگے۔ یہ سب چیزیں تو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ مگر حقیقت سے نا آشنا انسان سمجھتا ہے کہ یہ موت اور قبر اس کی آخری منزل ہے آگے کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ جو خالقِ کائنات اور علیم وخبیر ہے اس نے آگے آنے والے مراحل کو اپنے انبیاء کے ذریعہ غافل انسان تک پہنچایا کہ قبر تیری آخری منزل نہیں بلکہ یہ صرف انتظار گاہ ہے اور آگے ایک بڑا جہان آنے والا ہے اور اس میں ایک بڑے امتحان کے بعد انسان کی آخری منزل مقرر ہو جائے گی جو یادِ الٰہی، راحت و آرام کی ہوگی یا پھر دائمی عذاب و مصیبت کی اور اس آخری منزل پر ہی انسان اپنے حقیقی مستقر پر پہنچ کر انقلابات کے چکر سے نکلے گا۔

غفلت شعار انسان کو حقیقت اور اس کی آخری منزل سے آگاہ اور اس پر متنبہ کیا کہ عمر دنیا کے تمام حالات اور انقلابات آخری منزل تک جانے کا سفر اور اس کے مراحل ہیں اور انسان چلتے پھرتے سوتے جاگتے کھڑے بیٹھے ہر حال میں اس سفر کی منزلیں طے کر رہا ہے اور بالآخر اپنے رب کے پاس پہنچتا ہے اور عمر بھر کے اعمال کا حساب دیکر آخری منزل میں قرار پاتا ہے جہاں راحت ہی راحت یا غیر منقطع مصائب ہیں تو عقلِ مندِ انسان کا کام یہ ہے کہ دنیا میں اپنے آپ کو ایک مسافر سمجھے اور اپنے وطنِ اصلی کے سامان تیار کرنے اور بھیجنے کی فکر ہی کو دنیا کا سب سے بڑا مقصد بنائے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی مسافر چند روز کے لیے کہیں ٹھہر گیا ہو یا کسی راہ گزر میں چلتے چلتے کچھ دیر آرام کے لیے رک گیا ہو'' ان آیات میں غافل انسان کو اس کی تکلیف اور عمر دنیا میں اس کو پیش آنے والے حالات و انقلابات سامنے کر کے یہ ہدایت دی کہ غافل اب بھی وقت ہے کہ اپنے انجام پر غور اور آخرت کی فکر کر۔ [1]

---

[1] معارف القرآن

شفق لغت اور شرع میں اس سرخی کو کہا جاتا ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد عشاء کے وقت تک رہتی ہے اس لفظ کا مادہ اور اصل اپنے اندر وقت کا معنی رکھتا ہے۔

لترکبن طبقا عن طبق ' احوال کے گزرنے کو انسان کے لیے سواری سے تعبیر فرمایا ہے۔ عربی محاورے میں معاملات پر سوار ہونا' اہوال اور حالات پر سواری کرنا ایک مالوف اور مانوس طرزِ ادا ہے۔ عرب شاعر اور ادیب اس ترکیب کو بہت استعمال کرتے ہیں ان کا ایک قول ہے "ان المضطر یرکب الصعب من الامور وھو عالم برکوبه" مجبور آدمی جان بوجھ کر مشکل امور پر سواری کرتا ہے۔ ان محاورات کا مطلب یہ ہے کہ گویا احوال واہوال سواریاں ہیں جن پر لوگ یکے بعد دیگرے سوار ہوتے ہیں۔ واقعات وحوادث اور احوال واہوال میں سے ہر ایک انسان کے لیے گویا ایک نیا مرحلہ ہے گذشتہ مرحلہ کے بعد انسان اس نئے مرحلہ میں رواں دواں ہو جاتا ہے اور یہ اسی طرح ہے جس طرح شفق رات اور چاندنی کا خاموشی کے ساتھ یکے بعد دیگرے رونما ہونا ہے۔ ان محسوس حوادث ومشاہد کی قسم تاکید کے لئے پیش کی گئی ہے۔

یہ نظارے الٰہی تدبیر وتقدیر پر دلالت کرتے ہیں۔ انسان چارو نا چار اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے تینوں چیزوں کو حلف کی تاکید کیساتھ بطور گواہ پیش کیا گیا۔ یعنی شفق رات اور چاند یہ تینوں چیزیں کئی تبدیلیوں پر دلالت کرتی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ منزل بہ منزل کسی غیر معلوم سفر پر رواں ہیں۔ ❶

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن مسعود ابن عباس اور اہلِ مکہ وکوفہ کے عام قاری لترکبن با کہ فتح کے ساتھ پڑھتے ہیں اور باقی با کے ضمہ کے ساتھ کہ اس سے امت کو خطاب ہے اور ابو عبیدہ نے اس کے ماقبل اور مابعد کے سیاق کی بناء پر با کے ضمہ والی قراءت کو ترجیح دی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس میں مخاطب تمہارے نبی ہیں۔ ❷

---

❶ ظلال القرآن

❷ کتاب التفسیر فتح الباری جلد ۸

بعض نے مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان مناسبت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ شفق کے بعد جو سرخی غروبِ آفتاب کے بعد افق پر نمودار ہوتی ہے یہی سرخی راتِ کی تمہید ہوتی ہے جب تک یہ باقی رہتی ہے اس وقت تک سرِ شام ہے پھر آہستہ آہستہ غائب ہوتی اور رات دنیا پر اپنا قبضہ جما لیتی ہے۔ اور وسق سے مراد کواکب و نجوم جورات کو نمودار ہوتے ہیں اور جن سے اس کی بزم آراستہ ہوتی ہے کیونکہ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ان کے طلوع و غروب کو اس حقیقت کی شہادت پر پیش کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مسخر ہیں اس کے حکم سے طلوع ہوتے ہیں اور پھر معین راستوں پر ایک خاص تدریج کے ساتھ ان کا ارتقاء ہوتا ہے پھر بتدریج ان کا زوال شروع ہوتا ہے گویا انمیں اس قانون الٰہی کی گرفت کی نہایت واضح شہادت موجود ہے کہ انسان بھی اسی طرح تغیر کا شکار ہے۔

والقمر اذا اتسق یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے کیونکہ وماوسق تمام کواکب نجوم کو شامل ہے لیکن قمر کو ان کے خاص فرد یا گلِ سرسبد کی حیثیت سے منتخب کر کے اس کے عروج اور کمال وزوال کو خاص طور پر نمایاں فرمایا کیونکہ یہاں یا ایھا الا انسا ن انك كادح الى ربك كدحا اور لتر كبن طبقا عن طبق کی حقیقت کا مظاہرہ جس طرح اس کے کمال وزوال میں ہوتا ہے اس طرح کسی دوسری چیز میں نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتا۔ چاند درجہ بدرجہ چڑھائی چڑھتا جاتا ہے مجال نہیں کہ اس سے سرِ موانحراف کر سکے اور نقطہ کمال تک پہنچ کر اس کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہیں ٹکِ جائے بلکہ اسی طرح منزل کے منزل طے کرتے ہوئے اسے اترنا پڑتا ہے اس سے بھی اس کو مفر نہیں۔

لتر کبن طبقا عن طبق یہ ان قسموں کا مقسم علیہ ہے فرمایا کہ جس طرح یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے قانون میں بندھی ہوئی ہیں سب اسی کی طرف رواں دواں ہیں اسی طرح انسان بھی ایک مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ طے کرتا ہوا کشاں کشاں اللہ تعالیٰ کی طرف جارہا ہے یہ ممکن نہیں انسان اپنی جگہ پر ہی ٹِکا رہے یا کسی اور سمت میں نکل جائے البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی ایسی سنت کے مطابق ہوگا جو اس پوری کائنات میں جاری ہے درجہ

بدرجہ اور مرحلہ وار ہوگا۔

دنیا کے پرستار اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں اپنی صلی منزل کو ہمیشہ بھولے رہتے ہیں وہ دنیا میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ اس کے باہر وہ کسی چیز پر غور ہی نہیں کر سکتے۔ دنیا کے حصول کی بھاگ دوڑ میں انہیں اس سوال پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ان کی اصلی منزل کیا ہے؟ وہ اسی دنیا کی کسی کامیابی اپنی آخری منزل سمجھتے ہیں حالانکہ آخری منزل آخرت ہے جس کی طرف سب اللہ تعالیٰ کے قانون کی زنجیر کے پابند ہیں نہایت بے بسی کے ساتھ کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں وہ بڑے محاسبہ اعمال کے لئے اللہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انسان جس دن سے وجود میں آتا ہے اسی دن سے اس کا سفر موت کی طرف شروع ہو جاتا ہے اور یہ سفر بلا کسی توقف کے جاری رہتا ہے کسی حال میں منقطع نہیں ہوتا مختلف مراحل آتے اور گذرتے جاتے ہیں انسان قانونِ قدرت کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ شاہ اور گدا، امیر و غریب، نیک و بد سب یکساں ہیں۔

(۳۱) سورت البروج

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ٥ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ٥ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ٥ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ٥ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ٥ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ٥ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ٥ ﴾

(آیت ۱ تا ۷)

"قسم ہے برجوں والے آسمان کی اور وعدہ کیے گئے دن کی اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی مارے گئے گڑھوں والے جن میں خوب بھڑکتے ہوئی ایندھن کی آگ تھی جبکہ وہ ان پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ ایمان والوں کے ساتھ وہ کر رہے تھے وہ دیکھ رہے تھے۔"

سورت کی ابتداء بر جوں والے آسمان کی قسم سے، وعدہ کے دن کی قسم سے، شاہد و مشہود کی قسم سے ہوئی ہے اور فرمایا کہ مارے گئے کھائیوں والے اس قسم نے آسمان اور اس کے ہولناک بر جوں، وعدہ کے دن اور اس کے بڑے حوادث، گواہی دینے والوں کی اور جس چیز کی گواہی دی جائے ان سب چیزوں کو ایک ربط میں جمع کر دیا اور فرمایا اس حادثے کو برپا کرنے والوں پر آسمانی انتقام نازل ہوا۔

قتل اصحب الا خدود اس واقعہ کو مختصر پیش کیا ہے اس کے ساتھ اشارۃً یہ بھی بتایا کہ عقیدے کی عظمت کے آگے لوگوں کی دشمنی اور فتنہ پردازی کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی زندگی کیساتھ موت تو لگی ہوئی اور وہ ہر زندہ پر آئے گی مگر وہ موت جو اعلیٰ مقاصد کے لئے آئے وہ زندگی ہے جو موت کو مفتوح کر لیتی ہے عقیدہ آگ کی کھائی پر بوجھل ہے۔

یہ تینوں عظیم چیزیں ہیں اہتمام اور ضخامت اور عظمت کے سائے اس واقعہ پر ڈالتی ہیں جو آگے مذکور ہے۔ یہ حادثہ بڑا عظیم ہے جو عقیدے اور ایمان کی بڑائی کا اظہار کرتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو زمین آسمان کی بڑی بڑی چیزیں اس جیسے ایمانی واقعات کے سامنے ہیچ ہیں بلکہ یوں کہنا انسب ہوگا بلکہ یوں کہنا کہ اس قسم کے عظیم واقعات دنیوی زندگی اور محدود مدت سے بھی عظیم تر ہیں۔ ان تینوں چیزوں کی قسم کھا کر جو فضا پیدا کی گئی اس کے بعد اصل واقعہ کی طرف چند اشارے کیے گئے ہیں۔ مارے گئے خندقوں والے جو ایک بھڑکتی آگ تھی جبکہ وہ اس پر بیٹھے ہوتے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کیساتھ کر رہے تھے اس پر خود حاضر و موجود تھے اور مومنوں کے ساتھ ان کی عداوت کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ اللہ عزیز وحمید کے ساتھ ایمان لائے تھے اسی کی بادشاہت آسمانوں اور زمینوں پر ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔

قتل کا لفظ جو اصحاب الا خدود کیلئے وارد ہوا ہے یہ ان پر غضب الٰہی کو ظاہر کرتا ہے ان پر بھی اور ان کے فعل پر بھی اور اس فعل کی برائی کو ظاہر کرتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے

غضب کا باعث ہے اخدود سے مراد خندق ہے جس کو خندقوں والوں نے کھودا تھا اور آگ جلا کر اسے بھر دیا تھا اسی لئے اخدود کی تفسیر میں النار ذات الوقود فرمایا ہے گویا کہ خندق خود آگ تھی یا آگ خندق بن گئی تھی۔ سبب یہ ہے کہ خندق میں آگ کا بھڑکنا اتنا شدید تھا جس سے آگ اور خندق کا امتیاز ختم ہو گیا تھا خندق والے غضبِ الٰہی کے حقدار بنے کیونکہ وہ خندق کی قریب بیٹھے ہوئے اس میں آگ جلواتے اور ایمانداروں کو اس میں ڈالتے تھے۔ ان کے نزدیک ایمانداروں کا جرم نا قابلِ معافی تھا۔

ان ظالموں کے دلوں میں ایمانداروں کا قصور کیا تھا؟ وہی جو ہر زمانہ میں ایمانداروں کا ہوتا ہے۔ انہوں نے ان سے صرف اس لئے انتقام لیا تھا کہ وہ صرف اللہ عزیز وحمید پر ایمان لائے تھے وہ اللہ عزوجل جس کی بادشاہت آسمانوں اور زمینوں پر محیط ہے اور ہر چیز پر محیط ہے یہ ان کا جرم تھا جس کی سزا ان کو بھگتنا پڑی وہ سچے اللہ تعالیٰ پر جو کائنات کا حقیقی مالک وشہنشاہ ہے، ہر چیز پر گواہ اور حاضر ہے اس رب پر ایمان لائے تھے اور اس پر ایمان لانا کفار ومشرکین کے نزدیک سب سے بڑا جرم تھا۔ ظالم اور سرکش ہمیشہ یہ چاہتے رہے کہ کوئی شخص ان کی مرضی کے خلاف کوئی عقیدہ اختیار نہ کرے خاص کر عقیدہ توحید کے تو وہ ہمیشہ سے دشمن رہے کیونکہ اس عقیدہ کی حقیقت ہر جھوٹے خدا کی خدائی کی نفی کرتی ہے وہ اسی سبب سے اس عقیدے کو برداشت نہیں کر سکتے یہ عقیدہ اگر دنیا میں کامیاب ہو جائے تو پھر ہر باغی وطاغی کی مرضی ختم ہو جاتی ہے۔ [1]

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے زمانہ میں ایک بادشاہ تھا اس کا ایک جادوگر تھا وہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں تو اب بوڑھا ہو گیا ہوں اس لئے ایک لڑکے کو میرے سپرد کرو تا کہ میں اسے جادو کا علم سکھاؤں بادشاہ نے جادوگر کے پاس جادو سیکھنے کے لیے ایک لڑکا بھیجا اس لڑکے کے راستے میں ایک راہب تھا لڑکا راہب کے پاس بھی بیٹھنے لگا۔ لڑکے کو راہب کی باتیں بہت پسند

[1] فی ظلال القرآن

لڑکا جب بھی جادوگر کے پاس جاتا راستے میں راہب کی مجلس میں بیٹھتا۔ جادوگر لڑکے کو (دیر سے آنے کی وجہ سے) سزا دیتا چنانچہ لڑکے نے راہب سے شکایت کی راہب نے کہا جب تم جادوگر سے ڈرو تو اسے کہو مجھے گھر والوں نے روک رکھا تھا جب گھر والوں سے ڈرو اور خطرہ محسوس ہو تو انہیں کہو کہ مجھے جادوگر نے روک رکھا تھا۔ اسی دوران ایک مرتبہ لڑکے نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے جانور نے لوگوں کا راستہ روک رکھا ہے لڑکے نے کہا کہ آج مجھے معلوم ہو جائے گا کہ یہ جادوگر بہتر ہے یا وہ راہب افضل ہے۔

چنانچہ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور دعا کی اے اللہ اگر تیرے نزدیک راہب کا معاملہ جادوگر کے معاملے سے زیادہ محبوب ہے تو اس جانور کو مار ڈال تاکہ لوگ راستہ سے گزر سکیں۔ یہ دعا کرکے وہ پتھر جانور کے مارا وہ مر گیا لوگوں کا راستہ کھل گیا لڑکے نے راہب کو سارا واقعہ کہہ سنایا راہب نے کہا آج تم کو مجھ پر فضیلت حاصل ہو گئی ہے اور میرے خیال میں اب تو ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں تجھ کو مصائب میں مبتلا ہونا پڑے گا تو جب تجھے مصیبتوں میں گرفتار ہونا پڑے تو میرے متعلق کسی کو نہ بتانا۔ یہ لڑکا مادر زاد اندھوں، برص زدہ انسانوں اور دیگر تمام بیماریوں میں مبتلا انسانوں کا علاج کرتا (اس کے روحانی علاج سے وہ تندرست ہو جاتے) چنانچہ بادشاہ کا ایک مصاحب جو اندھا ہو گیا تھا وہ لڑکے کی خدمت میں بہت سے تحائف لے کر پہنچا اور کہنے لگا کہ اگر آپ مجھے شفا دے دیں تو یہ تمام چیزیں تمہیں دے دی جائیں گی۔

لڑکے نے کہا کہ میں کسی کو شفا نہیں دے سکتا اگر تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا وہ تجھے شفا دے دیگا۔ چنانچہ وہ ایمان لے آیا اللہ تعالیٰ نے اسے شفا بخش دی بادشاہ کا مصاحب حسب معمول بادشاہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا بادشاہ نے کہا تجھے بینائی کیسے نصیب ہوئی اس نے کہا کہ میرے پروردگار نے مجھے عطا کی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ میرے سوا تیرا اور کوئی رب بھی ہے اس نے کہا کہ میرا اور تیرا رب اللہ تعالیٰ ہے بادشاہ نے اس کو گرفتار کروایا اور اس پر اتنا تشدد کیا کہ اس نے لڑکے کا پتہ بتا دیا چنانچہ لڑکے کو بادشاہ

کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ اب تیرے جادو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ تو جادو سے مادرزاد اندھوں اور برص والوں کو تندرست کر دیتا ہے اور تو بہت ماہر ہو گیا ہے۔ لڑکے نے کہا کہ شفا میں نہیں دیتا شفا دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے لڑکے کو اس نے گرفتار کروایا اور پھر اس پر اتنا تشدد کیا کہ لڑکے نے راہب کا پتہ بتا دیا۔

چنانچہ راہب کو پکڑ کر لایا گیا اور اسے کہا گیا کہ تو اپنا دین چھوڑ دے اس نے انکار کر دیا بادشاہ نے آرا منگوا لیا اس سے راہب کے دو ٹکڑے ہو گئے اسکے بعد بادشاہ کے مصاحب کو لایا گیا اسے بھی کہا گیا کہ تو اپنے دین سے باز آ جا اس نے انکار کیا اس کے سر کے درمیان آرا رکھ کر اس کے بھی دو ٹکڑے کروا دیے۔ اس کے بعد لڑکے کو بھی لایا گیا اور اسے کہا گیا کہ اپنا دین چھوڑ دے تو اس نے انکار کیا بادشاہ نے اسے ایک خاص جماعت کے حوالے کر کے حکم دیا فلاں پہاڑ کی چوٹی پر لیجاؤ اگر اپنا دین چھوڑ دے تو بہتر ورنہ اسے نیچے دھکا دے دو۔ وہ اسے حکم کے مطابق پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے لڑکے نے دعا کی اے اللہ تعالیٰ جس طرح تو چاہے مجھے ان کی طرف سے کافی ہو جا۔ چنانچہ پہاڑ پر زلزلہ آ گیا اور وہ سب نیچے گر گئے اور لڑکا بادشاہ کے پاس پہنچا بادشاہ نے کہا کہ تیرے ساتھی کہاں ہیں لڑکے نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ان سے بچا لیا ہے پھر بادشاہ نے اور لوگوں کو حوالے کر کے کہا اسکو ایک چھوٹی کشتی میں سوار کرو جب سمندر کے درمیان میں پہنچو اگر اپنے دین سے باز نہ آئے تو اسے سمندر میں پھینک دینا جب وہ اسے سمندر میں لے گئے تو لڑکے نے دعا کی اے اللہ تعالیٰ! جس طرح تو چاہے مجھے ان کی طرف سے کافی ہو جا دعا مانگتے ہی کشتی الٹ گئی وہ سب ڈوب گئے اور لڑکا بادشاہ کے پاس پہنچا بادشاہ نے پوچھا تیرے ساتھی کہاں ہیں لڑکے نے جواب دیا مجھے اللہ تعالیٰ نے ان سے بچا لیا ہے۔ اور لڑکے نے کہا کہ تو مجھے اس وقت تک قتل نہیں کر سکتا جب تک تو میری بات نہیں مان لیتا بادشاہ نے کہا کہ وہ کون سی بات ہے لڑکے نے کہا کہ تمام لوگوں کو ایک میدان میں جمع کر لو اور مجھے سولی دینے کیلئے کسی لکڑی پر لٹکا دو پھر میرے ترکش سے ایک تیر لے کر میرے کمان کے چلہ پر

رکھ پھر بسم اللہ رب الغلام کہہ (اللہ کے نام سے جو لڑکے کا رب ہے) مجھے تیر مار اس طرح تو مجھے قتل کر سکے گا۔

بادشاہ نے سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کیا لڑکے کو سولی پر لٹکایا گیا اسی کے ترکش سے تیر لے کر کمان کے چلہ پر رکھ کر بسم اللہ رب الغلام کہہ کر تیر مارا تیر اس کی کنپٹی پر لگا لڑکے نے وہیں اپنا ہاتھ رکھا اور مر گیا اور لوگوں نے کہا کہ ہم لڑکے کے رب پر ایمان لائے۔ بادشاہ کو اس بات سے آگاہ کیا گیا کہ جس بات کا تجھے خطرہ تھا وہی بات ہو گئی لوگ ایمان لا چکے ہیں بادشاہ نے سڑکوں میں خندقیں کھدوائیں اور ان میں آگ بھرنے کا حکم دیا چنانچہ اس کے حکم کے مطابق عمل کیا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جو شخص اپنے دین سے باز نہ آئے اس کو ان میں ڈال دو چنانچہ ان کو آگ میں جھونک دیا گیا آخر ایک عورت آئی جس کے پاس اس کا بچہ بھی تھا اس نے آگ میں داخل ہونے سے عذر پیش کیا لڑکا بول اٹھا ماں صبر کرو تم حق پر ہو۔ [1]

کھائیوں والا واقعہ جو محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے درمیان زمانہ فترۃ میں واقع ہوا اور یہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے ویسے ایسے واقعات دنیا میں بہت زیادہ ہوئے ہیں۔

بروج برج کی جمع ہے بڑے محل یا قلعے کو کہا جاتا ہے سورت میں بروج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں۔ اور بعض دوسرے آئمہ تفسیر نے بروج سے مراد وہ محلات لیے ہیں جو آسمان میں پہرے داروں اور نگران فرشتوں کیلئے مقرر ہیں۔ اور بعض متاخرین نے بروج سے مراد وہ بارہ برج لیے ہیں جو فلاسفر کی اصطلاح ہے کہ کل آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو برج کہا جاتا ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قتل اصحب الا خدود ظاہر بات یہ ہے کہ یہی جوابِ قسم ہے اور اس میں لام مقدر ہے۔ فراء وغیرہ کا یہی قول ہے اور ایک قول ہے کہ

---

[1] صحیح مسلم جلد دوم صفحہ ٤١٥

یہاں لقد مقدر ہے جسے حذف کر دیا گیا اس لحاظ سے یہ جملہ خبریہ ہوگا۔لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعائیہ جملہ ہے کیونکہ قتل کا معنی لعن ہے۔واحدی نے کہا کہ یہ دعائیہ جملہ جوابِ قسم نہیں ہوسکتا۔اور ایک قول ہے کہ جوابِ قسم ان الذین فتنو ا المو منین ہے اور ایک قول یہ ہے ان بطش ربك لشدید جوابِ قسم ہے۔اور ایک قول ہے کہ جوابِ قسم مقدر ہے جس پر قتل الاصحب الا خدود دلالت کرتا ہے گویا کہ یوں فرمایا اقسم بھذا الا شیاء ان کفار قریش ملعونون کما لعن اصحب الاخدود۔ اور ایک قول ہے کہ جواب قسم لتبعثین مقدر ہے۔ ❶

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے شاہد اور مشہود کی قسم اٹھائی یہ دونوں مطلق ہیں متعین نہیں اس میں عام ہے معلوم کرنے والا معلوم کیا گیا دیکھنے والا اور دیکھا گیا عالم اور معلوم اس کے علاوہ جو اقوال ذکر کیے گئے ہیں وہ تمثیلی طور پر ذکر کئے گئے ہیں اگر کوئی کہے ان تینوں مقسم بہ چیزوں کے درمیان ربط کیا ہے تو جوابا کہا جائیگا کہ الحمد للہ ان میں انتہائی ربط ہے ان کے ساتھ قسم اٹھانا دنیا وآخرت میں پائی جانے والی ہر چیز کو شامل ہے ان میں سے ہر ایک مستقل نشانی ہے جو اس کی ربوبیت اور الوہیت پر دلالت کرنے والی ہے۔اللہ تعالیٰ نے عالم بالا کی قسم اٹھائی اور اس سے مراد آسمان اور جو اسمیں برج ہیں یہ بہت وسیع اور بڑی جگہیں ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے تمام دنوں سے بڑے اور عظیم الشان مرتبہ والے دن کی قسم اٹھائی جو دن اس کی بادشاہت امر ونہی، ثواب اور سزا کا مظہر ہے اور اس کے دوستوں اور دشمنوں کے جمع ہونے کا وقت ہے اور ان کے درمیان اپنے علم اور عدل کے مطابق فیصلہ کرنے کا دن ہے پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان سب سے عام چیز کی قسم اٹھائی اور وہ ہے شاہد اور مشہود اور اس قسم سے مناسب ہے کھائیوں والوں کا ذکر جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو عذاب میں مبتلا کیا اور وہ اس منظر کو خود دیکھ رہے تھے اور فرشتے اس کی ان پر شہادت دیں گے اشیاء اور ان کے اعضاء بھی ان کے خلاف شہادت دینگے اور خود اللہ تعالیٰ

---

❶ فتح القدیر للشو کانی

بھی ان پر اطلاع پانے والا اور نگران ہے اور مشہود وہ ہے جس پر اطلاع پائی گئی جس کی خبر دی گئی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مخلوق کی دو قسمیں بنائیں شاہد اور مشہود جیسے سورۃ الحاقۃ میں فلا اقسم بما تبصرون ومالا تبصرون میں مرئی اور غیر مرئی کی دو قسمیں بنائیں جیسے زمین اور آسمان رات اور دن مذکر اور مؤنث کی اقسام بنائیں یہ تنویع واختلاف اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں سے ہے ایسے ہی اس نے شاہد اور مشہود کی قسمیں بنائیں۔

اس قسم کے ضمن میں ملائکہ انبیاء اور رسل کی قسم اٹھانا بھی آتا ہے کیونکہ وہ بھی بندوں پر شہادت دیں گے تو اسمیں مقسم بہ اور مقسم علیہ متحد ہو جائیں گے جیسے الیوم الموعود کی قسم اٹھائی یہ مقسم بہ بھی ہے اور مقسم علیہ بھی نیز یوم قیامت مشہود ہے جیسے سورۃ ھود آیت نمبر ۱۰۳ میں ہے ذلك يوم مجموع له الناس وذلك يوم مشهود اس دن اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور انسان اور جن اور جنگل کے جانوروں کا حاضر ہونا اس کی قدرت کی نشانیوں سے ہے نیز اللہ تعالیٰ کی کلام بھی مشہود ہے جیسے سورۃ الاسراء آیت نمبر 87 میں فرمایا وقرآن الفجر ان قرآن الفجر كان مشهودا۔ دن اور رات کے فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں اور شاہد اور مشہود اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے بہت بڑی نشانیاں ہیں شاہد اور مشہود کا لفظ جس جس پر بولا جاتا ہے بعض انواع یا ذاتوں کے ساتھ اسے خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں بطور مثال ذکر کی جاسکتی ہے۔ [1]

زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان قسموں کا جواب محذوف ہے جس پر قتل اصحاب الاخدود دلالت کرتا ہے گویا فرمایا گیا اقسم بهذا الاشياء انهم ملعونون یعنی کفار قریش کمالعن اصحاب الاخدود اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت میں مومنوں کو ثابت قدم رکھنے اور اہلِ مکہ کی تکلیفوں پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ ان سے پہلے بھی اہل ایمان کو عذابوں میں مبتلا کیا گیا اور قسما قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئی لیکن مومنوں نے صبر کیا اور ثابت قدمی دکھائی کہ مسلمان پہلے مومن لوگوں کا ذکر سنکر مانوس ہوں

---

[1] التبیان فی اقسام القرآن

اور اپنی قوم سے جو تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اس پر صبر کریں اور انہیں علم ہو کہ یہ کافر اللہ عز و جل کے ہاں ان لوگوں کی طرح عذاب میں مبتلا ہونگے جنہوں مومنوں کو آگ میں جلایا اور ملعون اس بات کے حقدار ہیں کہ ان کے بارے میں کہا جائے قتلت قریش جیسے کھائیوں والوں کے متعلق قتل اصحب الا خدود کہا گیا اور قتل ان پر بددعا کی گئی جیسے قتل الا نسان ما اکفرہ میں بددعا ہے۔❶

(۳۲) سورت الطارق

﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ○ النَّجْمُ الثَّاقِبُ○ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ○﴾.

''قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی اور تم کیا جانو کہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا تارا۔ کوئی جان ایسی نہیں جس کے اوپر نگہبان نہ ہو۔''

امام زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں النجم الثاقب ثاقب کا معنی روشنی کرنے والا گویا کہ وہ اپنی روشنی کے ذریعے تاریکی میں سوراخ کر کے نفوذ حاصل کرتا ہے جیسے روشن ستارے کو دُرّیٌ کہا جاتا ہے کہ وہ اندھیرے کو دفع کرتا ہے اس کی وصف طارق لانا اس لئے ہے کہ یہ رات کو ظاہر ہوتا ہے جیسے رات کے آنے والے کو طارق کہتے ہیں یا اس لئے کہ وہ جن کو دفع کرتا ہے طارق سے مراد جنس نجوم ہے یا جنس شہب ہے جن کے ساتھ سنگباری کی جاتی ہے۔

جواب قسم ان کل نفس لما علیها حافظ ہے حافظ سے مراد اللہ عز و جل ہے جو ہر جان کے حافظ اور نگران ہیں جیسے فرمایا کہ وکا ن اللہ علی کل شئی رقیبا اور وکان اللہ علی کل شئی مقیتا اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عملوں کی حفاظت کرنے والا فرشتہ

❶ الکشاف

ہے جو ہر قسم کی نیکی اور برائی کو شمار کرتا ہے۔ ❶

النجم الثاقب : ثاقب اس لئے کہ وہ اپنی کثیر شعاع کے ساتھ اندھیرے میں سوراخ کرتا ہے اور یہ وصف ستارے کی جنس پر منطبق ہوتا ہے اس سے کوئی خاص ستارہ مراد نہیں بلکہ مطلق رکھنا بہتر ہے معنی پھر یوں ہوا کہ آسمان کی قسم اور اس کے ستاروں کی جو ظلمت کو پھاڑ دیتے ہیں اور اشیاء کو چھپا دینے والی اس ظلمت میں سے نفوذ کرتے ہیں۔ ❷

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں لما علیھا حافظ کی تفسیر ابن عباس نے الا علیھا حافظ کی ہے یعنی لمّا اِلاّ کے معنی میں ہے لیکن ابوعبیدہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا کہ لمّا کا اِلاّ کے معنی میں ہونا کلامِ عرب میں اس کا کوئی شاہد ہم نے نہیں سنا ابن عامر وحمزہ لمّا تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں اور دیگر لما۔ ❸

کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں کہ ایک ہستی کی نگہبانی کے بغیر اپنی جگہ قائم اور باقی رہ سکتی ہو۔نگہبان سے مراد خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چھوٹی اور بڑی چیز کی نگہبانی کر رہی ہے جس کو وجود میں لانے سے ہر شئے وجود میں آتی ہے جس کے باقی رکھنے سے ہر شئے باقی ہے جس کے سنبھالنے سے ہر شے اپنی جگہ سنبھلی ہوئی ہے اور جس نے ہر چیز کو اسکی ضروریات بہم میں پہنچانے اور اسے ایک مدت مقررہ تک آفات سے بچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔اس بات پر آسمان کی اور رات کی تاریکی میں نمودار ہونے والے سیاروں کی قسم کھائی گئی ہے یہ قسم اس معنی میں ہے کہ رات کو آسمان میں یہ بے حدوحساب تارے اور سیارے جو چمکتے نظر آتے ہیں۔ان میں ہر ایک کا وجود اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی ہے جس نے اسے بنایا، روشن کیا ہے، فضا میں معلق رکھ چھوڑا ہے اور اس طرح اس کی حفاظت اور نگہبانی کر رہی ہے کہ نہ وہ اپنے مقام سے گرتا ہے اور

---

❶ الکشاف

❷ ظلال القرآن

❸ فتح الباری

نہ بے شمار تاروں کی گردش کے دوران میں کسی سے ٹکراتا ہے اور نہ کوئی دوسرا تارا اس سے ٹکراتا ہے۔ ❶

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں علیها حافظ سے مراد ایک قول ہے کہ حفاظت کرنے والے فرشتے مراد ہیں جو انسان کے عمل قول اور فعل کو محفوظ کر لیتے ہیں اور جو خیر اور شر کرتے ہیں اسے شمار کرتے ہیں اور ایک قول ہے کہ اس سے مراد اللہ عزوجل ہیں اور ایک قول ہے کہ حافظ سے مراد عقل ہے جو مصالح کی طرف انسان کی رہنمائی کرتی ہے اور مفاسد سے روکتی ہے۔ حافظ سے ملائکہ حفاظت کرنے والے فرشتے مراد لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ قرآن میں کئی مقامات پر اس انداز کا ذکر ہے مثلاً وان علیکم لحافظین اور سورة الانعام میں ویرسل علیکم حفظة اور سورة الرعد میں له معقبت من بین یدیه ومن خلفه یحفظونه من امر الله مذکور ہے حفاظت کرنے والا حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ ہے جیسے خود اللہ تعالی نے فرمایا فا الله خیر حافظا اور فرشتوں کی حفاظت کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت ہے کیونکہ وہ بھی یہ کام اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔ ❷

وما ادراك کا سوال اس شہادت یعنی قسم کی عظمت واہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی اس شہادت کو معمولی شہادت نہ گمان کرے یہ بہت بڑی شہادت ہے بشرطیکہ کہ غور کرنے والے اس پر غور کریں اور سمجھیں۔

النجم الثاقب سے کوئی خاص ستارہ مراد نہیں بلکہ جنس مراد ہے یعنی دمکتے ستارے کی قسم کھائی ہے البتہ ثاقب صفت آنے سے معلوم ہوا کہ اس سے مراد وہی ستارے ہیں جن کی روشنی از خود ہم تک پہنچتی ہے اور جن کی جستجو کے لیے ہمیں ترقی یافتہ دور میں دوربینوں کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ہر دیکھنے والا ان کو دیکھ اور ان سے سبق حاصل کر سکتا ہے جو قرآنِ مجید یہاں دینا چاہتا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ ستارے شہادت دے رہے ہیں کہ

---

❶ تفہیم القرآن

❷ فتح القدیر للشوکانی

اللہ تعالیٰ نے ہر جان پر محافظ مقرر کیے ہیں انسان سوچے کہ جس اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی اتنی ان گنت آنکھیں رات بھر جاگتی اور ٹکٹکی لگائے زمیں والوں کو گھورتی رہتی ہیں کس کی مجال ہے کہ اس سے بچ کر نکل سکے۔ سائنس کی ایجاد کردہ بڑی سے بڑی دوربینوں کے اندر بھی وہ طاقت نہیں جو آسمان کے معمولی سے معمولی ستارے کے اندر ہے جن کی روشنی تہہ بہ تہہ فضاؤں کو چیرتی ہوئی زمین تک پہنچتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی یہ شان ہر رات ہمیں دکھا رہا ہے اس کے متعلق یہ تصور کہ اس کی نگاہوں سے کوئی چیز اوجھل رہ سکتی ہے صرف اس شخص کے اندر پیدا ہو سکتا ہے جو عقل سے بالکل عاری ہو۔ قدرت کا یہ انتظام اس بات پر شاہد ہے کہ دنیا بے راعی کا گلہ نہیں بلکہ اس کے چپہ چپہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نگہبان بٹھا رکھے ہیں جو دن رات ہر چیز کی نگرانی کر رہے ہیں اور اس کے اختیار سے کوئی اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا جن ہوں یا انسان سب کی نگرانی ہو رہی ہے وہ چپ چاپ پکڑ سکتا ہے اور سزا دے سکتا ہے کوئی اس کے قابو سے باہر نہیں ہے۔ ❶

(۳۳) سورت الطارق

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ٥ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ٥ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ٥ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ٥ ﴾ (آیت ۱۱ تا ۱۴)

"بارش والے آسمان کی قسم اور پھٹنے والی زمین کی بیشک یہ قرآن دوٹوک فیصلہ کرنے والا کلام ہے یہ ہنسی اور بے فائدہ بات نہیں"

موت کے بعد دوسری زندگی ہمیشہ سے مشرکوں کے نزدیک متنازعہ فیہ رہی۔ مشرکینِ مکہ اسکا عقیدہ نہ رکھتے تھے بعض اس عقیدہ کی ہنسی اڑاتے تھے کہ ہڈیوں کے چورہ

❶ تدبر القرآن

ہو جانے کے بعد ان کو کون زندہ کریگا۔اس کے کئی جواب دیے گئے ایک جواب یہ کہ جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا وہی دوبارہ زندہ کرے گا دوسری بار کا پیدا کرنا پہلی بار سے مشکل تر نہیں اور ایک جواب یہاں قسم کی صورت میں دیا گیا کہ کائنات ارضی وسماوی کی قسم کھائی جا رہی ہے انہیں بطورِ گواہ پیش کیا جا رہا ہے کہ یہ ایک فیصلہ کن اور حتمی بات ہے جس کے خلاف ہونے کا کوئی امکان نہیں ایسا ہی ہوگا اور ضرور ہوگا آسمان وزمین کی شہادت یہی ہے قسم ہے آسمان کی جو بارش والا ہے اور قسم ہے زمین کی جو نباتات والی ہے کہ یہ ایک فیصلہ کن قول ہے اور ہنسی مذاق نہیں۔

آسمان وزمین دونوں نباتات کی حیات کا ذریعہ ہیں لہذا بعث بعد الموت پر اللہ عزوجل کا ان کی قسم کھانا بہت مناسب ہوا۔اوپر سے (آسمان سے) پھوٹنے والا پانی پشت اور سینے سے نکلنے والے نطفے سے مشابہہ ہے اس نطفے سے ہی وہ جنین بنتا ہے جو مناسب وقت پر رحم سے باہر آجاتا ہے بارش اور نطفے کی حرکت اور ان کا باعثِ حیات ہونا آپس میں بہت مشابہت رکھتا ہے یہی مشابہت بادل سے پھوٹنے والے پانی اور زمین سے نکلنے والی نباتات کے مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کے ساتھ بڑی مشابہت ہے۔

والسماء ذات الرجع: آسمان کے لئے ذات الرجع کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں رجع کے لغوی معنی تو پلٹنے کے ہیں یہ لفظ بارش کی لیے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بس ایک ہی دفعہ برس کر نہیں رہ جاتی بلکہ بار بار اپنے موسم میں کبھی خلاف موسم پلٹ پلٹ کر آتی ہے اور وقتاً فوقتاً برستی رہتی ہے ایک اور وجہ بارش کو رجع رکھنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ زمین کے سمندروں سے پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے اور پھر پلٹ کر زمین پر ہی برستا ہے۔

وما ھو بالھزل: یعنی جس طرح آسمان سے بارشوں کا برسنا اور زمیں کا شق ہو کر نباتات اپنے اندر سے اگلنا کوئی مذاق نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے اسی طرح قرآن جس چیز کی خبر دے رہا ہے کہ انسان کو پھر اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے یہ بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ ایک دوٹوک بات ہے ایک سنجیدہ حقیقت ہے ایک اٹل قول حق ہے

جسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

والسماء ذات الرجع ○ والارض ذات الصدع ان سے پہلی آیات میں حیات بعد الموت اور روزِ جزا پر انسان کی خلقت سے شہادت پیش کی۔ اب اس دعوٰی پر ایک آفاقی دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے جب بارش ہوتی ہے تو زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں اور وہ پانی جذب کر کے پھول جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے لہلہا اٹھتی ہے اور اس کا مشاہدہ انسان بار ہا کرتے ہیں ایسے ہی اللہ تعالی مرنے کے بعد لوگوں کو از سرنو زندہ کریگا۔

زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بارش کا نام رجع رکھا گیا ہے جیسے اسکا نام اوب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کا خیال تھا کہ بادل سمندروں کا پانی اٹھاتا ہے پھر زمین کی طرف اسے لوٹا دیتا ہے یا عرب بطور تفاؤل بارش کو رجع اور اوب کہتے تھے تاکہ یہ بار بار آئے اور ایک قول ہے کہ بارش کو رجع اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے وقتاً فوقتاً لوٹاتے رہتے ہیں۔ انه کی ضمیر کا مرجع بعث بعد الموت ہے اور یہی راجح ہے کیونکہ مذکور کی طرف ضمیر لوٹانا بہتر ہے امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں والاول اولی لان عود الضمیر الی المذکور السابق اولی۔ [1] یا مرجع قرآن ہے یعنی قرآن حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے جیسے اسے فرقان کہا گیا ہے۔ قرآن سارے کا سارا سنجیدہ ہے اس میں کوئی فضول چیز نہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کا یہ وصف بیان کیا۔ اس کا یہ حق ہے کہ سینوں میں اس کی ہیبت ہو۔ دل میں اس کی تعظیم ہو۔ اس کے پڑھنے اور سننے والا مذاق یا ہنسی کو مت اختیار کرے اور اپنے ذہن کو ادھر متوجہ کرے کہ جبار السموات اس سے مخاطب ہے اور اسے حکم دے رہے ہیں اور اسے منع کر رہے ہیں اس سے وعدہ ہو رہا ہے۔ اسے دھمکی دی جا رہی ہے۔ اگر اسے خشیت اور خوف بہت زیادہ طاری نہ بھی ہو تو کم از کم اسے چاہیے کہ وہ سنجیدہ ہو۔ ہنسی مذاق نہ چاہیے۔ اللہ تعالی نے اپنے فرمان تضحکون ولا تبکون و انتم سمدون اور اپنے

[1] تفسیر الرازی

فرمان والغو فیہ میں مشرکین کی برائی بیان کی ہے۔

سورت الفجر (۳۴)

﴿وَالْفَجْرِ o وَلَيَالٍ عَشْرٍ o وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ o وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ o هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ o﴾ (آیت ۱ تا ۵)

''قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب وہ چلنے لگے کیا اس میں عقل مند کے واسطے قسم کافی ہے؟''۔

امام زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں یہاں مقسم علیہ محذوف ہے اور وہ لیعذبن ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان الم تر سے لے کر فصب علیھم ربك سوط عذاب دلالت کرتا ہے۔[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک قول یہ ہے کہ جوابِ قسم محذوف ہے سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور وہ لیجازین کل احد بما عمل ہے یا لیعذبن ہے اولی یہی بات ہے کہ جوابِ قسم یہاں محذوف ہے اور ان ربك لبالمرصاد اپنے ماقبل کی تعلیل ہے۔[2]

اہل مکہ جزا سزا کے ماننے سے انکار کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ انہیں اس کا قائل کرنے کیلئے مسلسل تبلیغ اور تلقین فرما رہے تھے۔ اس پر فجر اور دس راتوں اور جفت اور طاق اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ اس بات کو باور کرنے کیلئے کیا یہ چار چیزیں کافی نہیں ہیں کہ کسی صاحب کے سامنے اور کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت ہو۔ سب سے پہلے فرمایا فجر کی قسم فجر پو پھٹنے کو کہتے ہیں یعنی وہ وقت جب رات کی تاریکی میں سے دن کی ابتدائی روشنی مشرق کی طرف ایک سفید دھاری کی شکل

---

[1] الکشاف [2] فتح القدیر

میں نمودار ہوتی ہے۔

پھر فرمایا دس راتوں کی قسم اس سے مراد مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں پہلی دس راتیں وہ جن میں چاند ایک باریک ناخن کی شکل سے شروع ہو کر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کے آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتیں وہ ہیں جن میں رات کا بڑا حصہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتیں وہ جن میں چاند چھوٹے سے چھوٹا اور رات کا بیشتر حصہ تاریک سے تاریک تر ہوتا ہے یہاں تک کہ مہینے کے آخر میں پوری رات تاریک ہو جاتی ہے۔ اسکے بعد فرمایا جفت اور طاق کی قسم اس سے مراد کائنات کی تمام چیزیں ہو سکتی ہیں کیونکہ ہر چیز یا تو جوڑا جوڑا ہے یا تنہا لیکن چونکہ یہاں بات دن اور رات کی ہو رہی ہے اس لئے سلسلہ مضمون کی مناسبت سے جفت اور طاق کا مطلب تغیر ایام ہے کہ مہینے کی تاریخیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوتی جاتی ہیں اور ہر تغیر ایک نئی کیفیت لے کر آتا ہے۔ آخر میں فرمایا رات کی قسم جب کہ وہ رخصت ہو رہی ہو یعنی وہ تاریکی جو سورج غروب ہونے کے بعد سے دنیا پر چھائی تھی خاتمے پر آ لگی ہو۔ اور پو پھٹنے والی ہو۔

ان چار چیزوں کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد ﷺ جزا سزا کی جو خبر دے رہے ہیں وہ برحق ہے یہ سب چیزیں اس حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں کہ ایک ربِ قدیر اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے اور وہ جو کام بھی کر رہا ہے بے تکا، بے مقصد، بے حکمت، بے مصلحت نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے ہر کام میں صریحاً ایک حکیمانہ منصوبہ کارفرما ہے اس کی دنیا میں یہ کبھی نہ دیکھو گے کہ ابھی رات ہے اور یکا یک سورج نصف النھار پر آ کھڑا ہو یا ایک روز چاند ہلال کی شکل میں طلوع ہو اور دوسرے روز چودھویں رات کا پورا چاند نمودار ہو جائے۔ یا رات آئی ہو تو کسی طرح اس کے ختم ہونے کی نوبت ہی نہ آئے اور وہ مستقل طور پر ٹھہر کر رہ جائے۔ یا تغیر ایام کا سرے سے کوئی باقاعدہ سلسلہ ہی نہ ہو کہ آدمی تاریخوں کا کوئی حساب رکھ سکے اور یہ جان سکے کہ یہ کونسا مہینہ ہے اس کی کونسی تاریخ ہے کس تاریخ سے

اس کا کونسا کام شروع اور کب ختم ہوتا ہے گرمی کے موسم کی تاریخیں کونسی ہیں یا برسات اور سردی کے موسم کی تاریخیں کونسی۔

کائنات کی دوسری بے شمار چیزوں کو چھوڑ کر اگر آدمی شب وروز کی اس باقاعدگی ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھے اور کچھ دماغ کو سوچنے کی تکلیف بھی دے تو اسے اس امر کی شہادت ملے گی کہ یہ زبردست نظم کسی قادر مطلق کا قائم کیا ہے اور اس کے قیام سے اس کی مخلوق کی بے شمار مصلحتیں وابستہ ہیں جسے اس نے اس زمین پر پیدا کیا۔ اب اگر ایسے حکیم و دانا اور قادر و توانا خالق کی دنیا میں رہنے والا کوئی شخص آخرت کی جزا سزا کا اگر انکار کرتا ہے تو وہ لامحالہ حماقت میں مبتلا ہے۔ جزا سزا پر شب وروز سے استدلال کرنے کے بعد اس کے یقینی حقیقت ہونے پر انسانی تاریخ سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرز عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانون فطرت پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ایک حکیم اس کو چلا رہا ہے اور اس کی خدائی میں صرف ایک ہی قانون کار فرما نہیں ہے جسے تم قانون فطرت سمجھتے ہو بلکہ ایک قانون اخلاق بھی کارفرما ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزا اور سزا ہے اس قانون کی کارفرمائی کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں جو عقل رکھنے والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کیا ہے۔

یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر اور آخرت کی جزا سزا سے بے خوف ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار فاسد و مفسد بن کر رہیں اور جو قوم بھی اس راستے پر چلی اس پر کائنات کے رب نے آخر کار عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ ❶

---

❶ تفہیم القرآن

(۳۵) سورت البلد

﴿لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ٥ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ٥ وَ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ٥
لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ كَبَدٍ ٥﴾ (آیت ۱ تا ۴)

''نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اُس شہر کی اور حال یہ کہ (اے نبی) اس شہر میں تم کو حلال کر لیا گیا ہے اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس کی اولاد کی درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔''

لا کے متعلق امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے ساتھ بعث بعد الموت کے منکرین کی تردید کی ہے پھر اقسم کے ساتھ ابتداء کی ہے اور معنی ہے کہ معاملہ ویسے تو نہیں جیسے تم سمجھتے ہو۔ ❶

لا کے ساتھ کفارِ مکہ کے عقیدہ کی تردید کی ہے وہ یہ تھا کہ ہم جس طرزِ زندگی پر چل رہے ہیں اس میں کوئی خرابی نہیں ہے دنیا کی زندگی یہی کچھ ہے کہ کھاؤ، پیو، مزے اڑاؤ اور جب وقت آئے تو مر جاؤ محمد ﷺ خواہ مخواہ اس طرزِ زندگی کو غلط ٹھہرا رہا ہے اور ہمیں ڈرا رہا ہے۔ اس پر کبھی ہم سے باز پرس ہوگی اور ہمیں جزا سزا سے سابقہ پیش آئے گا اور ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

سورۃ البلد میں سب سے پہلے شہر مکہ معظمہ اور اس میں رسول اللہ ﷺ پر گزرنیوالے مصائب اور آدم علیہ السلام اور انکی ساری اولاد کی حالت کو اس حقیقت پر گواہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے جس میں وہ مزے اڑانے

---

❶ فتح البیان فی مقاصد القرآن جلد ۷ صفحہ ٤٥٧

کے لیے پیدا کیا گیا ہو بلکہ یہاں اسکی پیدائش ہی مشقت کی حالت میں ہوتی ہے اس کارگاہِ دنیا میں انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش اور محنت و مشقت پر ہے۔جیسے سورہ النجم آیت نمبر ۳۹ میں فرمایا ''وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی'' کہ انسان کے لیے کچھ نہیں۔مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے ہر شخص جو کچھ بھی پائے گا وہ اپنے عمل کا پھل پائے گا۔

کفارِ مکہ یہ کہتے تھے کہ ہم جس طرزِ زندگی پر چل رہے ہیں اس میں کوئی خرابی نہیں ہے دنیا کی زندگی بس یہی کچھ ہے کہ کھاؤ' پیو' مزے اڑاؤ اور جب وقت آئے تو مر جاؤ۔محمد ﷺ خواہ مخواہ ہمارے اس طرزِ زندگی کو غلط ٹھہرا رہے ہیں اور ہمیں ڈرا رہے ہیں کہ ہمیں کبھی اس سے باز پرس ہوگی اور ہمیں جزا سزا سے سابقہ پڑے گا اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا نہیں بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس کی اولاد کی درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔

اہلِ مکہ اپنے شہر کا پس منظر خوب جانتے تھے کہ کس طرح ایک بے آب و گیاہ وادی میں سنسان پہاڑوں کے درمیان حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ایک بیوی اور ایک شیرخوار بچے کو یہاں لاکر بے سہارا چھوڑا کس طرح یہاں ایک گھر بنا کر ایسی حالت میں حج کی منادی کی کہ دور دور تک کوئی اس منادی کا سننے والا نہ تھا اور پھر کس طرح یہ شہر آخر کار تمام عرب کا مرکز بنا اور ایسا حرم قرار پایا کہ صدہا برس تک عرب کی سرزمین بے آئین میں اس کے سوا امن کا کوئی مقام نہ تھا اس شہر میں جنگل کے جانوروں تک کو مارنا اور اس کے درختوں تک کو کاٹنا اہل عرب کے نزدیک حرام ہے اور ہر ایک کو یہاں امن میسر ہے لیکن حال یہ ہوگیا ہے کہ اے نبی تمہیں یہاں کوئی امن نصیب نہیں تمہیں ستانا اور تمہارے قتل کی تدبیریں کرنا حلال کرلیا گیا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی کبد۔

درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا یہ وہ بات ہے جس پر قسمیں کھائی گئی ہیں انسان کے مشقت میں پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مزے کرنے اور چین کی بانسری بجانے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے یہ دنیا محنت اور مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا یہ شہر مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ تعالیٰ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا اس شہر مکہ میں محمد ﷺ کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں حتی کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے لیے امان ہے مگر ان کے لیے نہیں۔

انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کے آخری سانس تک اس بات پر گواہ ہے کہ اسے قدم قدم پر تکلیف، مشقت، محنت، خطرات اور شدائد کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جس کو تم بڑی سے بڑی قابل رشک حالت میں دیکھتے ہو وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو وہ بھی ہر وقت اس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مر جائے یا اس کا اسقاط ہو جائے۔ زچگی کے وقت اس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا پیدا ہوا تو اتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے ہی پڑے مر جاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گرا پڑتا تھا بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیرات سے اسے گزرنا پڑا کہ کوئی تغیر بھی اگر غلط سمت میں ہو جاتا تو اسکی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ یا ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اس اندیشے سے اس کو چین نصیب نہیں کہ کسی وقت اسکے خلاف کوئی سازش ہو جائے وہ اگر فاتح عالم بھی ہے تو کسی وقت بھی اس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اسکے اپنے سپاہ سالاروں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطاں اور پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کیسے اسکی حفاظت کرے غرض کوئی شخص بھی بے غل وغش چین کی نعمت سے بہرامند نہیں ہے کیونکہ انسان پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔ اسی بات کو

اللہ تعالیٰ نے سورت الانشقاق میں یوں ذکر فرمایا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴾

اے انسان تو اپنے رب کی طرف بڑی محنت اور جدو جہد کر کے جا رہا ہے اور پھر اس سے ملنے والا ہے۔

والد وما ولد سے مراد آدم علیہ السلام اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد مراد ہے جو دنیا میں پائے جاتے ہیں اور آئندہ پائے جائیں گے۔ اور اس بارے مفسرین کے دیگر اقوال بھی ہیں۔

انت حل بهذا البلد اس کے تین معنی مفسرین نے بیان کیے ہیں ایک یہ کہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں اور آپکے مقیم ہونے سے اس کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ شہر حرم ہے مگر ایک وقت آئیگا جب کچھ دیر کے لیے یہاں جنگ کرنا اور دشمنان دین کو قتل کرنا آپ کے لیے حلال ہو جائیگا۔ تیسرے یہ کہ شہر میں جنگل کے جانوروں کو مارنا اور درختوں کو کاٹنا حرام ہے اور ہر ایک کو یہاں امن میسر ہے لیکن حال یہ ہو گیا ہے کہ اے نبی ﷺ تمہیں یہاں کوئی امن نصیب نہیں تمہیں ستانا اور قتل کی تدبیریں کرنا حلال کر لیا گیا ہے۔

انسان کی مشقت کی شکلیں مختلف ہیں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والا بدقسمت ہے جو دنیا میں صرف اسی دینوی زندگی کے لئے محنت کرتا رہا ہو۔ اور پھر آخرت میں اسے دینوی مشقت سے بڑھ کر مشقت اور جدوجہد کا سامنا کرنا پڑے۔ اور سب سے بڑا خوش نصیب اور کامیاب وہ شخص ہے جس نے نیکی اور آخرت کی راہ میں محنت کی حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ سے ملا تو اس کی رحمت کے سائے میں دائمی راحت کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ محنت و مشقت کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض دفعہ جدوجہد کا کچھ عوض (اچھا یا برا) دنیا میں بھی ملتا ہے۔ نیکی کے لئے جدوجہد کرنے سے جو اطمینان قلب اور راحت جان حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں مل سکتی۔

(۳۶) سورت الشمس

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ٥ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ٥ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ٥ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ٥ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ٥ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ٥ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ٥ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ٥ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ٥﴾ (آیت ۱ تا ۱۰)

''سورج اور اس کی دھوپ کی قسم اور چاند کی جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے اور دن کی جبکہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے اور رات کی جبکہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے اور آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے قائم کیا اور زمین کی اور اس ذات کی جس نے اسے بچھایا اور نفس انسانی کی پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری الہام کی یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے تزکیہ نفس کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے دبا دیا۔

والشمس وضحها سے لے کر فالهمها فجورحا وتقوٰھا تک مقسم بہ ہے اور قد افلح من زکها وقد خاب من دسها جواب قسم یعنی مقسم علیہ ہے۔

والشمس وضحها۔ ضحی سورج کی روشنی اور اس کی حرارت دونوں پر دلالت کرتا ہے عربی زبان میں اس کا معروف معنی چاشت کے وقت کے ہیں یہاں اگرچہ ضحی کا عطف واؤ کے ذریعے ڈالا گیا ہے مگر بعد والی اشیاء کے قرینے سے ضحیٰ کا ذکر بطور وصف شمس کے لیے یعنی قسم ہے آفتاب کی جب کہ وہ وقت ضحیٰ میں ہو۔ چاشت کے وقت سورج کی روشنی زمین پر پھیل جاتی ہے اس وقت وہ انسان کے قریب نظر آتا ہے

زیادہ تپش نہ ہونے کی بنا پر انسان اس کو دیکھ بھی سکتا ہے۔

والقمر اذا تلها۔ چاند کی قسم جب وہ آفتاب کے پیچھے آئے اس فقرہ میں چاند کے کمال نور کی طرف اشارہ ہے۔ جن راتوں میں چاند سورج کے غروب ہوتے ہی طلوع ہو جاتا ہے وہی راتیں اس کے کمال عروج کی ہوتی ہیں اور یہ مہینہ کا وسط ہوتا ہے جب چاند تقریباً مکمل ہوتا ہے۔

والنهار اذا جلها۔ ظاہر یہ ہے کہ ھا ضمیر آفتاب کی طرف راجع ہے قسم ہے آفتاب کی جب دن اس کو روشن کر دے یہ اسناد مجازی ہے مطلب یہ ہے کہ جب دن نکل آنے کی وجہ سے آفتاب روشن نظر آنے لگے۔

والليل اذا يغشها۔ رات کی آمد پر سورج چھپ جاتا ہے اور اس کی روشنی رات بھر غائب رہتی ہے اس کیفیت کو یوں بیان فرمایا کہ رات کی قسم جبکہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے۔

والسماء وما بنها ۔ اور آسمان کی قسم اور اس ذات کی جس نے اسے قائم کیا یعنی چھت کی طرح اسے زمین پر اٹھا کھڑا کیا۔ اس آیت اور اس کے بعد کی دو آیتوں میں ما کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی ما بنها اور ما طحها اور ما سوها ۔ اس لفظ کو بعض مفسرین مصدری معنی میں لیتے ہیں یعنی اسمان اور اس کے قائم کیے جانے کی قسم زمین اور اس کے بچھائے جانے کی قسم اور نفس اور اس کے ہموار کیے جانے کی قسم ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کو موصولہ مانیں تو اس سے مراد اللہ تعالی ہوں گے حالانکہ یہ قسمیں اللہ تعالی کی ذات کی نہیں بلکہ اس کی آیاتِ قدرت وحکمت کی ہیں اوپر والی قسموں میں سورج، چاند، دن اور رات کی قسمیں ہیں ان کے مناسب تو ما کو مصدریہ ٹھہرانا مناسب ہے۔

آسمان کے ساتھ مابنها کا اور الارض کے ساتھ ما طحها کا اور نفس کے ساتھ ما سواها کا ذکر کرنا ان کی کمال کی حالتوں کو بتلانے کے لیے ہے یعنی قسم ہے آسمان کی اس حالت میں جبکہ اس کی تخلیق وتکوین مکمل ہوگئی اور زمین کی قسم جبکہ اس کو پھیلا کر اس کی

تکوین مکمل کر دی گئی اور نفس کی قسم جب کہ اس کو ہموار کر دیا کہ نیکی اور بدی کا الہام کر کے اس کو مکمل فرمایا۔ زمخشری اور قرطبی وغیرہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ بعض مفسرین ما کو ان تینوں آیات میں من کے معنی میں لے کر اللہ تعالی کی ذات مراد لیتے ہیں کہ قسم ہے آسمان کی اور اس کو بنانے والے کی اور زمین کی اور اس کو پھیلانے والے کی اور نفس کی اور اس کو ہموار کرنے والے کی۔ ما عربی زبان میں اکثر بے جان اشیاء اور بے عقل مخلوقات کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن خود قرآن مجید میں کئی جگہ مَنْ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلا ولا انتم عابدون ما اعبد اور فانکحوا ما طاب لکم من النساء ۔نیز ان تینوں آیات کے بعد فالهمها فجورها وتقوها کا آنا بھی تقویت دیتا ہے کہ ما کو من کے معنی میں لیں آسمان کی اور اس کو حیرت انگیز ساخت دینے والے اللہ تعالیٰ کی قسم اس نے آسمان میں بے شمار عجائبات اور کرشمے رکھے ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے گونا گوں اسلوبوں کو ساتھ توجہ دلائی اور اپنے مختلف وعدوں پر اس کی دلیل قائم فرمائی ہے۔

والارض وما طحها۔ اور زمین کی قسم اور اس ذات کی جس نے اسے بچھایا اس اجمال کے اندر وہ ساری تفصیل مضمر ہے جو قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں زمین کے آثار و عجائبات سے متعلق ہے اور جسے اپنے مختلف دعوؤں پر دلیل کے طور پر قائم فرمایا ہے۔

ونفس وما سوها ○ فالهمها فجورها وتقوها ○ اور قسم ہے نفسِ انسان کی اور اس ذات کی جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کے بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کر دی۔ ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے اقامت راس اور اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا اس کے دیکھنے، سننے، چھونے، چکھنے اور سونگھنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر بہترین ذریعہ علم بن سکتے تھے اس کو قوتِ عقل و فکر، قوتِ استدلال و استنباط، قوتِ خیال، قوتِ حافظہ، قوتِ تمیز، قوتِ فیصلہ، قوتِ ارادی اور دوسری ایسی ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دنیا میں اس کام کے قابل ہوا جو

انسان کے کرنے کا ہے۔ اس کے علاوہ ہموار کرنے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اسے پیدائشی گنہگار اور جبلی بدمعاش بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی خلقی کجی نہ رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے یہی بات ہے جسے سورۃ الروم میں بایں الفاظ بیان کیا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اور نبی ﷺ نے اس بات کو ایک حدیث میں یوں بیان کیا کہ کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت کے سوا کسی اور چیز پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا مجوسی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی جیسے جانور کے پیٹ سے پورے کا پورا صحیح وسالم بچہ پیدا ہوتا ہے کیا تم ان میں سے کسی کا کان کٹا ہوا پاتے ہو؟

الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصور یا خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل ودماغ میں اتارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی پر اس کی برائی اور اس کی نیکی اور پرہیزگاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات ومیلانات رکھ دیے اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز برائی۔ اچھے اخلاق واعمال اور برے اخلاق واعمال یکساں نہیں فجور یعنی بدکرداری ایک قبیح چیز ہے اور تقوی یعنی برائیوں سے اجتناب ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اس کی فطرت ان سے آشنا ہے اور خالق نے برے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اسے عطا کر دی ہے۔

فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اس کی حیثیت اور نوعیت کے اعتبار سے کیا ہے۔ حیوانات کی ہر نوع کو اس کی ضروریات کے مطابق الہامی علم دیا گیا ہے جس کی بنا پر مچھلی کو آپ سے آپ تیرنا۔ پرندے کو اڑنا۔ شہد کی مکھی کو چھتا بنانا آجاتا ہے انسان کو بھی اس کی

مختلف حیثیتوں کے اعتبار سے الگ الگ علوم کے الہام دیے گئے ہیں انسانوں کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ حیوانی وجود ہے اور اس علم سے اس کو جو الہامی علم دیا گیا ہے اس کی نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ چوسنا ہے۔ یہ تعلیم فطری طور پر اگر اللہ تعالیٰ نے اسے نہ دی ہوتی تو اسے کوئی دودھ چوسنا نہ سکھا سکتا تھا۔ اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے اس لحاظ سے رب العزت نے اس کی آفرینش کے آغاز سے مسلسل اس کو الہامی رہنمائی دی ہے جس کی بدولت وہ پہ در پہ اکتشفات اور ایجادات کرتا رہتا ہے ان اکتشفات اور ایجادات کی تاریخ کا جو بھی مطالعہ کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ایجاد ہو جو انسانی فکر و کاوش کا نتیجہ ہو ورنہ ہر ایک کی ابتداء اسی طرح ہوتی ہے کہ یکا یک کسی انسان کی ذہن میں کوئی بات آ گئی ہو اور اس کی بدولت اس نے کسی چیز کا انکشاف کیا یا کوئی چیز ایجاد کر لی ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ وہ اخلاقی وجود ہے اور اس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر ہونے اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر عطا کیا یہ امتیاز و احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر و شر کے تصورات سے خالی نہیں رہا اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور برائی جزا سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔

قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا: کے مفسرین دو معانی بیان کرتے ہیں ایک یہ کہ فلاح پا گیا وہ جس کے نفس کو اللہ تعالی نے پاک کر دیا ہو اور نامراد ہوا وہ جس کے نفس کو اللہ تعالیٰ نے دبا دیا ہو یہ تفسیر قرآن کے طرزِ بیان کے خلاف ہے اور قرآن کے دوسرے بیانات جو اسی موضوع پر ہیں ان سے ٹکراتی ہے سورہ الا علی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قد افلح من تزکی" اس میں پاکیز گی اختیار کرنا بندے کا فعل قرار دیا گیا ہے نیز قرآن میں یہ حقیقت بیان کی گئی کہ اس دنیا میں انسان کا امتحان لیا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ امتحان سرے سے ہی بے معنی ہو جاتا ہے اگر امتحان لینے والا پہلے ہی ایک امیدوار کو

ابھار دے اور دوسرے کو دبا دے اور جو حدیث ابن ابی حاتم کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ فلاح پا گیا وہ نفس جس کو اللہ عزوجل نے پاک کر دیا یہ حدیث ثابت نہیں ہے کیونکہ اس کی سند عن جویبر بن سعید عن الضحاک عن ابن عباس ہے یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ جبیر متروک الحدیث ہے اور ابن عباس سے ضحاک کی ملاقات نہیں ہوئی البتہ وہ حدیث صحیح ہے جو صحیح مسلم وغیرہ میں آتی ہے کہ حضور یہ دعا مانگا کرتے تھے "اللھم اعط نفسی تقوھا وزکھا انت خیر من زکھا انت ولیھا ومولھا" اے اللہ تعالیٰ میرے نفس کو اس کا تقوٰی عطا کر اور اسے پاکیزہ کر تو ہی وہ بہتر ہستی ہے جو اسے پاکیزہ کرے تو ہی اس کا سرپرست اور مولا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ تو صرف تزکیہ اور تقوٰی کی خواہش اور طلب ہی کر سکتا ہے رہا اس کا نصیب ہو جانا تو وہ بہرحال اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق پر منحصر ہے اور یہی حال تدسیہ کا ہے کہ اللہ تعالیٰ زبردستی کسی کے نفس کو نہیں دباتا مگر بندہ جب اس پر تل جائے تو اللہ تعالیٰ اسے تزکیہ اور تقوٰی کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے کہ اپنے نفس کو جس گندگی میں دبانا چاہے دبا دے۔

دوسرا معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ زکھا اور دسھا کا فاعل وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے۔ اسکو ابھار کر تقوٰی کی بلندی پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے وہ فلاح پائے گا اور وہ شخص نامراد ہوگا جو اپنے نفس کے اندر پائی جانیوالی نیکی کے رجحانات کو ابھارنے اور نشوونما دینے کی بجائے ان کو دبا دے۔

قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا: جوابِ قسم ہے یہ ہے وہ بات جس پر ان چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئیں غور کیجئے کہ وہ چیزیں کس طرح اس پر دلالت کرتی ہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جن حقائق کو وہ انسان کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے اس کی شہادت میں وہ سامنے کی چند چیزیں بہت نمایاں پیش کرتا ہے جو ہر آدمی کو اپنی گردوپیش کی دنیا میں یا خود اپنے وجود میں نظر آتی ہیں۔ اسی قاعدے کے مطابق یہاں دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے جو ایک دوسری

سے متضاد ہیں اسی لیے ان کے آثار اور نتائج بھی یکساں نہیں بلکہ لازماً ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک طرف سورج ہے اور دوسری طرف چاند سورج کی روشنی نہایت تیز ہے اور اس میں گرمی بھی ہے اس کے مقابلہ میں چاند اپنی کوئی روشنی نہیں رکھتا سورج کی موجودگی میں وہ آسمان پر موجود بھی ہو تو بے نور رہتا ہے وہ اس وقت چمکتا ہے جب سورج غروب ہو جائے اور اس وقت بھی اس کی روشنی نہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ رات کو دن بنا دے نہ اس میں کوئی گرمی کہ وہ کام کر سکے جو سورج کی گرمی ہوتی ہے لیکن اس کے اپنے کچھ اثرات ہیں جو سورج کے اثرات سے بالکل مختلف ہیں اسی طرح ایک طرف دن ہے اور دوسری طرف رات۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں دونوں کے اثرات اور نتائج باہم اس قدر مختلف ہیں کہ کوئی ان کو یکساں نہیں کہہ سکتا حتی کے ایک بے وقوف سے بے وقوف آدمی کیلئے بھی یہ کہنا ممکن نہیں کہ رات ہو تو کیا اور دن ہو تو کیا کسی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح ایک طرف آسمان ہے جسے خالق نے بلند اٹھایا ہے دوسری طرف زمین ہے جس کے پیدا کرنے والے نے آسمان کی نیچے فرش بچھا دیا دونوں اگرچہ ایک ہی کائنات اور اس کے نظام اور اس کے مصلحتوں کی خدمت کر رہے ہیں لیکن دونوں کے کام اور آثار و نتائج میں زمین و آسمان کا فرق ہے ان آفاقی شہادتوں کو پیش کرنے کے بعد خود انسان کے اپنے نفس کو لیا گیا اور بتایا کہ ایسے اعضاء اور حواس اور ذہنی قوتوں کے متناسب امتزاج سے ہموار کر کے خالق نے اس کے اندر بھلائی اور برائی دونوں کے رجحانات اور میلانات رکھ دیے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور الہامی طور پر اسے ان دونوں کا فرق سمجھا دیا ہے کہ ایک فجور ہے اور وہ بری چیز ہے اور دوسرا التقویٰ ہے اور وہ اچھی چیز ہے اب اگر سورج اور چاند، رات اور دن زمین اور آسمان یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے اثرات و نتائج ایک دوسرے سے لازماً مختلف ہیں تو نفس کا فجور و تقوی دونوں ایک دوسری کی ضد ہونے کے باوجود یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ انسان خود اس دنیا میں بھی نیکی اور بدی کو یکساں نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا خواہ اس نے اپنے بنائے ہوئے فلسفوں کی رو سے خیر و شر کے کچھ بھی معیار بنا رکھے ہوں۔ بہر حال جس چیز کو

بھی وہ نیکی سمجھتا ہے اس کے متعلق وہ یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ قابلِ قدر ہے تعریف اور صلے اور انعام کے مستحق ہے بخلاف اس کے جس چیز کو وہ برا سمجھتا ہے اس کے بارے میں اس کی اپنی بے لاگ رائے یہ ہے کہ وہ مذمت اور سزا کی مستحق ہے لیکن اصل فیصلہ انسان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اسی خالق کے ہاتھ میں ہے جس نے انسان کا فجور اور تقویٰ اس پر الہام کیا فجور وہی ہے جو خالق کے نزدیک فجور ہے اور تقویٰ وہی ہے جو اس کے نزدیک تقویٰ ہے اور خالق کے ہاں ان دونوں کے الگ نتائج ہیں ایک نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو دبا دے وہ نامراد ہے اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔

تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا، ابھارنا، نشو ونما دینا۔ سیاق وسباق سے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اس کو ابھار کر تقویٰ کی بلندی پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائی کو نشو ونما دے وہ فلاح پا جائے گا۔ اس کے مقابلہ میں دسّھا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مصدر تدسیہ ہے جس کا معنی دبانا' چھپانے اور اغواء کرنے اور گمراہ کرنے کے ہیں سیاق وسباق سے بھی اس کا مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص نامراد ہوگا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رجحانات کو ابھارنے اور نشو ونما دینے کی بجائے ان کو دبا دے اس کو بہکا کر برائی کے رجحانات کی طرف لے جائے اور فجور کو اس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اس کے نیچے اس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈالنے سے چھپ جاتی ہے۔

ان قسموں کے ذریعہ سے تین باتیں سمجھائی گئی ہیں ایک یہ کہ جس طرح سورج اور چاند' دن اور رات' زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اپنے آثار ونتائج میں متضاد ہیں یہ دونوں نہ اپنی شکل میں یکساں ہیں اور نہ ان کے نتائج یکساں ہو سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو جسم حواس اور ذہن کی قوتیں دے کر دنیا میں بالکل بے خبر نہیں چھوڑ دیا بلکہ ایک فطری الہام کے ذریعے سے اس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا فرق بھلے اور برے کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس

اتار دیا ہے۔

تیسری یہ بات سمجھائی ہے کہ انسان کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے اندر تمیز' ارادے اور فیصلے کی قوتیں اللہ تعالی نے رکھ دی ہیں ان کو استعمال کر کے وہ اپنے نفس کے اچھے اور برے رجحانات میں سے کس کو ابھارتا اور کس کو دباتا ہے۔ اگر وہ اچھے رجحانات کو ابھارے اور برے رجحانات سے اپنے نفس کو پاک کرے تو فلاح پائے گا۔ اور اگر اس کے برعکس وہ نفس کی اچھائی کو دبائے اور برائی کو ابھارے تو نامراد ہوگا خسارہ پائے گا ناکام ہوگا۔

سورت الشمس کے شروع میں سات چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے اور ساتوں چیزوں کے ساتھ ان کی حالت کمال کے اعتبار سے کچھ اوصاف اور قیود ذکر کئے گئے ہیں ہر چیز کے بعد قید اور وصف اس کے ساتھ مربوط ہے جس سے قسم کو وسعت اور گہرائی ملی ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان فالھمھا فجورھا و تقوھا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالی ہی گناہ اور نیکی کا خیال دل میں پیدا فرماتا ہے۔ اور کئی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بندے کے گناہ اور نیکی اس کے اپنے اختیار اور ارادے سے ہے مثلاً فاستحبوا العمی علی الھدی اور اشتروا الضلالة بالھدی اس مسئلہ کے بارے میں قدریہ اور جبریہ گمراہ ہو گئے قدری تفریط کی وجہ سے گمراہ ہوئے کیونکہ انکا خیال ہے کہ بندہ اپنے اعمال کا مستقلاً خالق ہے اللہ تعالی کی قدرت کا اس میں کوئی اثر نہیں۔ اور جبریہ تفریط کی وجہ سے گمراہ ہوئے کیونکہ انکا خیال ہے کہ بندے کا بالکل عمل نہیں کہ اس پر اسکا مؤاخذہ ہو۔ اہل سنت والجماعۃ نہ افراط سے کام لیتے ہیں اور نہ تفریط سے وہ انسان کیلیے اختیاری افعال کو مانتے ہیں سب عقلاء کے نزدیک یہ چیز بدیہی ہے کہ رعشے کی حرکت اختیاری حرکت کی طرح نہیں۔ اہلِ سنت اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالی ہر چیز کا خالق ہے اللہ تعالیٰ ہی بندے کا خالق ہے اور اس کی قدرت اور ارادے کا بھی خالق ہے اور بندے کی قدرت کی تاثیر بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے انسان قدرت اور ارادے کے ساتھ اختیاری فعل کرتا ہے جس پر اسے ثواب اور سزا ملے گی

لیکن انسان میں قدرت اور ارادہ اللہ تعالیٰ پیدا فرماتے ہیں اس مسئلہ کے اشکال کو اللہ تعالی کا فرمان: وماتشائون الا ان یشاء اللہ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان قل فللہ الحجۃ البالغۃ فلو شاء لھد کم اجمعین دور کر دیتا ہے کہ بندے کی مشیت اللہ تعالی کی مشیت کے ساتھ ہے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت سے صادر ہونیوالی ہے۔ ❶

د افلح من زکھا وقد خاب من دسھا۔ جوابِ قسم ہے اور اس کی قسموں سے مناسبت یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالی نے اپنی حکمت سے سورج کی دھوپ اور چاند کی چاندنی 'دن کا اجالا اور رات کا اندھیرا' آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی کو ایک دوسرے کے مقابل پیدا کیا اور نفس انسانی میں خیر و شر کی متقابل قوتیں رکھیں اور دونوں کو سمجھنے اور ان پر چلنے کی قدرت دی اسی طرح متضاد اور مختلف اعمال پر مختلف ثمرات اور نتائج مرتب کرنا بھی اسی حکیمِ مطلق کا کام ہے خیر و شر اور ان دونوں کے مختلف آثار اور نتائج کا عالم میں پایا جانا بھی حکمت تخلیق کے اعتبار سے ایسا ہی موزون اور مناسب ہے جیسے اندھیرے اور اجالے کا وجود۔ ❷

قد افلح من زکھا اور قد خاب من دسھا دونوں جوابِ قسم ہیں لیکن لام کو حذف کر دیا کلام کے لمبا ہونے کی بنا پر اصل میں تھا لقد افلح من زکھا۔ واللہ اعلم

علامہ زمخشری ان قسموں کا جواب محذوف مانتے ہیں اور وہ یوں ہے۔ لیدمد من اللہ علی اھل مکۃ لتکذیبھم رسول اللہ ﷺ کما دمدم علی ثمود لانھم کذبوا صالحا۔ اور قد افلح من زکھا کو جوابِ قسم نہیں مانتے۔

صحیح مسلم میں ہے ❸ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔ اللھم انی اعوذبك من العجز والکسل والجبن والبخل والھرم وعذاب القبر اللھم ات نفسی تقواھا وزکھا انت ولیھا ومولاھا۔

❶ اضواء البیان

❷ تفسیر عثمانی ❸صحیح مسلم جلد ثانی صفحہ ۳۵۰

اللهم انی اعوذبك من علم لا ینفع ومن قلب لا یخشع ومن نفس لا تشبع ومن دعوة لا یستجاب لها۔

''اے اللہ میں آپ کی پناہ مین آتا ہوں کمزوری، سستی، کاہلی، بزدلی، بخل، بڑھاپے اور قبر کے عذاب سے اے اللہ میرے نفس کو تقوی نصیب فرما اور اسے پاک فرما تو ہی سب سے بہتر اسے پاک کرنے والا ہے تو ہی اس کا والی اور مولی ہے اے اللہ میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جو عاجزی نہ رکھے اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو۔''

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورت الشمس میں طاعات کی ترغیب اور معاصی سے ترہیب مقصود ہے۔

نواب صدیق الحسن رحمہ اللہ فتح البیان میں فرماتے ہیں کہ وقد خاب من دسها میں قد کا تکرار اس کے مضمون کی تحقیق کے ساتھ اعتناء اور توجہ کے اظہار کے لیے ہے اور یہ معلوم کروانا ہے کہ قسم کا اس کے ساتھ بھی اصالتاً تعلق ہے۔

(۳۷) سورت اللیل

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ٥ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ٥ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ٥ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ٥﴾ (۱. ۲. ۳. ۴.)

''قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔''

واللیل سے لے کر والانثی تک مقسم بہ ہے اور ان سعیکم لشتی مقسم علیہ یعنی

جوابِ قسم ہے۔ ان قسموں میں زندگی کے دو مختلف راستوں کا فرق اور ان کے انجام اور نتائج کا ختلاف بیان کیا ہے نوعِ انسانی کے افراد' اقوام اور گروہ دنیا میں جو سعی وعمل کر رہے ہیں وہ لازماً اپنی اخلاقی نوعیت کے لحاظ سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح رات دن سے اور نر مادہ سے مختلف ہے۔

انسان اپنی فطرت سے کسی نہ کسی کام کے لیے سعی وعمل اور جدوجہد کرنے کا خوگر ہے مگر بعض لوگ اپنے جدوجہد اور محنت سے دائمی راحت کا سامان کر لیتے ہیں اور بعض لوگ اپنی اسی محنت سے دائمی عذاب خرید لیتے ہیں جیسے حدیث میں ہے ہر انسان جب صبح کو اٹھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو عبادت میں لگا دیتا ہے اور کوئی اس میں کامیاب ہوتا ہے اور اپنے آپ کو عذاب آخرت سے آزاد کر لیتا ہے اور کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی محبت اور سعی وعمل اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دن اور رت کی قسم کھائی ہے اور ساتھ ہی ان دونوں کی خاص صفات بیان کی ہیں رات کے لیے چھا جانے کی اور دن کے لیے روشن ہونے کی صفت بیان فرمائی اور تیسری آیت میں انسان کی دو متقابل جنسوں کے پیدا کرنے کی قسم کھائی۔ قرآنی سیاق نے ان مشاہدِ کائنات کو اور اس انسانی حقیقت کی قسم کھا کر عمل وجزا کی حقیقت کے لیے بنیاد بنایا۔ دنیوی اور اخروی ہر دو زندگیوں میں یہی حقیقت کارفرما ہے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی قسم کھا کر متقابلات کو ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر کائناتی اور انسانی انواع واقسام کا تقابل پیش کر کے دکھایا ہے کہ انسانوں کی سعی مختلف ہے اور اس کے لیے ان کے طریقے اور ان کی جزا بھی مختلف ہے خیر وشر میں مماثلت نہیں جس طرح کہ ہدایت وضلالت میں بھی مماثلت نہیں صلاح وفساد دو الگ الگ چیزیں ہیں ہر ایک کا اپنا طریق ہے اپنا انجام اور اپنی اپنی جزا ہے۔

ان سعیکم لشتی : جواب قسم ہے جس پر رات اور دن نر اور مادہ کی پیدائش کی قسم کھائی گئی مطلب یہ ہے کہ جس طرح رات اور دن اور نر اور مادہ ایک دوسرے سے مختلف

ہیں اوران میں سے ہر دو کے آثار ونتائج باہم متضاد ہیں اسی طرح تم لوگ جن راہوں اور مقاصد میں اپنی کوششیں صرف کرر ہے ہو وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے متضاد ہیں اس کے بعد قرآن مجید نے تین اخلاقی خصوصیات ایک نوعیت کی اور تین اخلاقی خصوصیات دوسری نوعیت کی سعی وعمل کے ایک وسیع مجموعے میں سے لیکر بطور نمونہ پیش کی ہیں جنہیں سن کر ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک قسم کی خصوصیات اس کے برعکس کس طرزِ زندگی کی علامات ہیں پہلی قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ آدمی مال دے‘ خدا ترسی و پرہیز گاری اختیار کرے اور بھلائی کو بھلائی مانے ۔دوسری قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بخل کرے‘ اللہ تعالیٰ کی رضا اور ناراضگی کی فکر سے بے پروا ہو جائے اور بھلی بات کو جھٹلا دے پھر بتایا گیا ہے کہ یہ دو طرز عمل جو صریحاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں اپنے نتائج کے اعتبار سے ہرگز یکساں نہیں۔ بلکہ جس قدر یہ اپنی نوعیت میں متضاد ہیں اسی قدر ان کے نتائج بھی متضاد۔ پہلے طرزِ عمل کو جو شخص یا گروہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے صاف اور سیدھے راستے کو سہل کر دے گا یہاں تک کہ اس کے لیے نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہو جائے گا اور دوسرے طرز عمل کو جو بھی اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے سخت راستے کو سہل کر دے گا یہاں تک کہ اس کے لیے بدی آسان اور نیکی مشکل ہو جائے گی۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ سعی اور لفظ عمل دونوں مترادف نہیں بلکہ لفظ سعی سے وہ عمل مراد ہے جس کا انسان اہتمام کرے اور اور ممکن حد تک کوشش کرے دوڑنے کی ضرورت ہو تو دوڑے‘ مددگاروں کی ضرورت ہو تو ان کو جمع کرے اگر اس کام کے لیے ایک سوئی کی ضرورت ہو تو اس کو بھی اختیار کرے۔ قرآن مجید میں لفظ سعی اس اعتبار سے استعمال ہوا ہے سورۃ جمعہ میں ارشاد ہوا یایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں آفاق وانفس کی شہادت کو اس بات پر پیش فرمایا ہے

کہ قیامت برحق ہے رات اور دن نر اور مادہ کی شہادت کو قسم کی صورت میں ذکر کیا ہے کہ رات اور دن، نر اور مادہ میں نسبت زوجین کی ہے اور یہ دونوں مل کو اس مقصد کو پورا کرتے ہیں جس کے لیے خالق نے ان کو پیدا کیا ان میں سے ہر ایک کے اندر خلا ہے جو جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پورا ہوتا ہے اسکے بغیر ان کے وجود کی نہ کوئی افادیت باقی رہتی اور نہ ان کی صلاحیتوں کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان اضداد کے اندر توافق کے پہلو سے توحید پر بھی دلیل پیش کی ہے اور قیامت پر بھی شہادت پیش کی ہے جو اس سورت میں مقصود ہے سورۃ الذاریات میں فرمایا ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون اور ہم نے ہر چیز میں سے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم یاددہانی حاصل کرو یعنی اس بات کی یاددہانی حاصل کرو کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہے اور یہ اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پہنچے گی اور وہ ہے آخرت جو لازماً ظہور میں آئے گی تا کہ یہ دنیا اپنی غایت اور مقصود کو پہنچے ورنہ یہ بالکل عبث اور بے غایت بن کر رہ جائیگی۔ اگر آخرت نہیں معنی یہ ہوا کہ خالق کے نزدیک نیکی اور بدی کرنے والے دونوں یکساں ہیں یہ حکیم خالق کی شان کے بالکل خلاف ہے کہ وہ نیک و بد دونوں کی جدوجہد اور کمائی کو یکساں کر دے عقل اور فطرت کا بدیہی تقاضا ہے کہ نیکوں اور بدوں دونوں کی سعی کا نتیجہ ایک ہی شکل میں نہ برآمد ہو بلکہ ان کے جدوجہد کے اعتبار سے الگ الگ ہو۔

جنہوں نے نیکی کمائی ہو وہ اس کا صلہ فضل وانعام کی شکل میں پائیں اور جنہوں نے بدی کمائی ہو وہ اس کے انجام سے دوچار ہوں گویا قیامت کا دعوی یہاں اس کی اصل ضرورت کے پہلوؤں سے سامنے رکھا۔ کہ اس کا آنا اس لیے ضروری ہے کہ قیامت اور جزا سزا کے بغیر یہ دنیا ایک اندھیر نگری اور ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کر رہ جاتی ہے چنانچہ قیامت کو نا ماننے والوں سے اللہ تعالی نے یہ سوال کیا ہے افحسبتم انما خلقنکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بالکل عبث پیدا کیا ہے تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ یہی سوال منکرین قیامت ہی

سے دوسرے مقام میں بانداز تعجب یوں کیا گیا افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی مانند کردیں گے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔

(۳۸) سورت الضحیٰ

﴿وَالضُّحٰى ٥ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ٥ مَاوَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰى ٥ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰى ٥ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰى ٥﴾ (آیت ۱ تا ۵)

”قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے۔(اے نبی ﷺ!) تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا اور یقیناً تمہارے لئے بعد کا دور پہلے دور سے زیادہ بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔“

والضحی واللیل اذا سجی۔ مقسم بہ ہے اور اگلی تینوں آیات ماودعك ربك وما قلی٥ وللاخرة خير لك من الاولی٥ ولسوف يعطيك ربك فترضی٥ مقسم علیہ ہیں۔

صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ جندب بن سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بیمار ہو گئے دو یا تین راتیں آپ نے رات کا قیام نہ فرمایا تو ایک عورت آئی اس نے کہا اے محمد ﷺ! مجھے امید ہے کہ تیرا شیطان تجھے چھوڑ گیا ہے دو تین راتوں سے دیکھ رہی ہوں کہ وہ تیرے قریب نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ نے والضحی واللیل اذا سجی ماودعك ربك وما قلی نازل فرمائی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ ایسا کہنے والی عورت ابولہب کی

بیوی ام جمیل بنت حرب تھی اس سورت کے شان نزول کے بارے میں اور بھی واقعات بیان کئے جاتے ہیں لیکن ابن حجرؒ فرماتے ہیں ''و کل هذه الروایات لا تثبت''

اس سورت میں قسمیں اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور آپکی پریشانی کو دور کیا گیا ہے سب سے پہلے روزِ روشن اور سکونِ شب کی قسم کھا کر آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ آپکے رب نے آپکو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا ہے۔ اس کے بعد آپ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ آپ کے ابتدائی دور میں شدید مشکلات سے سابقہ پیش آ رہا ہے یہ تھوڑے دن کی بات ہے آپ کے لیے ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اللہ تعالی آپ پر اپنی عطاو بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے یہ قرآن کی ان صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں حرف بحرف پوری ہوئیں حالانکہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت کہیں دور دور بھی اس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ مکہ میں جو بے یارومددگار انسان پوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہو گیا ہے اسے اتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہو گی۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے اپنے حبیب ﷺ سے فرمایا کہ تمہیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہوگئی کہ ہم نے تم کو چھوڑ دیا اور ہم ناراض ہو گئے۔ ہم تو تمہارے روزِ پیدائش سے مسلسل تم سے مہربانیاں کرتے چلے آ رہے ہیں تم یتیم پیدا ہوئے تھے ہم نے تمہاری پرورش اور خبر گیری کا بہترین انتظام کر دیا، تم ناواقفِ راہ تھے ہم نے تمہیں راہ بتایا، تم نادار تھے ہم نے تم کو مالدار کیا ساری باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم ابتدا سے ہمارے منظورِ نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر تمہارے شاملِ حال ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کے مقابلے میں بھیجا تو ان کی پریشانی دور کرنے کے لیے فرمایا کہ دیکھو کس طرح تمہاری پیدائش کے وقت سے ہماری مہربانیاں تمہارے شاملِ حال رہیں اس لیے تم اطمینان رکھو تم اس خوفناک مہم میں اکیلے نہ ہو گے بلکہ ہمارا فضل تمہارے ساتھ ہو گا۔

دن کی روشنی اور رات کے سکون کی قسم کھا کر آپ ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ تمہارے رب نے نہ تمہیں چھوڑ دیا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوگا اور تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے ان باتوں پر ان دونوں چیزوں کی قسم جس مناسبت سے کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی اور سکون لیے ہوئے چھا جانا کچھ اس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالی دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت خوش نہیں بلکہ ناراض ہے ایسا نہیں۔ یہ بھی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہی ہے اس کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ جب اللہ تعالی تم سے خوش ہو تو رات کا قیام کر سکو اور جب بیماری کی وجہ سے تہجد نہ پڑھ سکو تو اس کے یہ معنی ہوں کہ وہ تم سے ناخوش ہے اور اس نے تم کو چھوڑ دیا ہے اور دوسری مناسبت اس مضمون سے اس قسم کی یہ ہے کہ جس طرح دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اسے تھکا دے اس لئے ایک وقتِ خاص تک دن کے روشن رہنے کے بعد رات کا آنا ضروری ہے تا کہ اس میں انسان کو سکون ملے اسی طرح اگر بیماری کی وجہ سے تم قیام نہ کر سکے تو یہ بھی تمہیں سکون پہنچانے کے لیے ہے۔

وللاخرة خیر لك من الاولی۔ اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے یہ خوشخبری اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو ایسی حالت مین دی تھی جب کہ چند مٹھی بھر آدمی آپ کے ساتھ تھے ساری قوم آپکی مخالف تھی بظاہر کامیابی کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے تھے اسلام کی شمع مکہ میں ہی ٹمٹمارہی تھی اور اسے بجھا دینے کے لیے ہر طرف طوفان اٹھ رہے تھے اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ ابتدائی دور کی مشکلات سے آپ ذرا پریشان نہ ہوں ہر بعد کا دور پہلے دور سے آپ کے لیے بہتر ثابت ہوگا آپ کی قوت آپ کی عزت وشوکت اور آپکی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ کا نفوذ واثر پھیلتا چلا جائے گا یہ وعدہ صرف دنیا تک محدود نہیں اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپ کو ملے گا وہ اس مرتبہ سے بھی بدرجہا بڑھ کر ہوگا

جو دنیا میں آپ کو حاصل ہوگا۔

ولسوف يعطيك ربك فترضى: اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے یعنی وہ وقت دور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہو گی کہ تم خوش ہو جاؤ گے یہ وعدہ آپ ﷺ کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہوا کہ سارا ملکِ عرب جنوب کے سواحل سے لے کر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی سلطنت تک اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک اور مشرق میں خلیجِ فارس سے لے کر مغرب میں بحرِ احمر تک آپ کے زیرِ نگین ہو گیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطے کی تابع ہو گئی۔ جو طاقت بھی اس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی کلمہ لا اله الا الله محمد رسول الله سے وہ پورا ملک گونج اٹھا جس میں مشرکین اور اہلِ کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔ لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہ جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مسخر ہو گئے بلکہ عقائد اخلاق اور اعمال میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ جاہلیت میں ڈوبی ہوئی پوری قوم اتنی بدل گئی ہو۔ اس کے بعد حضور کی برپا کی ہوئی تحریک اس طاقت سے اٹھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر وہ چھا گئی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دنیا میں دیا اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ [1]

ان قسموں سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے اور آپ کی پریشانی کو دور کرنا ہے۔ راحت کی خوشخبری ہے۔ رحمت و محبت کی ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ دلی تعلق اور اندرونی تھکن کی تسکین کا سامان ہے۔ گویا محبت کا اعلان ہے ایک شفیق ہاتھ جو درد و غم اور مقامات درد کو مس کرتا ہے۔ راحت، رضا اور امید کا پیغام دیتا ہے۔

فائدہ: اکثر مفسرین نے والضحی سے لے کر ختم قرآن تک ہر سورۃ کے بعد اللہ اکبر کا کہنا ابی

[1] تفهيم القرآن

ابن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے مگر اس کی سند کا کچھ پتہ نہیں ۔ امام ابن کثیر "فرماتے ہیں کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ والی یہ روایت اس کے بیان کرنے میں ابوالحسن احمد بن عبداللہ البز ی قاسم بن ابو بزہ کی نسل سے منفرد ہیں قراتوں کے تو امام تھے لیکن حدیث میں امام ابوحاتم رازی نے اسے ضعیف کہا اور فرمایا کہ میں اس سے حدیث نہیں بیان کرتا اور ابوجعفر عقیلی فرماتے ہیں یہ منکرالحدیث ہے۔ ❶

(۳۹) سورت التین

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ٥ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ٥ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ٥ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِ نْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ٥ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ٥ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ٥ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِا لدِّيْنِ ٥ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ٥﴾ (آیت ۱ تا ۸)

"قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا کی اور اس پر امن شہر (مکہ) کی ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچا کر دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے پس (اے انسان) اس کے بعد کیا چیز تجھے جزا و سزا کو جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں نہایت مختصر اور دل نشین طریقہ سے لوگوں کو سمجھایا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا ضروری اور سراسر معقول ہے اس غرض کیلئے سب سے پہلے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کے مقامات ظہور کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے اللہ عزوجل کا یہ فرمانا کہ انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے یہ

❶ تفسیر ابن کثیر جلد نمبر ٤ صفحه نمبر ٥١٢

معنی رکھتا ہے کہ نوعِ انسانی کو اتنی بہترین ساخت عطا کی گئی ہے کہ اس کے اندر نبوت جیسے بہترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے جس سے اونچا منصب اللہ تعالیٰ کی کسی دوسری مخلوق کو نصیب نہیں ہوا۔ انسان اس بہترین ساخت پر پیدا ہونیکے بعد برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اخلاقی پستی میں گرتے گرتے اس انتہا کو پہنچ جاتے ہیں جہاں ان سے زیادہ نیچ کوئی دوسری مخلوق نہیں۔ دوسرے کچھ وہ انسان ہوتے ہیں جو ایمان و عملِ صالح کا راستہ اختیار کر کے اس گراوٹ سے بچ جاتے ہیں اس مقامِ بلند پر قائم رہتے ہیں جو ان کے بلند ترین ساخت پر پیدا ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔

ان دونوں قسموں کے لوگوں کا پایا جانا ایک ایسا امرِ واقعی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کا مشاہدہ انسانی معاشرے میں ہر جگہ ہر وقت ہو رہا ہے اور آخر میں اس امر واقعی سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جب انسانوں میں سے دو یہ الگ الگ اور ایک دوسرے سے قطعی مختلف قسمیں پائی جاتیں ہیں تو پھر جزائے اعمال کا کیسے انکار کیا جاسکتا ہے اگر پستی میں گرنے والوں کو کوئی سزا اور بلندی پر چڑھنے والوں کو کوئی اجر نہ ملے اور انجام کار دونوں کا یکساں ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں کوئی انصاف نہیں حالانکہ انسانی فطرت اور انسان کی عقلِ عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ جو شخص بھی حاکم ہو وہ انصاف کرے پھر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے وہ انصاف نہیں کرے گا۔

فرمایا قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور اس طور سینا اور پرامن شہر مکہ کی ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہم نے اسے الٹا پھیر کر سب نیچوں سے نیچا کر دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے اے انسان تجھے اس کے بعد کیا چیز جزا سزا کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں کا حاکم نہیں ہے؟

اہلِ عرب میں یہ طریقہ رائج تھا کہ جو پھل کسی کے علاقے میں کثرت سے واقع ہوتا

اس علاقے کو وہ بسا اوقات اس پھل کے نام سے موسوم کر دیتے تھے اس محاورے کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب مناسبتِ تین اور زیتون یعنی ان پھلوں کی پیداوار کا علاقہ مراد ہے اور وہ شام اور فلسطین کا علاقہ ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے اہلِ عرب میں یہی علاقہ انجیر اور زیتون کے لیے مشہور تھا۔ ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم اور زمخشری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

اس سورۃ میں شام اور فلسطین اور کوہِ طور اور مکہ کے پرامن شہر کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ اس کو وہ اعلیٰ درجہ کا جسم عطا کیا گیا جو کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دیا گیا اور اسے فکر وفہم اور علم وعقل کی بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئی ہیں پھر نوعِ انسانی کے اس فضل و کمال کا سب سے بلند پایہ نمونہ انبیاء علیہم السلام ہیں اور کسی مخلوق کیلئے اس سے اونچا مرتبہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ اسے منصبِ نبوت عطا کرنے کے لیے منتخب کر لے اس لئے انسان کے احسن تقویم ہونے کی شہادت میں ان مقامات کی قسم کھائی گئی جو رب العزت کے پیغمبروں سے نسبت رکھتے ہیں شام فلسطین کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بکثرت انبیاء مبعوث ہوئے۔

کوہِ طور وہ مقام ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی اور مکہ مکرمہ اس کی بِنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ہاتھوں پڑی انہی کی بدولت وہ عرب کا مقدس ترین مرکزی شہر بنا اور اسی دعا کی یہ برکت تھی کہ عرب میں ہر طرف پھیلی ہوئی بدامنی کے درمیان صرف یہی ایک شہر ڈھائی ہزار سال سے امن کا گہوارہ بنا ہوا تھا اور آخر میں اسی شہر سے عظیم ہستی سید الاولین والاخرین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہوئے کلام کا مقصود یہ ہے کہ ہم نے نوعِ انسانی کو اس بہترین ساخت پر بنایا کہ اس میں نبوت جیسے عظیم مرتبے کے حامل لوگ پیدا ہوئے۔ انسان بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کے بعد جب اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو برائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ

اسے برائی کی طرف ہی جانے دیتے ہیں اور گراتے گراتے اسے گرواٹ کی اس انتہا پر پہنچا دیتے ہیں کہ کوئی مخلوق گراوٹ میں اس حد کو پہنچتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیظ وغضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں جو لوگ غرق ہو جاتے ہیں وہ اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر صرف ایک اسی بات کو لیجیے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں تمام درندوں کو مات کر دیتی ہے درندہ تو صرف اپنی غذا کیلئے کسی جانور کا شکار کرتا ہے جانوروں کا قتل عام نہیں کرتا مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے مگر یہ احسن تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اپنی عقل سے کام لے کر توپ، بندوق، ہوائی جہاز، ٹینک، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور دوسرے بے شمار ہتھیار ایجاد کرتا ہے تاکہ آن کی آن میں پوری بستیوں کو ہلاک کر دے درندہ تو صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے مگر انسان اپنے ہی جیسوں کو اذیت دینے کیلئے ایسے ایسے دردناک طریقے اختراع کرتا ہے جن کا تصور کبھی کسی درندے کے دماغ میں نہیں آ سکتا۔ پھر اپنے انتقام اور دشمنی کی آگ ٹھنڈی کرنے کیلئے کمینہ پن کی اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے، ایک ایک عورت کو دس دس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں، باپوں بھائیوں اور شوہروں کے سامنے انکے گھروں کی عصمت لوٹتے ہیں، بچوں کو ماں باپ کے سامنے قتل کر دیتے ہیں، ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں، انسانوں کو زندہ جلاتے اور دفن کرتے ہیں۔ دنیا میں وحشی سے وحشی درندوں کی کوئی قِسم ایسی نہیں جو انسان کی اس وحشت کا کسی درجہ میں مقابلہ کرے۔ یہی حال دوسری بری صفات میں بھی ہے کہ انسان جس کی طرف رخ کرتا ہے اپنے آپ کو ارذل المخلوقات ثابت کرتا ہے چونکہ مذہب جو انسان کے لیے مقدس ترین شے ہے اسے اتنا گرا دیتا ہے کہ درختوں

پتھروں کو پوجتے پوجتے پستی کی انتہا کو پہنچ کر مرد و عورت کے اعضائے جنسی تک کو پوج ڈالتا ہے اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے عبادت گاہوں میں دیوداسیاں رکھتا ہے جن سے زنا کا ارتکاب کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے ان کی طرف ایسے ایسے گندے قصے منسوب ہوتے ہیں جو ذلیل ترین انسان کے لیے بھی باعثِ شرم ہیں۔

ہر زمانے میں جس طرح انسانی معاشرے میں یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اخلاقی پستی میں گرنے والے لوگ گرتے گرتے سب نیچوں سے نیچے ہو جاتے ہیں اس طرح یہ بھی ہر زمانے کا عام مشاہدہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے اور جنہوں نے اپنی زندگی عملِ صالح کے سانچے میں ڈھال دی وہ اس پستی میں گرنے سے بچ گئے اور اسی احسن تقویم پر قائم رہے جس پر اللہ عزوجل نے انسان کو پیدا کیا اس لیے وہ اجرِ غیر ممنون کے مستحق ہیں یعنی ایسے اجر کے جو انکے استحقاق سے نہ کم کیا جائے گا نہ اس کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا۔

جب انسانوں کے اندر یہ دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں تو اس کے بعد جزا و سزا کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ کیا عقل انسان کی یہ کہتی ہے کہ دونوں قسم کے انسانوں کا انجام یکساں ہو؟ کیا انصاف یہی چاہتا ہے کہ نہ اسفل السافلین میں گرنے والوں کو سزا دی جائے اور نہ اس سے بچ کر پاکیزہ زندگی گزارنے والوں کو کوئی جزا؟ یہی بات دوسرے مقامات پر اس طرح فرمائی گئی ''کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں تم کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو'' (القلم ۳۵:۳۶) اور فرمایا ''کیا برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جنہوں نے نیک عمل کیے دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں'' (الجاثیہ۔۲۱)

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ کیونکر رکھا جا سکتا ہے کہ وہ اچھے اور بروں کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک کرے گا جبکہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکموں سے بھی تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ انصاف کریں مجرموں کو سزا اور اچھے کام کرنے والوں کو انعام دیں تو اللہ تعالیٰ کے متعلق

تمہارا کیا خیال ہے وہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟ اگر اس کو بڑا حاکم مانتے ہو تو تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ انصاف نہ کریگا؟ کیا اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ بروں اور بھلوں کو ایک جیسا کردے گا؟ کیا برے افعال کرنے والے اور بہترین عمل کرنے والے مرکر خاک ہو جائیں گے؟ اور کسی کو بداعمالیوں کی سزا اور حسنِ عمل کی جزا نہ ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کی ابتداء میں چار چیزوں کی قسم کھا کر انسان کی آفریش کا حال اور پھر سعادت وشقاوت حاصل کرنے سے مآل بیان فرمایا۔[1]

اور چار چیزیں اس کی کمالِ قدرت کے دلائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کیساتھ کمال مناسبت بھی رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان چاروں مقدس جگہوں کی قسم کھاتے ہیں جہاں سے نبوت ورسالت کے آفتاب ومہتاب دنیا کو منور کرنے کیلئے جلوہ گر ہوئے تاکہ معلوم ہو کہ آئندہ جو کچھ انسان کی سعادت وشقاوت کی بابت کہا جاتا ہے وہ لغو بات نہیں بلکہ ان چاروں جگہوں کے مقدس وابرار حضرات انبیاء علیہم السلام کا قول ہے کہ جن کو جہاں مانتا ہے اور تمام شرائع کا ماحاصل اور خلاصہ مطلب ہیں۔[2]

اعتراض: اللہ تعالیٰ نے فرمایا لقد خلقنا الا نسان فی احسن تقویم اس سے وہم ہوتا ہے کہ انسان اپنے رب کو اپنا خالق نہیں مانتا کیونکہ کلام کا انداز بہت تاکید والا ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جو بتایا کہ انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا اس کو چار قسموں کے ساتھ اور لام اور قد کے ساتھ مؤکد کیا یہ چھ تاکیدیں تو وہم دلاتی ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اپنے خالق ہونے کا منکر ہے حالانکہ دوسری آیات اس بارہ میں صریح ہیں کہ کفار اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے جیسے فرمایا ولئن سالتھن من خلقھم لیقولن اللہ۔ اس اعتراض کا جواب دوطرح سے دیا جاتا ہے۔ (۱) علمائے بلاغت ذکر کرتے ہیں کہ مخاطب پر جب انکار کی نشانی ظاہر ہو تو اسے منکر کی طرح ٹھہرا کر اس سے کلام کی جاتی ہے۔ کفار نے جب دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کیا تو ان پر پہلی پیدا

---

[1] تفہیم القرآن [2] تفسیر حقانی

کرنے کے انکار کی نشانی ظاہر ہوئی کیونکہ جو پہلی دفعہ پیدا کرنے کا اقرار کرے اس کو دوسری دفعہ پیدا کرنے کا اقرار لازم آتا ہے کیونکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی دفعہ پیدا کرنے سے آسان ہے تو اللہ تعالیٰ نے ایجادِ اول کو مؤکد کیا اس بات کی وضاحت اللہ تعالیٰ کا فرمان فما یکذبك بعد بالدین کرتا ہے کہ اے انسان جب تجھے علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار تجھے پیدا کیا تو کونسی چیز تجھے بعث و جزا کی تکذیب پر آمادہ کرتی ہے جو تجھے پہلی بار پیدا کرسکتا ہے تجھے دوبارہ بھی پیدا کرسکتا ہے جیسے فرمایا:

قل یحییها الذی انشا ها اول مرة ۔

(۲) کہ قسم ثم رددنه اسفل سافلین کو بھی شامل ہے اور وہ لوگ جہنم کو نہیں مانتے تھے یعنی یہ قسم انکار کو بھی شامل ہے اور اس انکار کی بناء پر تاکید لائی۔ ❶

اللہ تعالیٰ نے تو ہر چیز کی پیدائش کو حسین بنایا ہے احسن کل شئی خلقه مگر اس مقام پر اور دیگر قرآنی آیات میں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی حسنِ ترکیب اور احسن تقویم اور حسنِ تعدیل کا ذکر فرمایا یقیناً انسانی مخلوق میں کمزوریاں وانحراف وفساد ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی احسن تقویم کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی ایک شان ہے اور کائنات میں ایک وزن ہے۔ اس کے عنایت مہربانی ہے جو اس کی پیدائش اور اعلیٰ درجے کی ترکیب میں نظر آتی ہے اور کتنی پیچیدہ اور حیرت انگیز جسمانی ترکیب اور اس کی بے نظیر عقلی تکوین اس میں نظر آتی ہے اور روحانی تکوین تو اس کی واقعی حیرت ناک ہے۔

سورة التین میں بنیادی حیثیت سے جس چیز کو مرکز بنا کر بات کی گئی ہے وہ اس کے روحانی خصائص ہیں کیونکہ ان ہی کی عدمِ موجودگی میں وہ اسفل السافلین میں جا گرتا ہے اور فطرت سے منحرف ہو کر اور ایمان سے الگ ہو کر پست ترین مقامات پر چلا جاتا ہے کیونکہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اس کی بدنی خلقت تو اسفل سافلین میں

---

❶ اضواء البیان

نہیں گرتی۔

انسان کی فوقیت روحانی خصائص کی وجہ سے ہے۔انہی کی بناء پر وہ اس قابل ہے کہ ملائکہ مقربین کے مقام سے بھی بلند مقام پر فائز ہو اللہ تعالی نے انسان کی فطرت اور استعداد کو بہت بلند بنایا ہے۔

(۴۰) سورت العٰدیٰت

﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًاo فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًاo فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًاo فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًاo فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًاo اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌo وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌo وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌo﴾

(آیت ۱ تا ۸)

"قسم ہے پھنکارے مارتے ہوئے گھوڑوں کی۔ پھر اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں جھاڑنے والوں کی۔ پھر صبح کے وقت چھاپہ مارنے والوں کی۔ پھر اس موقع پر گردو غبار اڑاتے ہیں۔ پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے اور وہ مال ودولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔"

پہلی پانچ آیات میں جنگی گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے اور اگلی تین آیات مقسم علیہ ہیں۔

والعدیت ضبحا۔ عدیت کے معنی دوڑنے والے کے ہیں لیکن یہ یہاں جنگی گھوڑوں کی صفت کے طور پر آیا ہے کیونکہ آگے چار صفتیں جو ترتیب کے ساتھ آئی ہیں وہ جنگی گھوڑوں کے سوا کسی اور پر منطبق نہیں ہوتیں۔ضبحا وہ خاص آواز ہے جو گھوڑے ہانپتے ہوئے اپنے نتھنوں سے نکالتے ہیں ان کے ہانپنے کا یہ خاص انداز اس بات کی

شہادت ہے کہ اللہ تعالی نے جس مقصد کیلئے ان کو انسان کی محکومی میں دیا ہے اس کو وہ نہایت وفاداری و جاں نثاری سے پورا کرنے والے اور انسان کی مقصد برآری میں اپنی طاقت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر رکھ دینے والے ہیں۔ والعدیت ضبحا میں ضبحا منصوب اس لیے ہے کہ یہ فعل مقدر تضبح کا مفعول مطلق ہے اور یہ جملہ بن کر العدیت سے حال واقع ہے۔ عدیات عادیۃ کی جمع ہے جو عدو سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے تیزی سے چلنا۔ یا ضبحا اس وجہ سے منصوب ہے کہ یہ ضابحات کے معنی میں ہو کر والعدیت سے حال ہے یا یہ العدیت کا مفعول مطلق من غیر لفظہ ہونیکی بنا پر منصوب ہے۔

فالموریت قدحا۔ ف کے ذریعہ سے عطف ترتیب کی بھی دلیل ہے اور اس بات کی بھی کہ تمام صفتیں ایک ہی موصوف سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ موریات موریۃ کی جمع ہے یہ ایراء سے مشتق ہے جس کے معنی چقماق یا کسی چیز سے آگ نکالنے کے ہیں۔ قدحا ضرب لگانے، ٹھوکر لگانے اور ایک چیز کو دوسری سے ٹکرانے کے ہے۔ گھوڑے انسان کی خدمت کے لیے جو سرگرمی دکھلاتے ہیں اس کی یہ منظر کشی ہے کہ وہ اس طرح دوڑتے ہیں کہ ان کے سموں کی ٹھوکر سے چنگاریاں جھڑتی ہیں گھوڑوں کے آہنی نعل ہونے کی بنا پر جب وہ دشمن پر دھاوا کرنے کیلئے پتھریلی زمینوں پر دوڑتے ہیں تو ان کے سموں کی ضرب سے چقماق کی طرح چنگاریاں نکلتی ہیں۔

قدحا کے منصوب ہونے کی بھی وہی تین وجوہ ہیں جو ضبحا کے منصوب ہونیکی ہیں۔

فالمغیرت صبحا۔ عرب میں حریفوں پر غارت گری کا سب سے موزون وقت صبح کا ہی سمجھا جاتا تھا اس وجہ سے یہاں صبحا کی قید ہے۔ ان کے ہاں غارت گری کے الارم کی طور پر واصباحا کا جو نعرہ تھا اس میں بھی صبح کا حوالہ اس پہلو سے ہے۔ صبحا مغیرات کے مفعول فیہ ہونیکی وجہ سے منصوب ہے۔

فاثرن بہ نقعا۔ اثارۃ کے معنی اٹھانے اور ابھارنے اور نقع کے معنی گردوغبار کے

ہیں۔ بہ میں ب ظرف کے مفہوم میں ہے اور ضمیر کا مرجع صبحا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ صبح کو غارت گری کرتے ہیں تو اس وقت وہ گرد وغبار کا ایک طوفان اٹھا دیتے ہیں ان کا حملہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی جانب سے ایک طوفانی آندھی آ گئی ہے۔ نقعا اثرن کا مفعول بہ بننے کی وجہ سے منصوب ہے۔

فوسطن به جمعا۔ بہ میں ب ملابست کے مفہوم میں اور ضمیر کا مرجع نقعا ہے۔ یعنی وہ اس آندھی اور طوفان کے ساتھ دشمن کے ایک پورے غول کے اندر گھس جاتے ہیں اور اس کے نیزوں اور تلواروں کی ذرہ پروا نہیں کرتے انہیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے مالکوں کا مقصد عزیز ہوتا ہے اس کی خاطر وہ ہر خطرے سے بے خوف ہو کر اقدام کرتے ہیں اور یہی ان کے شایان شان ہے۔[1]

جمعا وسطن کا مفعول بہ بننے کی وجہ سے یا مفعول فیہ ہونیکے کی وجہ سے یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔[2]

ان گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے جو رات کو پھنکارے مارتے اور چنگاریاں جھاڑتے دوڑتے ہیں پھر صبح سویرے غبار اڑاتے کسی بستی پر جا پڑتے اور مدافعت کرنے والوں کی جماعت میں گھس جاتے ہیں۔

جاہلیت میں رات ایک بہت خوفناک چیز ہوتی تھی جس میں ہر قبیلے اور ہر بستی کے لوگ یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ نا معلوم کونسا دشمن ان پر چڑھائی کے لیے آ رہا ہو اور دن کی روشنی نمودار ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لیتے کہ رات خیریت سے گزری گئی۔ قبیلوں کے درمیان محض انتقامی لڑائیاں ہی نہیں ہوتیں تھیں بلکہ مختلف قبیلے ایک دوسرے پر محض اس لیے بھی چھاپے مارتے تھے کہ ان کی دولت لوٹ لیں۔ ان کے مویشی ہانک کر لے جائیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیں اس غارت گری کے لیے زیادہ تر

---

❶ تدبر القرآن

❷ تفسیر حقانی

گھوڑوں پر سوار ہو کر جاتے تھے۔ ❶

ان الا نسان لربه لكنود وانه على ذلك لشهيد وانه لحب الخير لشديد:
ان آیات میں وہ اصل بات ذکر کی گئی ہے جس پر شہادت کیلئے اوپر کی قسمیں کھائی گئی ہیں مطلب یہ ہے کہ جو انسان گھوڑوں کی یہ ساری جانثاریاں دیکھتا ہے اور ان کی قربانیوں سے بہرہ مند ہوتا ہے لیکن اسے یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ بھی اپنے رب کا غلام ہے اور اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہیں کی طرح اپنے رب کی اطاعت میں سر گرم اور سینہ سپر رہے وہ نہایت ناشکرا اور لئیم ہے کیونکہ وہ جانور ہو کر اپنے مالک کا حق پہنچاتے ہیں اور یہ انسان ہو کر اپنے خالق کا حق نہیں پہنچاتا۔ گھوڑوں کا ذکر بطور مثال ہے یہی وفاداری و جانثاری ان تمام حیوانات میں پائی جاتی ہے جو اللہ تعالی نے انسان کے لیے مسخر کر دیئے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ ان کا بھی ذکر کر کے انسان کی حس شکر کو ابھارا ہے خاص طور پر اونٹ کی صلاحیتوں اور خصلتوں کا ذکر قرآن میں متعدد جگہ پر آیا ہے اس کی جفاکشی اور اس کے صبر سے انسان کو سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ جس طرح اپنے آقا کی تابعداری کرتا ہے اس طرح انسان کا فرض ہے کہ اپنے اس آقا کی تابعداری کرے جس نے اونٹ جیسے عظیم اور کثیر المنافع جانور کو اس کی تابعداری میں دے دیا ہے۔

گھوڑوں کی خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جنگ اور دفاع کیلئے خاص طور پر اس دور میں بڑی اہمیت رکھتے تھے جب ہر خاندان اور ہر قبیلہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود خاندان اور قبیلہ پر عائد ہوتی تھی اس سلسلہ میں ہر ایک کو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے اصیل جنگی گھوڑے رکھنے پڑتے تھے ان کے ہاں ان گھوڑوں کی بڑی عظمت و اہمیت تھی گھوڑوں کی یہ قدر و قیمت ظاہر ہے کہ ان کی خدمات اور جانبازیوں کی بنا پر ہے جو وہ انسان کیلئے انجام دیتے ہیں اگر وہ یہ خدمتیں انجام نہ دیتے تو انسان نہ ان

---

❶ تفہیم القران

پر اپنا مال خرچ کرتا اور نہ اپنے قصیدوں میں ان کی مدح سرائی کرتا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اس بات سے ناواقف نہیں کہ غلام کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی خدمات پر ہے لیکن خود اپنے معاملے میں اس حقیقت کو فراموش کر جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ جس رب کا غلام ہے حکم تو اس کا ایک نہ مانے لیکن انعام دنیا اور آخرت دونوں میں سب سے بڑا پائے۔[1]

انسان کی ناشکری کا ایک اور پہلو قابل توجہ ہے کہ انسان نہ گھوڑوں کا ہی خالق ہے اور نہ ہی ان چیزوں کا خالق ہے جن پر ان کی پرورش کا انحصار ہوتا ہے تاہم وہ نہایت بے جگری سے انسان کی خدمت محض اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی خدمت میں لگا دیا۔ اس کے برعکس انسان کا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا بھی خالق ہے اور اس کے کام آنے والے تمام جانوروں اور معاش و معشیت کے جملہ اسباب و وسائل کا بھی۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی حقوق فرائض سے لاپرواہ ہے۔ اور انسان کے اس ناشکرے پن پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود اس پر سب سے بڑا گواہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ القیامہ میں فرمایا:

بل الا نسان علی نفسه بصيرة ولو القى معاذيره

جو باتیں انسان کی فطرت کے مقضیات میں سے ہیں وہ دلیل کی محتاج نہیں ان کے حق میں سب سے بڑی گواہی اس کی فطرت اور اس کے ضمیر کے اندر موجود ہوتی ہے انسان اگر ان سے گریز اختیار کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں ملی بلکہ ان کو وہ اپنے نفس کی سفلی خواہشوں کے خلاف پاتا ہے اس وجہ سے ان سے گریز کیلئے بہانے تلاش کرتا ہے۔ ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ خود تو انہیں گھوڑوں کی قدر کرتا ہے وہ اس کی کوئی قابل قدر خدمت انجام دیتے ہیں لیکن اپنے مالک اور اپنے رب کے متعلق یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے ہاں نیکوکار اور بدکار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس نے

---

[1] تدبر القرآن

ان کے ساتھ جو معاملہ اس دنیا میں کیا ہے وہ اس سے بہتر معاملہ آخرت میں کرے گا خواہ اس کے ایک حکم کی بھی وہ تعمیل نہ کرے بلکہ ساری زندگی اپنے نفس کی غلامی میں گزارے۔

گھوڑے زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ جو لوگ مالکِ حقیقی کی دی ہوئی روزی کھاتے اور اس کی بے شمار نعمتوں سے شب و روز تمتع کرتے ہیں اس کے باوجود اسکی فرنبرداری نہیں کرتے وہ جانوروں سے زیادہ ذلیل وحقیر ہیں۔ گھوڑے کو مالک گھاس کے تنکے اور تھوڑا سا دانہ کھلاتے ہیں جدھر وہ اشارہ کرتا ہے ادھر چلتا ہے۔ دوڑتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے، ٹاپیں مارتے ہوئے اور گردوغبار اٹھاتے ہوئے گھمسان کے معرکوں میں بے تکلف گھس جاتے ہیں گولیوں کی بارش میں تلواروں اور سنگینوں کے سامنے پڑکر اپنے سینے نہیں پھیرتے بلکہ بسا اوقات وفادار گھوڑے سوار کو بچانے کیلئے اپنی جان خطرہ میں ڈال دیتے ہیں۔ کیا انسان نے ایسے گھوڑے سے کوئی سبق سیکھا ؟ اس کا بھی کوئی پالنے والا مالک ہے جس کی وفاداری میں اسے جان و مال خرچ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بے شک انسان بڑا ناشکرا اور نالائق ہے ایک گھوڑے کے برابر بھی وفاداری نہیں دکھلا سکتا انسان خود اپنی ناشکری پر زباں و حال سے گواہ ہے ذرا اپنے ضمیر کی آواز کی طرف متوجہ ہو تو سن لے کہ اندر سے خود اس کا دل کہہ رہا ہے کہ تو بڑا ناشکرا ہے۔[1]

اس قسم میں انسان کے ناشکرے پن پر اس کو تنبیہ اور ملامت ہے اس کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں وہ جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے ان وسائل و ذرائع ہی سے حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے بخشے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ جب سب کچھ رب العزت کی عنایت سے حاصل ہوا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کرنا واجب ہے وہ صرف یہ کہ مالک کا حق تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ علانیہ اللہ تعالیٰ کی

---

[1] تفسیر عثمانی

عطا کردہ قوتیں اور صلاحیتیں خود اس کے خلاف استعمال کرتا ہے اور اس کی ذرہ پروا نہیں کرتا کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ رہے گی بلکہ سینوں کے راز بھی اگلوا لیے جائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے پورے علم کے ساتھ ہر ایک کا محاسبہ کرے گا اور ہر ایک کو جزا و سزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے تصرف میں جو حیوانات رکھے ان میں خاص طور پر جنگی گھوڑوں کی ان جانفشانیوں، جان بازیوں اور قربانیوں کا بطریق قسم حوالہ دیا ہے جو وہ اپنے آقا یعنی انسان کی اطاعت و خدمت میں کرتے ہیں اور پھر انسان کی ناشکری اور ناسپاسی پر اس کو ملامت ہے کہ آخر وہ اپنے غلاموں اور مملوکوں کی اس وفادارانہ روش سے یہ سبق کیوں نہیں سیکھتا کہ وہ بھی کسی مالک کا مملوک کسی رب کا مربوب اور کسی آقا کا غلام ہے اور اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی کی طرح بلکہ ان سے بھی بڑھ کر اس کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت میں سرگرم رہے۔

وانه لحب الخير لشديد۔ یہ انسان کے ناشکرے پن پر، اس کے کردار پر دلیل پیش کی ہے کہ وہ مال کی محبت میں غرق ہے۔ گھوڑے نیزوں کے مقابل میں سینہ سپر ہو کر جو کچھ حاصل کرتے ہیں سب مالک کے حوالے کرتے ہیں اپنے کسی حق کا مطالبہ نہیں کرتے مالک جو کچھ انکے آگے ڈال دیتا ہے اس پر قانع رہتے ہیں لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جو کچھ اپنے رب کی بخشش و عنایات سے پاتا ہے اس کو اپنی تدبیر قابلیت کا کرشمہ سمجھتا ہے اور اس پر مارِ گنج بن کر بیٹھ رہتا ہے اس میں مالک کا کوئی حق تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا اور اگر کوئی اس کے لیے اس کو یاددہانی کرائے تو اس کو جواب دیتا ہے کہ اس کے مال کو اللہ عزوجل سے کیا تعلق یہ تو اس نے اپنی محنت و قابلیت سے حاصل کیا ہے۔

"انما اوتيته على علم عندى" القصص (۲۸۔۷۸)

محبت کی اصلی حق دار وہ ذات ہے جو انسان کی خالق و مالک ہے اور جس کے فضل سے انسان کو سب کچھ ملتا ہے جو اس دنیا میں وہ پاتا ہے۔ سچے اہل ایمان اپنے

رب تعالیٰ کی محبت میں مضبوط ثابت ہوتے ہیں اور نفس کے مطالبے کو ٹھکرا دیتے ہیں" والذین امنوا اشد حبا للہ البقرۃ "(۲۔۱۶۵) اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو ناشکرے اور ناسپاس ہوتے ہیں وہ اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے زیادہ اپنے مال کے پرستار ہوتے ہیں۔

(۴۱) سورت العصر

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾

(آیت ۱ تا ۳)

"زمانے کی قسم انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

والعصر مقسم بہ اور ان الانسان سے لیکر آخر سورت تک مقسم علیہ ہے۔

اس سورۃ میں قسم کے دوٹوک طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے اور اس کی تباہی و بربادی کا راستہ کونسا ہے اسلام کی تعلیم کو مختصر اور انتہائی دل نشین فقروں میں بیان کیا گیا تا کہ سننے والے ایک دفعہ ان کو سن کر بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں اور آپ سے آپ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔ اسی لئے امام شافعی علیہ الرحمۃ نے بہت صحیح کہا کہ اگر لوگ اس سورت پہ غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔

ارشاد فرمایا: الاالذین امنوا وعملواالصالحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔ زمانے کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے

اور اس خسارے سے صرف وہی لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر چار صفتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) ایمان

(۲) عمل صالح

(۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا

(۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔

اس کے ایک جزو کو الگ لے کر اس پر غور کرنا چاہیے تا کہ اس استثناء کا پورا مطلب واضح ہو جائے اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم اس لیے اٹھائی ہے کہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ اور دلیل ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جن میں چار صفتیں پائی جاتی ہوں۔ زمانے کا لفظ گزرے ہوئے اور گزرتے ہوئے زمانے کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی ماضی اور حال کے لیے۔ ہر آن گزر کر ماضی بنتی جارہی ہے اور ہر آن مستقبل کو حال اور حال کو ماضی بنا رہی ہے۔ یہاں چونکہ مطلقاً زمانے کی قسم کھائی گئی ہے اس لیے دونوں طرح کے زمانے اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی ان صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے وہ دراصل وہ وقت ہے جو ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔

اس کی مثال اس وقت کی سی ہے جو امتحان گاہ میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے یہ وقت جس تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے اسی ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار

میل کا راستہ طے کر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خدائی میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اس سے بھی تیز رفتار ہوں خواہ وہ ابھی تک ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔

تاہم اگر وقت گزرنے کی رفتار یہی سمجھ لی جائے جو گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کے چلنے سے ہم کو نظر آتی ہے اور اس بات پر غور کیا جائے کہ ہم جو کچھ بھی اچھا یا برا کرتے ہیں اور جن کاموں میں بھی ہم مشغول رہتے ہیں سب کچھ اس محدود مدت عمر میں ہی وقوع پذیر ہوتا ہے جو دنیا میں ہم کو کام کرنے کے لیے دی گئی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ یہی وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے سورۃ العصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آواز دے رہا تھا کہ رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے اس کی بات سن کر میں نے کہا یہ ہے والعصر ان الانسان لفی خسر کا مطلب۔ عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھلنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے اس کو اگر ضائع کیا جائے یا غلط کاموں میں صرف کیا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے۔

پس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورت میں کہی گئی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مہلت عمر کو صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو ان چاروں صفات سے متصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم اس طالب علم سے جو امتحان کے مقررہ وقت کو اپنا پرچہ حل کرنے کی بجائے کسی اور کام میں گزار رہا ہو کمرے کے اندر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ یہ گزرتا ہوا وقت بتا رہا ہے کہ تم اپنا نقصان کر رہے ہو نفع میں صرف وہ طالب علم ہے جو اس وقت کا ہر لمحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کر رہا ہے۔

سورۃ العصر میں انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے لیکن استثناء قرینہ ہے کہ لفظ انسان

یہاں اسم جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اس کا اطلاق افراد' گروہوں' اقوام اور پوری نوع انسانی پر یکساں ہوتا ہے پس یہ حکم کہ مذکورہ چار صفات سے جو بھی خالی ہو وہ خسارے میں ہے ہر حالت میں ثابت ہوگا خواہ ان سے خالی کوئی شخص ہو یا کوئی قوم یا دنیا بھر کے انسان جیسے ہم اگر یہ حکم لگائیں کہ زہر انسان کے لیے مہلک ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زہر ہر حال مہلک ہے خواہ ایک فرد اس کو کھائے یا پوری قوم یا ساری دنیا کے انسان اسے مل کر کھائیں زہر کی مہلک خاصیت اپنی جگہ اٹل ہے اس میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص نے اس کو کھایا یا ایک قوم نے اسے کھانے کا فیصلہ کیا یا دنیا بھر کے انسانوں کا اجماع اس پر ہو گیا ہے کہ زہر کھانا چاہیئے ٹھیک اسی طرح یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ چار مذکورہ بالا صفات سے خالی ہونا انسان کے لیے خسارے کا موجب ہے۔ اس قاعدہ کلیہ میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ایک شخص ان سے خالی ہے یا کسی قوم نے یا دنیا بھر کے انسانوں نے کفر' بدعملی اور ایک دوسرے کو باطل کی ترغیب دینے اور بندگی نفس کی تلقین کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔

خسارے کا لفظ لغت کے اعتبار سے نفع کی ضد ہے اور تجارت میں اس لفظ کا استعمال اس حالت میں بھی ہوتا ہے جب کسی ایک سودے میں گھاٹا آئے اور اس حالت میں بھی جب سارا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہو اور اس حالت میں بھی جب اپنا سارا سرمایہ کھو کر آدمی دیوالیہ ہو جائے قرآن مجید اسی لفظ کو اپنی خاص اصطلاح بنا کر فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے جس طرح قرآنی تصورِ فلاح محض دنیوی خوشحالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے۔ اسی طرح قرآنی تصورِ خسران بھی محض دنیوی ناکامی یا خستہ حالی کا ہم معنی نہیں ہے۔ بلکہ دنیا سے لیکر آخرت تک انسان کی حقیقی ناکامی و نامرادی پر حاوی ہے اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیئے کہ اگرچہ قرآن مجید کے نزدیک حقیقی فلاح آخرت میں انسان کی کامیابی اور حقیقی خسارہ وہاں اس کی ناکامی ہے لیکن اس دنیا میں بھی جس چیز کا نام لوگوں نے فلاح رکھ چھوڑا ہے وہ

دراصل فلاح نہیں ہے بلکہ اس کا انجام خود اسی دنیا میں خسارہ ہے اور جس چیز کو لوگ خسارہ سمجھتے ہیں وہ دراصل خسارہ نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی وہی فلاح کا ذریعہ ہے اس حقیقت کو قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا۔ پس جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے تو اس کا مطلب دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ اس خسارے سے وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جنکے اندر حسب ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں تو اسکا مطلب دونوں جہانوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں ان چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جس کے پائے جانے پر اس سورت کی رو سے انسان خسارے سے محفوظ رہتا ہے ان میں پہلی صفت ایمان ہے یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض زبانی اقرار کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنے ہی میں کیا گیا ہے اور عربی زبان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے تو قرآن مجید میں پوری طرح اس بات کو بھی کھول کھول کر بیان کردیا گیا ہے اس سے مراد۔

اولاً: اللہ تعالیٰ کو ماننا ہے محض اس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اسے اس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی ایک اللہ تعالیٰ ہے خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اس کی بندگی اور اطاعت بجالائے۔ وہی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دعا مانگنی چاہیے اور بندہ اسی پر توکل کرے۔ وہی دینے اور منع کرنے والا ہے بندے کا فرض ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اسے منع کیا ہے رک جائے وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے اس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار اس کی کوئی نیت اور مقصد بھی مخفی نہیں جس کے اس نے فعل کا ارادہ کیا۔

ثانیاً: رسول کو ماننا اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مبعوث کیا ہوا ہادی و رہنما ہے اس نے

جس چیز کی تعلیم دی وہ برحق ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور واجب التسلیم ہے اس ایمان بالرسالت میں ملائکہ انبیاء اور کتب وصحف پر اور خود قرآن پر ایمان لانا بھی شامل ہے نیز ان تعلیمات پر ایمان لانا جو اللہ عزوجل کے رسول نے دی ہیں۔

ثالثاً: آخرت کو ماننا اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے اپنے اعمال کا اللہ تعالیٰ کو حساب دینا ہے اس محاسبہ میں جو لوگ نیک قرار پائیں انہیں جزا اور جو بد قرار پائیں انہیں سزا ملنی ہے یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کیلئے مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوش نما کیوں نہ ہو وہاں اس کا حال اس بے لنگر جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑتا۔

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے والی ہوتی ہے وہ صالحات (نیک عمل) پر عمل کرنا ہے صالحات نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکیوں اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی لیکن قرآن مجید کی رو سے اس وقت تک کوئی عمل عمل صالح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی جڑ میں ایمان نہ ہو اور وہ اس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے دی ہے اس لیے قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا کسی ایک جگہ بھی قرآن مجید میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو بھی صالح نہیں کہا گیا اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونیکا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعوی ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر لیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیج اور درخت کا ہے جب تک بیج زمین میں نہ ہو تو وہ درخت نہیں پیدا ہو سکتا لیکن بیج زمین میں ہو اور درخت پیدا نہ ہو تو معنی

یہ ہے کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا ہے اسی وجہ سے قرآن مجید میں جتنی بشارتیں دی گئیں انہی لوگوں کو دی گئیں جو ایمان لا کر عمل صالح کریں اور یہی بات اس سورۃ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے بالفاظ دیگر عمل صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورہ بالا دو صفتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہئیں اس کے بعد یہ سورت دو مزید صفتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے اس لیے اس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک صحیح اور سچی عدل وانصاف کے مطابق اور حقیقت کے مطابق بات خواہ وہ عقیدہ وایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو خواہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہو یا بندوں کا یا خود اپنے نفس کا حق پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا یہ معاشرہ ایسا نہ ہو کہ اس میں باطل سر اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کئے جا رہے ہوں مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے ہیں بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری وساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمہ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راست بازی اور عدل وانصاف پر قائم رہنے اور حقداروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرز عمل کی نصیحت کرے یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال وانحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرہ میں موجود نہ رہے تو

خسران سے نہیں بچ سکتا اور اس خسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔

یہی بات ہے جو سورۃ المائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں میں ایک دوسرے کو برے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ (آیات نمبر ۷۸۔۷۹) پھر اسی بات کو سورۃ الاعراف میں اس طرح بیان کیا گیا کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا رب تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنا شروع کر دیں تو ان پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اس عذاب سے صرف وہی لوگ بچے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ (آیات نمبر۱۶۳:۱۶۶) اور یہ بات سورۃ الانفال میں یوں بیان کی گئی ''کہ بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہیں لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو'' (آیت نمبر ۲۵) اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ (آل عمران ۱۰۴) اور اس امت کو بہترین امت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے (آل عمران ۱۱۰)۔

حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہل ایمان اور ان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کیلئے شرط اور لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور اس راہ میں جن تکالیف سے اور جن مشقتوں سے اور جن مسائل سے اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں ان کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ [1]

---

[1] تفہیم القرآن

سورۃ العصر میں زمانہ کی قسم بطورِ شہادت کھائی گئی ہے کہ انسان غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں اصل سرمایہ جو اسے حاصل ہے پس وہ تھوڑا سا وقت ہے جو مہلت حیات کی حیثیت سے اس کے حصہ میں آیا ہے اس کو صحیح استعمال کر کے وہ زندگی بخشنے والے کا پسندیدہ بندہ بھی بن سکتا ہے اور اسی کو غلط کاموں میں ضائع کر کے اپنے کو دوزخ کے عذاب کا سزاوار بھی بنا سکتا ہے اس کی فطرت یہ ہے کہ ایک شمشیر دودھاری ہے اس کو انسان نے اپنے حق میں استعمال نہ کیا تو آپ سے آپ ابدی دشمن شیطان کے حق میں استعمال ہوگا۔ اس کا بہت تھوڑا سا حصہ یعنی صرف حاضر ہے جو صرف اس کے اختیار میں ہے جس میں وہ کوئی تصرف کرسکتا ہے باقی یا تو ماضی بن چکا جو کسی قیمت پر بھی واپس نہیں مل سکتا یا مستقبل کے پردہ میں چھپا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کتنا ہے اور ہے بھی یا نہیں اور ہے تو وہ اپنے ساتھ کیا احوال و مسائل اور کیا تقاضے و مطالبے رکھتا ہے جو وقت آتا ہے وہ اپنے مطالبے ساتھ لاتا ہے۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ انسان حاضر کے فرض کو مستقبل پر ٹال سکے۔

سوال۔ زمانہ کی قسم یہاں کیوں کھائی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے ان واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں قانونِ مجازات کے تحت پیش آئے دوسری طرف لوگوں کو جھنجھوڑا کہ لوگ اپنی زندگیاں غفلت میں نہ گزاریں بلکہ پوری مستعدی سے انسے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اپنی تیز تر لمحات کے بدلے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہیں اگر انہوں نے اس کی صحیح قدر پہچانی اور اگر ان کی قدر نہ پہچانی تو یاد رکھے یہ ان کیلئے ابدی لعنت بن جائیں گے۔

قرآن مجید میں ایمان کے بعد عمل صالح کا جو ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے اسی طرح اطاعت رسول ﷺ کو اطاعت اللہ عزوجل پر عطف کیا جاتا ہے یہ بھی عطفِ تفصیل ہوتا ہے اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض اہم الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت

بالکل ظاہر ہے۔ [1]

سید قطب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ عظیم ترین حقیقت ہے کہ خسارہ سے صرف چار چیزیں بچاتی ہیں ایمان ،عملِ صالح ،تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ۔عملِ صالح ایمان کا طبعی نتیجہ ہے ایمان کی حقیقت جب کسی دل میں ٹھہر جاتی ہے تو اسی وقت ایک ذاتی حرکت شروع ہو جاتی ہے جسے عمل صالح کا نام دیا گیا ہے پس ایمان ایک ایجابی ایک متحرک حقیقت کا نام ہے جب وہ دل میں مستقر ہو جائے گی تو فوراً خارج میں اس کا ثمرہ عمل صالح کی صورت میں ظاہر ہوگا اسی چیز کا نام اسلامی ایمان ہے یہ غیر متحرک اور بجا ہوا نہیں رہ سکتا۔ [2]

ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ" لو فکر الناس فی سورۃ العصر لکفتھم" ابن قیم رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ بندے کا کمال اپنی دو قوتوں کے مکمل کرنے میں ہے۔ (۱)۔قوتِ علم (۲)۔قوتِ عمل اور وہ ایمان اور عمل صالح ہے جس طرح انسان اپنے نفس کی تکمیل کا محتاج ہے ایسے ہی اپنے غیر کی تکمیل کا بھی محتاج ہے اور یہی تواصی بالحق اور اور تواصی بالصبر ہے اور اس کی بنیاد اور تنا جس پر یہ قائم ہے وہ صرف صبر ہے۔

نیز ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان و تواصو ابالحق وتواصوا بالصبر دینی قوت میں امامت کے منصب کی طرف رہنمائی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان "وجعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بایتنا یوقنون" ہے صبر و یقین کے ذریعہ سے ہی دینی پیشوائی حاصل کی جاتی ہے "فبالصبر والیقین تنال الامامۃ فی الدین"

صبر کی دو قسمیں ہیں ایک ہے مقدر پر صبر کرنا جیسے مصائب پر صبر اور دوسری قسم

---

[1] تدبر القرآن

[2] فی ظلال القرآن

مشروع پر صبر کرنا اس کی پھر دو قسمیں ہیں (۱)۔صبر علی الادامۃ یعنی شرعی احکام کی بجا آوری پر اپنے آپ کو لگائے رکھنا (۲)۔صبر عن النواہی یعنی منہیات سے اپنے کو روکے رکھنا صبر کی پہلی قسم مومن وکافر نیک وبد کے درمیان مشترک ہے اگر اس صبر کے ساتھ ایمان اور اسے اختیار کرنا مقترن نہ ہوگا تو ایسے صبر پر ثواب نہیں ملے گا۔ایمان و تقویٰ کے بغیر صبر ایسے ہی ہے جیسے ایمان وتقویٰ سے خالی بدن کی قوت ومضبوطی اور جیسا ہی مشروع پر یقین ہوگا ویسا ہی مقدر پہ صبر ہوگا۔ [1]

اس سورت نے مسلمانوں کو ایک بڑی ہداہت یہ دی ہے کہ ان کا صرف اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کر لینا جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی اہم یہ ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عملِ صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش کرے ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لیے کافی نہ ہوگا خصوصا اپنے اہل وعیال واحباب ومتعلقین کے اعمالِ سیۂ سے غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے خواہ وہ خود کیسے ہی اعمالِ صالح کا پابند ہو اسی لیے قرآن وحدیث میں ہر مسلمان پر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کیا گیا ہے اس معاملہ میں عام مسلمان بلکہ بہت سے خواص تک غفلت میں مبتلا ہیں خود عمل کرنے کو کافی سمجھ بیٹھے اہل وعیال کچھ کرتے رہیں کچھ فکر نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت کی ہدایت پر عمل کی توفیق عنایت فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لاالہ الا انت استغفرک واتوب الیک اللھم صل علی محمد وعلی ازواجہ وذریتہ کما صلیت علی ال ابراھیم وبارک علی محمد وعلی ازواجہ وذریتہ کما بارکت علی ال ابراھیم انک حمید مجید .

---

[1] بدائع التفاسیر بحوالہ عدۃ الصابرین



اقسام القرآن

چودہ سو سال قبل نازل ہونے والی کتاب اللہ، آج بھی تمام دنیا کے لیے ہدایت کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ یہ اعجاز صرف قرآن حکیم کو ہی حاصل کہ اس کے نزول سے لے کر اب تک یہ تر وتازہ ہے اور مسلسل علم وعرفان کے چشمے اس سے پھوٹ رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ کا کوئی گوشہ اس لاریب کتاب کی خدمت سے خالی نہیں، مسلم علماء نے اس بحر علوم میں غوطہ زن ہو کر لعل وجواھر کے دریا بہادیئے ہیں۔

زیر نظر کتاب 'اقسامُ القرآن' بھی اسی سلسلے کی ایک عمدہ کاوش ہے جسے شیخ الحدیث والتفسیر فضیلۃ الشیخ ابو عبداللہ رفیع الدین حفظہ اللہ نے تالیف فرمایا ہے۔

"اقسامُ القرآن" میں لغوی بحث ہو یا نحوی، قرآنی قسموں کی لطافت وبلاغت موضوع سخن ہو یا تحقیقی مواد کی حسن ترتیب، ان سب مقامات میں شیخ محترم کا انداز عام فہم اور اسلاف سے مطابقت رکھتا ہے۔ امید ہے یہ کتاب اہل علم وقلم کے اطمینان کا باعث بنے گی اور طالبین حق کے لیے فہم القرآن کی کنجی ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ العزیز

ابو حفص
E-mail:r_firdosi@hotmail.com

مؤلف کے قلم سے

امثال القرآن بھی زیر تکمیل ہے جو جلد منظر عام پر لائی جائے گی۔ ان شاء اللہ